اُردُو غزل

مع

انتخاب

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں
صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ سرکارعالی
حیدرآباد (دکن)

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

اِنتساب

میں ان اوراق کو امام غزل مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی
کی خدمت گرامی میں بطور نذرِ عقیدت پیش کرنے
کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

یوسف حسین خاں

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
اُردو غزل	۵	سید محمد میر اثر	۲۷۴
انتخاب غزلیات	۲۲۹	شیخ غلام ہمدانی مصحفی	۲۷۵
ولی اورنگ آبادی	۲۳۰	خواجہ میر حسن، حسن	۲۸۲
سراج اورنگ آبادی	۲۳۲	جعفر علی حسرت	۲۸۳
شاہ مبارک آبرو	۲۳۳	شیخ قلندر بخش جرأت	۲۸۳
مرزا جان جاناں مظہر دہلوی	۲۳۴	میر انشاء اللہ خاں انشاء	۲۹۰
شاہ حاتم	۲۳۵	شیخ ابراہیم ذوق	۲۹۱
میر عبدالحی تاباں	۲۳۶	اسد اللہ خاں غالب	۲۹۴
محمد امان نثار	۲۳۷	بہادر شاہ ظفر	۳۱۳
میر محمدی بیدار دہلوی	۲۳۷	میر مہدی مجروح	۳۱۴
میر تقی میر	۲۳۸	مفتی صدر الدین آزردہ	۳۱۶
مرزا محمد رفیع سودا	۲۶۰	مومن خاں مومن	۳۱۷
خواجہ میر درد	۲۶۵	نسیم دہلوی	۳۲۵
سید محمد میر سوز	۲۶۹	آتش لکھنوی	۳۲۷
شیخ قیام الدین قائم	۲۷۱	شیخ امام بخش ناسخ	۳۳۰
انعام اللہ خاں یقین	۲۷۲	برق لکھنوی	۳۳۲
خواجہ احسن اللہ بیان	۲۷۳	جلال لکھنوی	۳۳۳

صبا لکھنوی	۳۳۵
ماہ لکھنوی	۳۳۶
تسلیم لکھنوی	۳۳۷
صغیر بلگرامی	۳۴۰
مرزا رحیم الدین حیا	۳۴۰
خواجہ محمد وزیر وزیر	۳۴۱
ضیائی بیگم ضیائی	۳۴۱
منیر شکوہ آبادی	۳۴۱
نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ	۳۴۲
مائل دہلوی	۳۴۵
زکی دہلوی	۳۴۵
میر حسین تسکین	۳۴۶
سید ظہیر الدین ظہیر	۳۴۷
عبد العلیم آسی	۳۴۸
یاس شاگرد مومن	۳۴۸
وحشت شاگرد مومن	۳۴۸
نظام شاہ نظام رامپوری	۳۴۹
محمد یوسف علی خان ناظم رامپوری	۳۴۹
گستاخ رامپوری	۳۵۰
امانت لکھنوی	۳۵۰
رند لکھنوی	۳۵۰
رشکی دہلوی	۳۵۱
داغ دہلوی	۳۵۲
میر مظفر علیخاں اسیر لکھنوی	۳۶۲
منشی امیر احمد امیر مینائی	۳۶۴
خواجہ الطاف حسین حالی	۳۷۰
سید علی محمد شاد عظیم آبادی	۳۷۴
رضا علی وحشت	۳۷۹
مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی	۳۸۰
حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری	۳۸۴
شوکت علی خان فانی	۳۹۲
سید فضل الحسن حسرت موہانی	۴۰۱
جگر مراد آبادی	۴۱۹
اصغر گونڈوی	۴۲۷
اقبال	۴۳۴
فراق گورکھپوری	۴۳۷
جوش ملیح آبادی	۴۴۱
بیخود دہلوی	۴۴۳
مرزا جعفر علی خاں اثر	۴۴۴
آرزو لکھنوی	۴۴۴
آدی مچھلی شہری	۴۴۴
معین احسن جذبی	۴۴۵
مرزا یگانہ لکھنوی	۴۴۵

دیباچہ

سنہ ۱۹۴۵ء اور سنہ ۱۹۴۶ء میں مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کی فرمائش پر میں نے اُردو مجلس (حیدرآباد دکن) کے جلسوں میں اردو غزل پر تین مضمون علیحدہ علیحدہ پڑھے تھے۔ بعد میں ان تینوں مضمونوں کو ایک جگہ مرتب کر لیا اور ان میں ترمیم و اضافہ بھی کیا گیا۔ اس کے ساتھ قدماء کے زمانے سے لے کر عہد حاضر تک کے مشہور غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا تاکہ جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان کی مزید وضاحت ہر دور کے شاعروں کے کلام سے ہو جائے۔

اُردو غزل پر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ عام ڈگرے ذرا الگ ہٹ کر ہے۔ اگرچہ یہ ابتدائی کوشش ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر دوسرے حضرات نے جو اس کام کے لئے مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں ان اصولوں پر اپنی تحقیق جاری رکھی جو پیش کئے گئے ہیں تو ہمارے تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

اس کتاب کا مسودہ میرے پاس تقریباً دو سال سے تیار تھا لیکن شمالی ہند اور پھر دکن میں ان دنوں میں جو حالات پیش آئے ان کے باعث طباعت کی نوبت نہ آسکی۔ لیکن اب مولوی عبدالوہاب صاحب مالک اعظم اسٹیم پریس کی غیر معمولی دلچسپی اور علم دوستی ان اوراق کی طباعت کا موجب ہو رہی ہے جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ فقط

یوسف حسین خاں

حیدرآباد (دکن)

یکم ڈسمبر سنہ ۱۹۴۸ء

اُردو غزل

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔حیدرآباد (دکن)

گزشتہ دو سو برس میں میرصاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اُردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جان دار ہونے کی دلیل ہے۔ ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص فضا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اس نے نشوونما پائی ہے۔ حسرت و جگر کے ہاں حسن و عشق کے معاملات کا اظہار اُس سے ایک حد تک مختلف ہے جو ہمیں میر و غالب و مومن کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو، دنیا کی ہر چیز بدلتی بدلتی رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت، اور طرز فکر و احساس وہ نہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر بعض اوقات حسن و عشق کو تجریدی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے جس کی مثال اُردو کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب احساسِ

جمال کو حیات و کائنات کے سمجھنے کے لئے بطور قدر استعمال کرتا ہے جس سے اس کے پیشرو بڑی حد تک نابلد تھے اور اگر واقف تھے تو بالکل مبہم طور پر۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو شاعر آج سے دو سو برس پہلے جس مغموم اور افسردہ آواز سے حسن و عشق کی داستان بیان کر رہے تھے اسی کی تقلید اب بھی ہو رہی ہے۔ گویا آرٹ کی تخلیقی آزادی سلب ہو چکی۔ وہی چبے چبائے نوالے ہیں جنھیں برابر چبایا جا رہا ہے۔ چاہے ان میں کچھ مزہ ملے یا نہ ملے۔ وہی شاہد و شراب، زلف و گیسوئے و میخانہ اور شمع و پروانہ کی داستان ہے جو ذرا سے لفظوں کی الٹ پھیر کے ساتھ صدیوں سے بیان ہوتی رہی ہے اور آج بھی بیان کی جا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل کے رموز و علامات میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی توجیہ بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان رموز و علامات کی توجیہ زندگی کے ساتھ ساتھ اس عرصے میں بہت کچھ بدلتی رہی ہے۔ شاعری نے دنیا میں ہر جگہ لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تاکہ وہ ذہنی زندگی سے بے تعلق نہ ہو جائے۔ غزل کا آرٹ بھی سکونی آرٹ نہیں کہ جہاں تھا وہیں رہے۔ زندگی کی طرح وہ حرکت اور نمو میں رچا ہوا ہے۔ اسی واسطے اس کی معنی آفرینیوں کی کوئی حد نہیں علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ جوں جوں ذہن کی جلا بڑھے گی اس کا اثر ضرور ہے کہ ہمارے احساس و تخیل پر پڑے۔ جب احساس و تخیل متاثر ہوں گے تو غزل کے محرکات بھی بدلیں گے اور اس کے رموز و علامات کی توجیہ بھی بدلے گی اور اس طرح نئے نئے خیالی اور جذباتی حقایق کی باز آفرینی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ گزشتہ دو سو سال کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ غزل کے بظاہر بندھے ٹکے محاوروں اور اشاروں میں معانی کی کس قدر وسعتیں پنہاں ہیں۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ غزل نگاروں کے پُرانے تجربوں کی نئی آگاہیاں آئندہ بھی تخلیق ہوتی رہیں گی اور اس طرح ہمارے ادبی شعور کی نشو و نما جاری رہے گی۔

میں یہ مانتا ہوں کہ اس وقت ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں غزل کو وہ حسن قبول حاصل نہیں رہا جو نظم کو حاصل ہے۔ جدید مغربی تعلیم کے اثر سے ہمارے یہاں نظم نگاری کو رواج ہوا اور پچھلے پچاس سال میں اس میں قابل قدر اضافے ہوتے رہے ہیں۔ حالی اور اقبال نے اس کو اپنے اصلاحی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دونوں کو اپنی قوم کو پیغام دینا تھا جس کے لیے یقیناً نظم کا وسیلہ زیادہ موثر اور مفید تھا۔ قوموں کو جو درس عمل دیا جاتا ہے وہ اشاروں کنایوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ وہ وضاحت اور تفصیل اور تکرار چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ کام غزل کے مقابلہ میں نظم ہی کے ذریعے سے اچھی طرح انجام پا سکتا تھا۔ میں اس موقع پر دیدہ و دانستہ اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہمارے ادب میں غزل کو ترجیح دیجانی چاہیئے یا نظم کو۔ دراصل دونوں اپنا اپنا مقام اور اپنا اپنا حق رکھتی ہیں جس سے انہیں محروم نہیں کرنا چاہیئے۔ جس وقت سے مولانا حالی نے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں غزل پر نکتہ چینی کی اُس وقت سے آج تک برابر وہی پُرانے اور فرسودہ دلائل غزل کے خلاف لائے جا رہے ہیں ان سب دلائل کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ غزل زندگی کے نئے تقاضوں کی حریف نہیں ہو سکتی اس واسطے کہ اس صنف سخن میں خیال کو اظہار کی پوری آزادی نہیں ملتی۔ اس کی ریزہ کاری کلام کے منطقی تسلسل کو برقرار نہیں رکھ سکتی جس کا نتیجہ خیالات کا انتشار ہے۔ غرضکہ غزل اب اعتبار اور قدر کی چیز نہیں رہی لہذا اس کا ختم ہو جانا ہی اچھا ہے۔

مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی محرکات کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انہیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز

ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی قومی مصالح کی ترقی کا موجب ہو گا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ[۱] ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر سطحی ہے۔ مولانا حالیؔ کی نیک نیتی اور انکے اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں اُن کا مشورہ قابل قبول نہیں۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ مولانا حالیؔ کے مشورہ کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرتؔ اور جگرؔ اور فانیؔ اور اصغرؔ کی زمزمہ سنجیوں سے محروم رہتی جو ایک ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔

درحقیقت معاملہ اتنا آسان اور سادہ نہیں جتنا کہ غزل کے معترضین نے سمجھ رکھا ہے۔ غزل کی جڑیں ہماری تہذیبی اور اخلاقی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ انھیں اکھاڑ پھینکنا سہل نہیں۔ مولانا حالیؔ اردو زبان و ادب کی اور عام طور پر مسلمانوں کی قومی زندگی کی اصلاح چاہتے تھے۔ اصلاحی جوش میں انہوں نے غزل کے نقائص چن چن کر دکھائے اور قومی اخلاق کو سدھارنے کے لئے سادہ اور عام فہم نظمیں لکھیں اور دوسروں کو لکھنے کی دعوت دی۔ پھر ان کے پیش نظر غزلوں میں بھی خاص طور پر وہ تھیں جن سے فحش اور رکاکت کی ترویج کا اندیشہ تھا۔ لیکن کیا سب غزلیں ایسی ہوتی ہیں؟

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو
نفیٔ حکمت مکن از بہر دلِ عامے چند (حافظ)

اگر مولٰنا حالیؔ آج زندہ ہوتے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ

---

[۱] مولانا حالی کی رباعی ملاحظہ ہو۔

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا ۔ یا خود ہے یہ گھر ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پر اتنی ہے خبر ۔ اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

اس رباعی میں مولٰنا روم کے اس شعر کی تردید کی گئی ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ۔ اے طبیب جملہ علتہائے ما

پچھلے چند سالوں میں فحش کی ترویج اور اس کی قدر افزائی نثر اور نظم کے توسط سے زیادہ ہوئی ہے یا غزل کے ذریعے۔ مولٰنا حالی کی رائے کو آج دلیل کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ وہ محض عارضی اور ہنگامی حالات کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے غزل کے جو نقائص بتائے ہیں ان میں سے بعض کو غزل کے حامی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ غزل جو محض قافیہ بندی کے لیے ہو موجب فخر نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ غزل صرف اعلیٰ درجہ ہی کی ہونی چاہیئے۔ نظم اوسط درجے کی گوارا کر لی جا سکتی ہے لیکن غزل نہیں کی جا سکتی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ" بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست" غزل پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ غزل ہمیشہ بلند ہی ہوگی، اگر واقعی وہ تغزل کے آداب کی حامل ہے۔ اوسط درجے یا ادنیٰ درجے کی غزل مکروہ چیز ہے جس سے گھن آتی ہے، ادبی لطف حاصل ہونا تو کجا۔ اس کی غلط تعبیر و توجیہ کا اندیشہ رہتا ہے جو ممکن ہے بعض طبائع پر برا اثر ڈالے۔ غزل کے پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے پہلے پہل اسی کو اپنا تختۂ مشق بناتے ہیں۔ عروض کی چند کتابیں پڑھیں اور اپنے آپ کو غزل کہنے کا اہل سمجھنے لگے۔ کچھ عرصہ قبل کی بات ہے کہ غزل گو ہونا علم مجلسی کا جز تصور کیا جاتا تھا۔ صنائع لفظی اور ضلع جگت ذہانت کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اُمرا کے طبقہ میں خاص طور پر اس کا رواج تھا۔ جس طرح گھر کے انتظام کے لئے ایک داروغہ رکھا جاتا تھا اسی طرح غزل کی اصلاح کے لیے ایک استاد رہتے تھے جو اکثر کوئی پھٹے حالوں بزرگ ہوتے تھے جنھیں اصلاح شعر کے معاوضہ میں کھانا اور کپڑا میسر آجاتا تھا۔ غدر سے پہلے اور غدر کے کچھ عرصہ بعد تک غزل لکھنے والے امیر زادے اور ان کی غزلوں پر اصلاح دینے والے استاد شمالی ہند کے ہر شہر اور قصبے میں موجود نظر آتے تھے۔ ان بے فکروں کے لیے شعر و سخن بیکاری اور خوش وقتی کے مشغلہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ یہ زمانہ ہماری اجتماعی اور جذباتی زندگی کی انتہائی بے مقصدی اور انتشار کا

زمانہ تھا جس سے سیاست و معیشت کی طرح ادب بھی متاثر ہوا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے کدھر جانا ہے اور کس کے ساتھ جانا ہے؟ ہماری قوم کی حالت غالب کے تھکے ہارے مسافر کی سی تھی جس کی زبانی اس نے یہ شعر کہلوایا ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس آڑے وقت میں ہماری خوش قسمتی تھی کہ سرسید اور مولانا حالی جیسے رہبر ملے۔ ان کے دلوں میں درد اور نیتوں میں خلوص تھا۔ مولانا حالی نے ادبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ یہ ان کا انتہائی ایثار تھا کہ باوجود اعلیٰ درجہ کے تغزل کی صلاحیت کے انھوں نے نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ ان کے تغزل کا اندازہ چند شعروں سے ہو سکتا ہے۔

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں — خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنوان میں نہیں
بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں
دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ — ایسے الجھاؤ تری کاکل پیچاں میں نہیں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق — رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

یہ آخری شعر مولانا حالی کے حقیقی اور روحانی احساس کی غمازی کرتا ہے۔ انھوں نے ترک عشق کی جو دعا کی وہ اوپری دل سے تھی۔ اسی لئے بے اثر رہی۔ عشقیہ شاعری کی ترقی رکنے والی تھی نہ رکی۔ چنانچہ آج اس صنف سخن کا ایک زبردست علمبردار آزار عقل اور مداوائے عشق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مطلق پس و پیش نہیں کرتا۔

ارباب ہوش جتنے ہیں بیمارِ عقل ہیں
ان کے لئے ضرور مداوائے عشق ہے (حسرتؔ)

مولنا حالیؔ اور ان کے بعد اقبالؔ نے اردو نظم نگاری کو اس اعلیٰ مرتبہ پر پہونچایا جس پر ہم اب اس کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن غزل بھی اس عرصے میں پیچھے نہیں رہی۔ غالبؔ کے بعد داغؔ، امیرؔ، شادؔ، حسرتؔ، فانیؔ اصغرؔ اور جگرؔ نے اپنے اپنے انداز میں اسے سنوارا اور نکھارا اور اس کے مقام کو بلند تر کیا۔

ہمارے زمانے کے ترقی پسند نوجوانوں کو غزل کے مقابلے میں نظم اس لئے بھی پسند ہے کہ اس کا لکھنا نسبتاً آسان ہے۔ غزل جتنی ریاضت چاہتی ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس طبقہ میں غزل کی پابندیاں اور آداب مقبول نہیں اس لئے کہ انھیں برتنے کا ان لوگوں میں جیسا چاہیئے ویسا سلیقہ اور ذوق نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے ادب اور اپنی ذہنی روایات سے ناواقف ہیں۔ وہ مغربی ادب کی ریس میں آزاد اور عاری نظم کو اردو میں بھی رواج دینا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہر صنفِ سخن کو ہر زبان میں نہیں برتا جا سکتا اور نہیں برتنا چاہیئے تخلیقی ادب ذوقی چیز ہے۔ جہاں ذوق مجروح ہو گا وہاں تخلیقی ادب تخلیقی نہیں رہے گا بلکہ کسی دوسرے کی نقالی ہو گی جس سے ادب کی سیرت مسخ ہو جائے گی۔ اندیشہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی یہ ناپختگی اور بے راہ روی ان کی رفتارِ ترقی کے لئے زنجیرِ پا نہ بن جائے اور ان کے تخلیقی مساعی بے اثر ہو کر نہ رہ جائیں جو کسی تحریک کے لئے سب سے بڑی افتاد ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ادب کے اثر سے ہمارے یہاں جو نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں وہ غزل کے لئے ناموافق ہیں۔ لیکن میرا یہ خیال

ہے کہ اس صورت حال کے خلاف جلد ردعمل رونما ہوگا اور ہمارا ادبی ذوق ہمیں بہت دنوں تک اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دے گا۔ جس طرح مغربی تعلیم کے اس ملک میں رائج ہونے پر مشرقی علوم و فنون ناقدری کے نذر ہوگئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کے صحیح مقام کو تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح مغربی ادب کے زیر اثر ممکن ہے غزل نگاری کو عارضی طور پر روز بد دیکھنا پڑے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غزل اس جوکھم کو جھیل جائے گی۔ اس میں اتنی قوت حیات موجود ہے کہ تھوڑا بہت ظاہری روپ بدل کر پھر اپنی گدی پر براجمان ہوجائے۔ ناٹک اور ناول کی طرح نظم بھی عوامی ضروریات پوری کرتی رہے گی اور اس طرح ہمارے ادب میں نظم اور غزل دونوں کو اپنا اپنا مقام مل جائیگا لیکن عوامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نظم کو غزل سے موسیقیت کا رس مستعار لینا ہوگا۔ ورنہ خود اس کی قبولیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ہم زندگی کی تاریکیوں سے موسیقی کے ذریعہ ہی گریز کر سکتے ہیں۔ اور شعر تو بغیر موسیقی کے بقول غالب "مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل" سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتا۔ غرضکہ مجھے غزل کا مستقبل اس کے امکانات کی وجہ سے روشن نظر آتا اس لئے کہ اس صنف سخن سے ہمارے بعض اہم اور دور رس ادبی اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ غزل ہمارے ادبی مزاج میں اتنی دخیل ہوچکی ہے کہ اس سے قطعی طور پر بے تعلق ہوجانا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس سال میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہد جدید کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد اشعار کے پس منظر میں وحدت احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے

اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آجائینگی۔ مثال کے طور پر اس زمانے کے اردو کے دو سب سے بڑے شاعروں کے کلام کو دیکھئے جن میں سے ایک نظم کا اور دوسرا غزل کا بادشاہ ہے۔ ان سے میری مراد اقبالؔ اور حسرتؔ ہیں۔ اقبالؔ کی نظم میں تغزل کی خوبی اور حسرتؔ کی غزل میں نظم کا معنوی تسلسل صاف طور پر نظر آتا ہے۔ چند مثالوں سے میں اس کی وضاحت کروں۔

اقبالؔ کی ایک ابتدائی غزل نما نظم لیجئے۔ ہر لفظ تغزل میں رچا ہوا ہے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبالؔ کی آخری زمانے کی ایک دوسری غزل نما نظم بھی ملاحظہ ہو۔ رمز و ایما کی طلسمی کیفیات کا کمال دکھایا ہے۔

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسہ میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ

رگ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

حسرتؔ کی عاشقانہ اور شاعرانہ زندگی کی ابتدائی کوشش ملاحظہ ہو۔ اس نظم نما غزل میں جرأت کے انداز کی تقلید کی گئی ہے۔ آپ چاہیں تو اس کو عشقیہ محاکات کہہ سکتے ہیں جس میں عہد ہوس کے افسانے کو من و عن ہمارے سامنے دُہرا دیا ہے اور مزے لے لے کر دُہرایا ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

باہزاران اضطراب و صد ہزاران اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ میرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصد پابوسی میرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہ لحاظ
حال دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکر فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبت راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے ترا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گذریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بیدست و پا ہونا ترا
اور میرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

باوجود ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے
آج تک عہد ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

یہ غزل ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی۔

حسرتؔ کی ایک حال ہی کی غزل ملاحظہ کیجئے جس میں اعلیٰ تغزل کے ساتھ نظم کے سارے انداز موجود ہیں۔ یہ غزل جزیرہ قبرص (سائپرس) کی ایک خاتون کو دیکھ کر جو جہاز پر حسرتؔ کے ہم سفر تھیں لکھی گئی ہے۔

رعنائی میں حصہ ہے جو قبرص کی پری کا
نظارہ ہے مسحور اسی جلوہ گری کا

رفتار قیامت ہے نہیں کیا کم تھی بھلا اس پر
اک طرہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا سنجری نقش ہیں دلکش — باعث نہ یہی شوق کی ہوں جامہ دری کا
لاریب کہ اس حسن ستمگار کی سرخی — موجب ہے مرے زہد کی عصیاں نظری کا
باوصف تلاش انکی خبر کچھ بھی نہ پاکر — کیا کہیئے جو ہے حال میری بے خبری کا
جب سے یہ سنا ہے کہ وہ ساکن ہیں پیرس کے — عالم ہے عجب شوق کی آشفتہ سری کا
ساتھ ان کے جو ہم آئے تھے پیرس حسرت — یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہمسفری کا

یہ غزل ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی تھی جبکہ حسرت مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے ہوتے ہوئے پہلی مرتبہ یورپ گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں بڑھاپے کے کلام میں شوخی باقی نہیں رہتی۔ یہ غزل اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ تیس چالیس سال قبل عشق و محبت کی جو چنگاری حسرت کے دل میں روشن تھی آج بھی معلوم ہوتا ہے وہ ویسی کی ویسی دہک رہی ہے۔ رنگ اور نسل کے اعتبارات جو مثل خس و خاشاک ہیں اس کے آگے ایک دم کو نہیں ٹھیر سکتے۔ وہ فرق و امتیاز کرتی ہے لیکن اپنے بنائے ہوئے معیاروں سے۔ اس کی انسانی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ یہی جذبۂ محبت موسیقی میں حل ہوکر تخلیق حسن کا موثر ذریعہ بن جاتا ہے اور یہی تغزل کی جان ہے۔

اگر آپ تغزل کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو بعض باتیں صاف طور پر نمایاں نظر آئیں گی جن کی وجہ سے دوسرے اصناف شعر سے اسے الگ کرنا ہوگا۔ غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجہ کی درون بینی پائی جاتی ہے۔ غزل گو شاعر جو کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے۔ اس کا حیات و کائنات کا نقطۂ نظر خالص موضوعی اور داخلی ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ذات میں سب کچھ پالیتا ہے۔ اس کا تخیل اپنی گل کاریوں سے اس کے دل کو ایسے ایسے حسین پیکروں سے آباد کر دیتا ہے کہ پھر اس کو ادھر ادھر جھانکنے تانکنے کی

ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ اگر کبھی وہ خارجی عالم کو دیکھتا ہے تو اس طرح نہیں دیکھتا جیسے دوسرے دیکھتے ہیں بلکہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے ۔ وہ اس کے وجود کا ثبوت انسانی شعور میں تلاش کرتا ہے اور اپنی ذات کو اس کے علم کا ماخذ اور منتہا تصور کرتا ہے ۔ غزل گو شاعر کے نزدیک تخیل ہی اصل حقیقت ہے جس کی مدد سے اس کے دل کی دنیا میں ہمیشہ رونق اور چہل پہل رہتی ہے ۔ اس کی دروں بینی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل سے آپ گفتگو کرے اور جو تاثرات مختلف اوقات میں اس کے دل پر گذریں انھیں شعر و نغمہ کا رنگین لباس پہنا دے ۔ تخیل اور جذبہ جب موسیقی کی رنگین قبا زیب تن کر کے جلوہ گر ہوتے ہیں تو شاعر کی روح اپنے تخیلی پیکروں سے ہم آغوش ہو کر رقص کرنے لگتی ہے ۔ خیال موسیقی میں ایسا حل ہو جاتا ہے کہ اس کو اس سے جدا کرنا محال ہو جاتا ہے ۔ شاعر اپنے اندرونی تجربے کو لفظوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے جو بس ایک حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں ۔ ان کی منطقی ترتیب جذبہ کے اظہار کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے ۔ ہماری زبان چاہے وہ کتنی ہی منجھی ہوئی اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس میں یہ صلاحیت کبھی بھی نہیں آسکتی کہ ان نغموں کو ظاہر کرے جو دل کی وادیوں میں گونجتے ہیں غزل گو شاعر رمزی علامتوں کی مدد سے اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ میں ایسا ڈوبا رہتا ہے کہ اس کو یہ بھی پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے مافی الضمیر کو سمجھتے ہیں یا نہیں ۔ وہ جو کہتا ہے دوسروں کے لیے نہیں کہتا بلکہ اپنے من کی موج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے ۔ غالب کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ دوسرے اس کے شعروں کو بے معنی کہتے تھے خود اس کے دل میں ان کے معنے تھے اور اس سے زیادہ اسے کیا چاہیے ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دوسری جگہ کہا ہے کہ دنیا والے میرے کلام کو بھلا کیا سمجھیں گے اور

میرے دل کے جذباتی تجربوں میں کیسے شریک ہو سکیں گے۔ مجھے اگر اپنے کلام کی تھوڑی بہت داد مل سکتی ہے تو وہ روح القدس (جبرئیل) سے مل سکتی ہے۔ وہ بھی اگرچہ میرے ہم زباں نہیں لیکن عالم اسرار کے رازدار کی حیثیت سے وہ تلامذۂ رحمٰن کی قدر افزائی کر سکتے ہیں۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

شعر اور خاص کر غزل کا شعر چونکہ اندرونی تجربہ کا اظہار ہے اس لئے ضرور ہے کہ وہ فطرت میں کسی نہ کسی قسم کا اضافہ کرے اور اگر وہ ایسا کرنے میں قاصر رہے تو تجربہ کا اچھوتا پن مشتبہ رہے گا۔ تخلیقی تخیل کی بدولت غزل کے شعر میں تجربیات کے کسی خاص لمحہ کا اظہار ضروری ہے جو شعور اور تحت شعور کے تانے بانے کی ملاوٹ سے بنتا ہے۔ زندگی کے اندرونی تجربے اور اس کی متعلقہ کیفیات کو موسیقی میں سمو کر تاثر انگیز انداز میں بیان کرنا غزل کے شعر کا مقصد ہونا چاہیے۔ دل کے اندرونی تجربوں میں تخیل اور جذبہ کی ایسی آمیزش ہوتی ہے کہ وجدان ہی ان کیفیات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور انہیں کا اظہار شعر غزل میں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو دائمی طور پر زندگی کے طلسماتی عنصر کی تلاش رہتی ہے۔ فطرت کے طلسم دل کے طلسم کے آگے ہیچ ہیں۔ انسانی دل سب سے بڑا طلسمات کا مخزن ہے اس کے اندر عجب عجب عالم پنہاں ہیں۔ غزل گو شاعر اپنے نغمہ کے پیچھے پیچھے سرِ دل سے انسانی دل کے طلسماتی پیکروں کو ان کو ابدی نیند سے بیدار کرتا ہے۔ جب ذہن نغمہ کے طوفان کو قابو میں لاتا اور اس کو خاص اصول اور ضابطوں کا پابند کرتا ہے تو غزل کے شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی واسطے غزل گو شاعر کے تجربوں میں طلسم و جذبہ آغوش در آغوش نظر آتے ہیں۔

غزل گو شاعر کی درون بینی کے اصلی عناصر تخیل اور جذبہ ہیں۔ تخیل میں یہ قوت ہے کہ وہ طلسمی اور غیر مرئی حقائق کو یا یوں کہیے کہ ان حقائق کو جو حواس کی کوتاہی اور نارسائی کی وجہ سے پوری طرح محسوس نہیں ہوتے جیتی جاگتی شکل

میں ہماری نظروں کے سامنے لے آئے۔ تخیل ایک نہایت ہی لطیف، نازک اور پیچیدہ حقیقت ہے اور وہ ایسے اسباب پر منحصر ہوتا ہے جن پر عقل کو قابو نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقی اور اختراعی قوت معمولی اور ظاہری واقعات میں ایسے ایسے نکتے اور باریکیاں تلاش کر لیتی ہے کہ عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے (غالب)

رمز و ابہام کے طلسم سے غزل کے شعر میں تھوڑی بہت پیچیدگی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو اس صنف سخن کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ زندگی خود بڑی پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کے اندرونی تجربوں کے اظہار میں اگر پیچیدگی آجائے تو یہ بات خلاف فطرت نہ ہوگی۔ اعلیٰ پایہ کے غزل نگار کی حیثیت سے میرؔ صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا تھا۔ ان کے ہاں زبان کی سادگی کے باوجود رمز کا اشکال موجود ہے۔ فرماتے ہیں:۔

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر ہے سخن میرؔ کا عجب ڈھب کا

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

میرؔ صاحب کا ہر سخن ہے رمز بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

ایک آفت زمان ہے یہ میرؔ عشق پیشہ پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

میرؔ صاحب اپنی کنایہ نگاری کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں۔

دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ اس ستم گر ہی سے کنایت ہے

تخیل اپنی توجیہ اور تعبیر خود اپنے انداز میں کرتا ہے اس کے علاوہ اسے اور کوئی انداز پسند نہیں۔ وہ ان باتوں کو بھی جو عقلی طور پر پہلے سے ثابت ہیں اپنے طور پر اور اپنے رنگ میں بالکل دوسری طرح سے ثابت کرتا ہے۔

اس کا طرز استدلال منطقی استدلال سے جدا ہوتا ہے۔ آپ نے زمانے کی فلسفیانہ اور سائنٹیفک تعبیر و تعریف سنی ہوگی۔ ایک غزل گو شاعر اس کی توجیہ یوں کرتا ہے۔

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے (جگر)

زمانہ کا تجربہ ہمیں اپنی باطنی زندگی میں ہوتا ہے اور انسانی خودی یا دل حقیقت اشیا کی پیمائش کا پیمانہ اور معیار ٹھہرتا ہے۔ گویا زمانہ کا تحقق دل کی کیفیت سے جدا نہیں۔ شاعر اپنے وجدانی ذوق کے ذریعے اس حقیقت کا راز ہم پر کس لطف کے ساتھ منکشف کر دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نے کیسے سیدھے سادے طریقہ پر کر دیا۔ نہ کسی فلسفیانہ موشگافی کی حاجت ہوئی اور نہ وہ منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں خود پھنسا اور نہ دوسروں کو پھنسایا۔ شاعر نے جو رمزی کیفیت پیدا کی وہ اس کے باطنی تخیل کا نتیجہ ہے نہ کہ حسی تجربہ کا۔ حسی تجربہ اس کے نزدیک محض چند علامتیں ہیں جنھیں وہ اپنے تخیل سے اندرونی تجربے میں تحلیل کر لیتا ہے۔ اس طرح منطقی استدلال سے تجربے کی دنیا میں جو سفر کی طوالت لاحق ہوتی اس سے بچ کر وہ تخیل کی ایک ہی زقند میں منزل پر پہنچ گیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ سارے سفر میں نزاکت اور لطافت اس کے دامن سے وابستہ رہی۔ اس طرح اپنے دل کو تخیلی پیکروں سے آباد کر کے غزل گو شاعر حسنِ ازل کا جلوہ خود ہی نہیں دیکھتا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دیتا ہے۔ وہ اپنی تخیل نگاری کو حقیقت نگاری سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے اس واسطے کہ تخیل ہی اس کے نزدیک اصل حقیقت ہے۔ خارجی فطرت کے حقایق سادہ حقایق سے زیادہ وقیع نہیں۔ دیکھنے والے کی شوخیٔ نظر ان سادہ اور بے رنگ حقایق کو رنگین بنا دیتی ہے۔

ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی (جگر)

انسان فطرت کی قدر کر سکتا ہے لیکن اس سے دلی محبت نہیں کر سکتا۔ فطرت کا جدید مغربی تصور ہمارے غزل گو شعرائ کے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ فطرت کی توجیہ انسانی وجود سے علیحدہ ایک قسم کا رومانی خیال ہے جو خارجی حقیقت میں کمال پیدا کرنا چاہتا ہے غزل گو شاعر فطرت کے احساس سے محروم نہیں بلکہ وہ اس کو عادۃً دیکھنے اور برتنے کا خوگر ہے۔ اس کے نزدیک فطرت کی اہمیت بس اتنی ہے کہ وہ انسانی عمل کا پس منظر مہیا کرتی ہے اس لئے وہ خود مرکزِ توجہ نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے فطرت کا ذکر اس کے ہاں ضمنی طور پر آجاتا ہے۔ غزل میں فطرت کبھی موضوع نہیں بن سکتی موضوع کا پس منظر ہو سکتی ہے۔ فطرت کے مناظر دراصل نظم کا موضوع ہیں جو بیانیہ شاعری ہے۔ غزل انسانی دل کے لطیف جذبات وکیفیات کے لئے مخصوص ہے۔ ان کے اظہار میں تخیل کی باطنی توجیہ وتعبیر درکار ہے۔ تخیل ہی جذبہ کا رازدا ہے۔ غرضکہ یوں کہیئے کہ غزل جذبہ کا بیان ہے تخیل کی زبانی۔ نظم لکھنے والا پیچیدہ حقایق کو سادہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ خیال وتصور کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کی تفصیل بیان کرے۔ غزل گو شاعر جانتا ہے کہ احساس وتاثر کی دنیا میں کیمیائی طور پر تجزیہ اور تحلیل ممکن نہیں۔ اس لئے وہ پیچیدہ حقائق کو پیچیدہ رہنے دیتا ہے اور ان کے اندرونی تجربوں کے لئے بجائے تشریح وتفصیل کے اجمال وابہام کی زبان استعمال کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ مطالب اور حقایق کے الجھاؤ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور اس سے بیگانہ ہوکر مستانہ وار آگے بڑھتا ہے۔ اس کا مقصد حقایق کی پیچیدگیوں کو سلجھانا نہیں بلکہ ان کا لطیف تاثر د احساس پیدا کرنا جو رمز و اشتباہ کا رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ اس کے بیان میں استدلال کی کوئی کڑی چھوٹی یا نہیں۔ چھوٹ گئی تو چھوٹ جائے۔ وہ اپنے آپ کو تعقل سے زیادہ تاثر کا تابع فرمان خیال کرتا ہے۔ جذبات کی فرمان برداری اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ لطف یہ ہے کہ غزل گو شاعر کی اکھڑی اکھڑی باتیں جنہیں منطقی استدلال

کا تسلسل اور اس کی سب کڑیاں بھی موجود نہیں ہوتیں اس مبہم اور وسیع حقیقت تک ہماری رہنمائی کر جاتی ہیں جس کی خصوصیت کا پتہ اس جذبہ ہی سے چل سکتا ہے جو انسانی دل میں اس کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ غزل کے بعض اشعار کو سن کر ایسے احساسات و جذبات پیدا ہوتے ہیں جو منطقی تعقل سے کہیں زیادہ گہرے اور پراسرار طریقے پر ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ یہ ربط منطقی تصورات کے ربط سے بالکل علٰحدہ نوعیت رکھتا ہے اور باوجود غزل کی ظاہری ریزہ کاری کے ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقل و ادراک کی تہ کے نیچے تحت شعور اور وجدان کی دنیا میں ان جذبات کا کارخانہ علٰحدہ چل رہا ہے اور اس کے اعتبارات کی نوعیت ہی بالکل الگ ہے اور اس کے انتظام کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں نہیں۔ غالباً یہ جذبات زندگی کی اصل سے بہ مقابلہ عقل کہیں زیادہ قریب ہیں اور زندگی کی بصیرت انھیں سمجھے بغیر ہمیشہ ادھوری رہے گی۔ منطق ان کی نسبت کچھ نہیں جانتی اور ہمیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ وہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں سے سرگوشیاں کرتے ہیں جنھیں ہمارا دل سنتا اور سمجھتا ہے۔

غزل گو شاعر کی دروں بینی میں زبردست تخلیقی قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے اندر جو عالم نظر آتے ہیں وہ خارجی عالم کی رنگا رنگی سے جسے وہ چمن اور گلستان کے استعاروں سے یاد کرتا ہے کہیں زیادہ دلکش اور حسین ہوتے ہیں۔ اس کو سرو و سمن کی سیر کی حاجت نہیں ہوتی اس واسطے کہ اس کے دل کی طلسمی دنیا میں یہ سب کچھ تخیل و جذبہ کے فیض سے پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ بقول بیدل

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ (لہ)

لہ غالباً یہ خیال بیدل نے حافظ سے لیا ہے جس کا شعر ہے:-
حیفم آید کہ خرامی بہ تماشائے بہ چمن — کہ تو خوشتر ز گل و تازہ تر از نسرینی
دوسری جگہ کہا ہے۔
سر در س عشق دارد دل دردمند حافظ — کہ نہ خاطر تماشا نہ ہوائے باغ دارد

پئے نامہ ہائے خجستہ بو مپسند زحمت جستجو
بہ خیال حلقۂ زلف او گرہے خورو بہ ختن درآ

اسی خیال کو ایک دوسری غزل میں بیدلؔ نے اس طرح پیش کیا ہے۔

بیدلاں چند خیال گل و شمشاد کنند
خوں شوند اینہمہ کز خود چمن ایجاد کنند

یہ مضمون اردو کے غزل گو شاعروں کے یہاں کثرت سے ملتا ہے۔ ہمارے شاعروں کی درون بینی اس مضمون میں ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں کرتی ہے کہ ان کا جواب نہیں۔ یہ مضمون شروع سے آخر تک انسان کی اندرونی زندگی کا لطیف استعارہ ہے جسے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ جس طرح دل تخیل کا اندرونی عالم ہے، اسی طرح گل و گلشن سے تخیل کا خارجی عالم مراد ہے۔

یہاں چند مثالیں لکھتا ہوں۔

میرؔ صاحب فرماتے ہیں۔

کم نہیں ہے دل پر داغ بھی اے مرغ اسیر   گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلب گار چمن

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے   اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

جگرؔ کے شعر ہیں:۔

کہاں کے سرو و صنوبر کہاں کے لالہ و گل   نگاہ ہی میں جو کیفیت بہار نہ ہو

عشق میں کیا لالہ و گل کیا چمن کیسا قفس   میں ہی خود اپنا گلستاں میں ہی خود اپنا قفس

فیض سوزِ عشق سے اے دل سراپا داغ ہوں   جو بہار اب مجھ میں ہے سارے گلستاں میں نہیں

صیاد میرے دم سے ہیں سارے یہ چہچہے　　جب میں نہیں تو رونق گلزار بھی نہیں

سمجھائے کون بلبل غفلت شعار کو　　محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے　　یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

دست جنون عشق کی گلگاریاں نہ پوچھ　　ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

حسن کی شانیں تھیں جتنی سب نمایاں ہو گئیں　　جو ترے رخ سے بچیں رنگ گلستاں ہو گئیں

کہاں تک ہیں یہ رنگ و بو کی بہاریں　　تجھے دیکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں

جلوہ جو ان کے رخ کا مرے چشم تر میں ہے　　شادابی بہار کا عالم نظر میں ہے

اپنے سینے کے داغ میں لالہ کا رنگ دیکھنا اور چاک جیب سے بہار کی کیفیت کا اندازہ لگانا دروں بینی کا کمال ہے۔ اسیر لکھنوی کا شعر ہے۔

ہر داغ سینہ لالۂ گلزار فیض ہے
پاتے ہیں چاک جیب میں اندازۂ بہار

پھر جس طرح بہار کے تعین میں شاعر اپنے دل کو مرکز حوالہ قرار دیتا ہے اسی طرح وہ خزاں کی بھی توجیہ کرتا ہے۔

خزاں نہ تھی چمنستان دہر میں کوئی
خود اپنا ضعف نظر پردۂ بہار رہا (جگر)

اگر دل کی بستی آباد نہ رہے تو بہار میں کوئی لطف باقی نہ رہے۔

لطفِ بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار   دل کیا اجڑ گیا کہ زمانہ اجڑ گیا
(آرزو لکھنوی)

اصغر کے یہاں بھی درون بینی کے عناصر ملتے ہیں جن میں شاعر اپنی ذات اور اپنے اندرونی تجربوں کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ شعر ہیں۔

میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ   میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو
اس میں وہی ہے یا مرا حسنِ خیال ہے   دیکھوں اُٹھا کے پردۂ ایوانِ آرزو

کبھی شاعر کی درون بینی اپنے تخیل اور جذبہ کی تسکین کا سامان اس کی ذات میں تلاش کرتی ہے جو اس کے دل میں براجمان ہے۔ یعنی اس کا محبوب۔ اب وہ کائنات کو غیر خود کے حوالے سے دیکھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی درون بینی ہے۔ اس کا اقتضا ہے کہ وہ اپنی جذباتی کیفیات خارجی کائنات پر طاری کر دے اور اس کی من مانی توجیہ پیش کرے۔ موسم بہار کیا ہے؟ وہ کسی کے خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم سے عبارت ہے اور بس۔

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا   (آسی غازی پوری)

کبھی محبوب کے ساعدِ سیمیں اور دستِ پُر نگار کو دیکھ کر شاخِ گل مثلِ شمع جلنے لگتی ہے اور گل پروانہ بن جاتا ہے۔

دیکھ اس کے ساعدِ سیمین و دستِ پُر نگار   شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع گل پروانہ تھا
(غالب نسخۂ حمیدیہ)

گل و نسرین و سمن کی عزت عاشق کی نگاہ میں اس وقت بڑھتی ہے جب اُس کا محبوب سیر و گلگشت کی غرض سے چمن کی جانب خرامِ ناز فرماتا ہے۔

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرین و سمن کی
لائی ہے چمن میں انھیں تقدیر چمن کی   (حسرت)

چمن میں غنچہ کھل کر گل کیوں بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب اور اس مسئلہ

کی شاعرانہ تعبیر و توجیہ سنئے۔ شاعر کا محبوب گلگشت کے لئے چمن کی طرف جا نکلا۔
اس کے انداز و ادا غنچہ کو ایسے بھلے معلوم ہوئے کہ وہ آغوش کھول کر اس سے
بغل گیر ہونے کا متمنی ہو گیا۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

گلشن کو ادا تیری از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

اس مضمون کو آتشؔ نے یوں ادا کیا ہے۔

گئے جس بزم میں، روشن چراغ حسن سے کر دی
بہار تازہ آئی تم اگر گلزار میں آئے

ناسخؔ خزاں کی توجیہ اسی انداز میں کرتا ہے۔

اس رشک گل کے جاتے ہی بس آ گئی خزاں
ہر گل بھی ساتھ ہو کے چمن سے نکل گیا

جب محبوب چمن میں آتا ہے تو فطرت نامیہ شوق بیحد کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر
گل کو اس کے گوشۂ دستار تک پہونچانے کے لئے بے تاب ہو جاتی ہے۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہونچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس (غالبؔ)

میرؔ صاحب نے نسیم سحری کے اترانے کی زلفِ محبوب سے توجیہ کی ہے۔

لگ نکلی ہے کسو کی مگر بکھری زلف سے   آنے میں بادِ صبح کو یاں اِک دماغ ہے

صبا کی بد دماغی پر اس مضمون کا دوسرا شعر ہے۔

شاید اس زلف سے لگی ہے میرؔ   باؤ سے اِک دماغ نکلے ہے

بہار میں جو رنگینیوں کا جوش ہے اس کی تہ میں نکتہ رس شاعر کی آنکھ کسی
کے خونِ تمنا کو شریک دیکھ لیتی ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو رنگِ بہار میں ایسا
نکھار اور چوکھاپن نہ آتا۔

ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش   شامل کسی کا خونِ تمنا ضرور تھا (جگرؔ)

اسی مضمون کے مومن خاں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ تخیل کی ایمائی قوت کا کمال دکھایا ہے۔

باد بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی　　تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشت باغ کو　　کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کیساتھ

پہلے شعر میں خوشبو اور دوسرے میں رنگ رمزی علامت اور محرک جذبہ ہیں۔

مومن خاں کا خیال تھا کہ مرغ چمن موسم بہار میں اس لئے بیتاب ہوتا ہے کہ بہار نے محبوب کے مسکرا کے آنے کی ادا سیکھ لی ہے ورنہ اس میں کوئی دلکشی نہ ہوتی۔ شاعر نے اس شعر میں عاشق کے دل کی کیفیت کو مرغ چمن کے دل پر طاری کر دیا اور اس طرح بہار کی حیثیت ضمنی رہ گئی۔ مرغ چمن کی وارفتگی کی اصل وجہ معشوق کی مسکراہٹ ٹھہری جو دروں بینی کا کمال ہے:-

نہ جائے کیوں دل مرغ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

نکہت گل کسی کے کوچے میں پہونچنے کے لئے ایسی بیتاب ہوتی ہے کہ صبا کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے تاکہ اس کے سہارے وہاں تک رسائی ہو سکے۔

گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچے کی ہوس　　کیوں ہے گرد رہ جولان صبا ہو جانا (غالب)

اگر چمن سے شاعر کو جذباتی تعلق نہ ہو تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ اس کا مقصد محض خارجی مظاہر کا تماشا نہیں ہوتا بلکہ اندرونی اور تخیلی مطالبات کو پورا کرنا۔ اس مضمون پر چند شعر ملاحظہ ہوں۔

زنہار ملے لطف اگر سیر چمن کا　　ساتھ اپنے جو وہ سرو سرافراز نہیں ہے۔ (حسرت)

سیر گل خوش نہیں آتی کسی عنوان ہمیں　　جا کے لوٹ آتے ہیں دیوار گلستاں کے قریب (حسرت)

فصل گل دھوم سے آئی ہے پر اے رشک بہار　　اک ترے پاس نہ ہونے سے خزاں ٹھہری ہے (حسرت)

نہیں کہ عشق نہیں ہے گل و سمن سے مجھے　　دلِ فسردہ لئے جاتا ہے چمن سے مجھے (رضا علی وحشت)

بعض اوقات جدائی کی حالت میں مرغ چمن کی زمزمہ سنجیوں سے لطف کے بجائے کوفت ہوتی ہے اور سننے والے کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان میں زبردست ایمائی کیفیت ہے جو یادوں کو تازہ کرتی ہے۔

از بس جنون جدائی گل پیرہن سے ہے
دلِ چاک چاک نغمۂ مرغ چمن سے ہے　　(مومن)

اسی موضوع کی نسبت میر صاحب فرماتے ہیں:۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

اگر ایک دفعہ عاشق چمن سے بیزار ہو کر اُٹھ جائے تو پھر اس کی کوئی دلکشی اس کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتی۔ میر صاحب نے عاشق کی نازک دماغی کی تصویر اس شعر میں کھینچی ہے:۔

اُٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا　　ہزار مرغ گلستاں مجھے پکارا کیے

میر صاحب کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں:۔

کل دل آزردہ گلستان سے گذر ہم نے کیا　　گل لگے کہنے کہو منہ نہ اُدھر ہم نے کیا

اب کی ہزار رنگ گلستاں میں آئے گُل　　پر اُس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گُل

گلشن بھرا ہے لالہ و گل سے اگرچہ سب　　پر اُس بغیر اپنے تو بھائیں لگی ہے آگ

مجھ کو دماغ وصفِ گُل و یاسمن نہیں　　میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

چمن میں پھول گُل اب کے ہزار رنگ کھلے　　دماغ کاش کے اپنا بھی ٹک وفا کرتا

تم بن چمن کے گل نہیں چڑھتے نظر کبھو ۔ یہ کیا روش ہے آؤ چلے ٹک ادھر کبھو

گل پھول سے کب اس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں ۔ لائی بہار ہم کو زور آوری چمن میں

اچھی لگے ہے تجھ بن گلگشت باغ کس کو ۔ صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو

اسی مضمون کا جراُت کا شعر ہے :-

یاد کس گل کی تھی یارب مرے تن من سے لگی ۔ آگ سی دل میں جو سیر گل و گلشن سے لگی

کبھی عاشق چمن سے کترا کر گزر جاتا ہے کہ کہیں اس کے حال زار کو دیکھکر ہر گل تر ایک چشم خونچکان نہ بن جائے۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خونچکاں ہو جائے گا (غالب)

غم فراق کی حالت میں عاشق کو گل کی بے محل ہنسی بری لگتی ہے اور گلشن سے اس کی طبیعت گھبراتی ہے۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو ۔ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا (غالب)

شاعر کے لئے بہار میں ایک طرح کی ایمائی قوت ہوتی ہے۔ اس سے اس کی یادیں تازہ ہوتی ہیں۔

جلوہ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد ۔ جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

ابر شفق آلودہ کو دیکھ کر شاعر کو یہ یاد آیا کہ کسی کی فرقت میں چمن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر آگ برس رہی ہو۔

مجھے اب دیکھکر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر (غالب)

اسی مضمون کو فانی نے یوں ادا کیا ہے :-

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر   کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

اصغر کا شعر ہے:-

نگاہِ شوق کو یارائے سیر دید نہ ہو   جو ساتھ ساتھ تجلّیِ حسنِ یار نہ ہو

چمن میں بادِ بہاری کے قدم سے جس طرح نئی زندگی جنم لیتی ہے اسی طرح مایوس اور شکستہ دل میں کرمِ یار کی یاد سے تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

دلِ پُرشوق میں آئی کرمِ یار کی یاد
کہ چمن میں قدمِ بادِ بہاری آیا (حسرت)

ہماری شاعری میں اس کی مثالیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں کہ شاعر گلشنِ فطرت کی نیرنگیوں کا تماشا اپنے اندرونی احوال و محرکات کے حوالے سے کرتا ہے اور ان کی شاعرانہ توجیہ پیش کرتا ہے۔ اردو کے مختلف دوروں کے شعرا کے کلام سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

ولی کا شعر ہے:-

جاتا ہوں باغ یاد میں اس چشم کی ولی   شاید کہ بوئے اس کی ہو نرگس کی باس میں

میر صاحب کے دیوان میں گل و گلشن کے اصطلاحی استعاروں کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں فارسی اور اردو کے کسی شاعر کے دیوان میں اتنی مثالیں نہیں ملیں گی۔ یہاں صرف چند پیش کی جاتی ہیں۔

سرو شمشاد خاک میں مِل گئے   تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا؟

اس چہرہ کی خوبی سے عبث گل کو جتایا   یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا

گل کام آدے ہے ترے منہ کے نثار کے   صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشکِ یاسمن   کم گوشۂ چمن سے ترا رہ گذر نہیں

آتی بخود نہیں ہے باد بہار اب تک — دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو

سرو و گل اچھے ہیں دونوں رونق ہیں گلزار کی لیک — چاہیے رو اس کا سا رو ہو قامت ویسا قامت ہو

اگرچہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے — ولیک چاہیے ہے منہ بھی ناز کرنے کو

آغشتہ میرے خون سے اے کاش جا کے پہنچے — کوئی پر شکستہ ٹک گلستاں تلک تو

پائے گل اس چمن میں چھوڑا گیا نہ ہم سے — سر پہ ہمارے ابکی تہمت ہے بے پری کی

گل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی چاہے — یعنی ہزار جی سے قربان ہو رہا ہے

گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم — مدتیں گذریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

گلگشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے — آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے

کیا جانیں وہ مرغان گرفتار چمن کو — جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

سرو تہ و بالا ہوتا ہے درہم برہم شاخ گل — ناز سے قد کش ہو کے چمن میں ایک بلا تم لائے ہو

سیر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو — ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے

گل نے ہزار رنگ سخن وا کیا ولے — دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

کل ہم بھی سیر باغ میں تھے ساتھ یار کے — دیکھا تو اور رنگ ہے سارے چمن کے بیچ

سچ پوچھو تو کیا ہے گا اس کا سا دہن غنچہ — تسکین کے لئے ہم نے ایک بات بنائی ہے

برسوں سے گل چمن میں نکلتے ہیں رنگ رنگ — نکلا نہیں ہے ایک رخ یار سا ہنوز
دیکھا تھا خانہ باغ میں پھرتے اسے کہیں — گل حیرتی ہے صورت دیوار سا ہنوز

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھے تھے سرخ و زرد — پھول چمن کے کس کے منہ سے ایسی خجلت کھینچے تھے

پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے — کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا — جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو — چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا[1]

مصحفی کے شعر ہیں :-

---

[1] حافظ بھی اپنے محبوب کے توسط سے گلشن فطرت کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بوئے زلف و رخت می روند و می آیند — صبا بغالیہ سائی و گل بجلوہ گری
فرخندہ ز گل تو چمن را حیات دہ — جعد بنفشہ تو صبا را گرہ کشائے
مرغول سنبل از دم کوئے تو خوش نسیم — زلف صبا ز خاک جناب تو مشک سائے

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں ہر گل کا اُڑاتی ہے نسیم سحری رنگ

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے

غالب کے یہاں یہ مضمون طرح طرح سے ملتا ہے۔ شلاً اپنی وارفتگی اور حیرانی کو فطرت پر اس طرح طاری کرتے ہیں:-

آئینہ خانہ ہے صحن چمنستان یکسر بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیران گل و صبح

گل اور صبح دونوں فطرت کے کس قدر لطیف مظہر ہیں۔ ان دونوں کی حیرانی اور طلسم میں کس قدر شعریت ہے۔ پھر ان کی حیرانی انھیں کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ پورے چمن پر چھا جاتی ہے اور اسے آئینہ خانہ بنا دیتی ہے۔ حیرانی کی مناسبت سے چمن کا آئینہ خانہ بن جانا شعری رمزیت کا کمال ہے۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں:-

چشم بے خون دل و دل تہی از جوش نگاہ بزباں عرض فسون ہوس گل تا چند (نسخہ حمیدیہ)

یعنی اگر آنکھ خون دل سے نا آشنا ہے اور دل جوش نگاہ سے بے گانہ ہے تو ہوس گل کی فسوں کاریوں کا ذکر بے معنی ہے۔ یا یوں کہیے کہ تماشائے گل و گلشن اس وقت وجہ جواز رکھتے ہیں جبکہ آنکھ خون دل سے اور دل جوش نگاہ سے آشنا ہو۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ لالہ زار کا ہر ورق، ورق انتخاب ہے۔ اس کی سیر اسی کو زیب دیتی ہے جو صاحب دل و نظر ہے۔ ہر کس و ناکس کا یہ منصب نہیں کہ سیر گلشن کی آرزو کرے۔

بے چشم دل نہ کر ہوس سیر لالہ زار یعنی یہ ہر ورق، ورق لالہ زار ہے۔ (نسخہ حمیدیہ)

گلستان کی تمام زمزمہ سنجیوں کی توجیہ غالب اس طرح کرتے ہیں۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

شاعر کو اپنے اہل نظر اور چمن کے نظر فریب ہونے کا احساس ہے لیکن زندگی

سے شکایت ہے کہ بہت کم ہے۔ وسعت نظر جتنی ہونی چاہیے اتنی نہیں۔

ہیں چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

اسی مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے:

آغوش گل کشادہ برائے وداع ہے — اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

شاعر کے نزدیک گلوں کی برگ ریزی ایک طرح کی زر افشانی ہے جو محبوب کی گل اندازی باج کے طور پر تحسین سے وصول کرتی ہے۔

برگ ریزی ہائے گل ہے وضع زر افشاندنی — باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندازی تری

گلشن میں محبوب کی بے حجابیوں کو عاشق پسند نہیں کرتا اور اپنے جذبہ رشک کو احساس حیات تعبیر کرتا ہے۔ نکہت گل سے عاشق کو شرم آنا عجیب و غریب نزاکت خیال پر دلالت کرتا ہے معشوق کی بے حجابی سے پہلے نکہت گل کی بے حجابی پر وہ حرف گیر ہوتا تھا لیکن اب اسے خاموش ہونا پڑا۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

کبھی محبوب کی سیر گلشن کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ وہ اس بہانے سے اپنے زخمیوں کو دیکھنے آیا ہے۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
گئے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

شاعر جب زندگی کو سمجھنے کے لئے اپنے محبوب یا غیر خود کو مرکز حوالہ قرار دیتا ہے تو اس طرح نغمہ طراز ہوتا ہے۔

فسردگی میں ہے فریاد بے دلاں تجھ سے — چراغ صبح و گل موسم خزاں تجھ سے
بہ حسرت چمن گل آئینہ در کنار ہوں — نسیم نور تماشا شگفتن تجھ سے
اسد! بہ موسم گل در طلسم کنج قفس — خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستاں تجھ سے

(نسخۂ حمیدیہ)

اور جب اپنی ذات کے توسط سے کائنات کی بزم تماشا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

پھر اپنی ذات اور محبوب دونوں کی اہمیت اس شعر میں واضح کی ہے۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

غالبؔ نے ایک اور جگہ ذاتِ باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ شعلۂ ایمان کی آتش افروزی تیرے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان کی اہمیت کسی طرح کم ہو جاتی ہے۔ زندگی کی رونق انسان ہی کی ذات سے وابستہ ہے اس لئے کہ تمدن کا خالق وہی ہے۔

آتش افروزی یک شعلۂ ایماں تجھ سے
چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

بعد میں اقبالؔ نے اس تصور کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا اور کائنات کے نظام میں انسان کی اہمیت واضح کی۔ انسانی فضیلت کا مضمون اقبالؔ کے کلام میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ لیکن اس تصور سے غالبؔ بھی ناآشنا نہیں ہے۔ اس کا شعر ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

غالبؔ نے ایک پوری غزل ہوسِ گل کے اسرار و طلسم پر لکھی ہے۔ گل یہاں شاعر کے تخیل کا خارجی رمز ہے۔ کہتے ہیں۔

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل کے اس بھروسہ پر کہ گل کا رنگ و بو قائم رہنے والا ہے، گل ہنس رہے ہیں۔ بلبل کی دیوانی حرکتوں پر گل کبھی ہنستے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں کہ جس چیز کا نام عشق ہے وہ اصل میں دماغ کا خلل ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

گل والی غزل کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار　　میرا رقیب ہے نفس عطر سائے گل

گل کی خوشبو سے عاشق کی رقابت عجیب و غریب مضمون ہے یہ رقابت اس لئے ہے کہ بہار نے یہ خوشبو محبوب کی خاطر پیدا کی اور اس کو محبوب سے قرب و اتصال نصیب ہوگا۔ چنانچہ گل کی ہر ادا ناگوار ہے۔ ایک تو اس کی خوشبو سے رقابت کی وجہ سے ناگوار ہے اور دوسری وجہ اس شعر میں بتائی ہے۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حسن غیور کی　　خوں ہے مری نگاہ میں رنگ ادائے گل

محبوب کا حسن غیور اپنی مماثلت کو عار سمجھتا ہے اور اسے یہ بات پسند نہیں کہ مجھے کسی اور کی ادا بھی معلوم ہو۔ چنانچہ گل کی رنگینی اور اس کی ادائیں میری نظر میں خون معلوم ہوتی ہیں۔

اب محبوب کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے کر گلوں کے شگفتہ ہونے کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں۔

تیرے ہی جلوے کا ہے وہ دھوکا کہ آج تک　　بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

یعنی گل جو ایک دوسرے کے بعد چمن میں برابر کھلتے رہتے ہیں تو اصل میں یہ تیرے جلوہ کا ذوق دیدار ہے جو انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

مقطع ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو　　جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

یعنی مجھے اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو گل نے اپنی جیب قبا کی زینت بنایا ہے۔ اس طرح میرا محبوب صرف میرا ہی محبوب نہیں ہے بلکہ کائنات کے لطیف ترین مظاہر بھی اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ اس سے اپنی اور محبوب دونوں کی بڑائی ثابت ہوتی ہے۔

گلشن فطرت کا مشاہدہ ہمارے دوسرے شاعروں نے بھی اپنی اپنی بساط کے موافق کیا اور اس کے نظام عام میں اپنی اور کبھی اپنے محبوب کی اہمیت واضح کی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ذوق کا شعر ہے:۔

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق — اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

ظفر کہتے ہیں۔

نہ ہوس سیر چمن کی نہ گل تر کی ہوا — سر عاشق میں ہے اس سرو سمن بر کی ہوا

دامن کا عکس کس کے پڑا ہے کہ آج تک — پھیلا رہا ہے سر لب جوئبار ہاتھ

(تجلی علی شاد)

اے عندلیب تجھکو ہے راحت چمن میں کیا — اس رشک گل کا جلوہ ہے سرو سمن میں کیا

(ذکی دہلوی)

کھولے ہوئے رہتے ہیں گل دیا سمن آغوش — بنتا ہے غرض شوق میں تیرے چمن آغوش

(ذکی دہلوی)

رونق محفل جو وہ رند شرابی ہو گیا — پھول ساغر بن گیا غنچہ گلابی ہو گیا

(اسیر لکھنوی)

بہار گل کیا ہے اسکو بھونکو چمن میں چل کر یہ سیر دیکھو — کہ شمع رخسار پر تمہارے جلے گی بلبل پتنگ ہو کر

(داغ)

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا — اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

(داغ)

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ — چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا

(اشرف لکھنوی)

گل ہیں یہ پژمردہ تو غنچہ بھی گرفتہ دل ہے — جاتے ہی یار کے رونق گئی گلزاروں کی

(رند)

اس روش سے وہ چلے گلشن میں — بچھ گئے پھول صبا لوٹ گئی

(امیر مینائی)

گلوں کو دیکھ کے سودائے زلف یار ہوا — بہار آئی تو سر پہ جنون سوار ہوا
(مست بنارسی)

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے — کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے
(جلیل)

خاک چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ — ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا
(جلیل)

آج ہے وہ بہار کا موسم — پھول توڑوں تو ہاتھ جام آئے
(جلیل)

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اے نسیم صبح — کچھ اٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خواب ناز میں
(جلیل)

موسم گل میں حسینوں کا موقع ہے چمن — جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے
(جلیل)

چمن میں ہر طرف بوئے محبت مجھکو آتی ہے — گلوں پر پڑ گیا شاید پسینا روئے جاناں کا
(اشرف)

رنگینیٔ سرشک محبت کے حسن سے — دامان عاشقاں ہے گلستان عاشقاں
(حسرت)

ترے روئے دل آرا کے تصور کا یہ عالم تھا — کہ چشم شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے
(حسرت)

چمن میں باد بہاری بھی گل کی آنکھوں سے — چلی کہ دیکھے تماشا تری سواری کا
(حسرت)

غالب کے ہاں گلشن فطرت کی رنگا رنگی کے مشاہدے کے ساتھ ایک اور نیا خیال بھی ملتا ہے جو اقبال سے پہلے شائد غالب ہی نے بیان کیا ہے۔ غالب نے بھی فطرت کا مشاہدہ اپنے اندرونی احوال و محرکات کے حوالے سے کیا۔ اس نے صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ خارجی فطرت کا مصرف تسخیر و تصرف کو ٹھہرایا تاکہ وہ انسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ اس نے تماشائے گلشن کے ساتھ تمنائے چیدن کی کسک محسوس کی۔ انسانی خواہشات سے مظاہر فطرت کا جب ربط قائم ہو جاتا ہے تو ان کے پھل اور بار میں ترتیب و معنی پیدا ہوتے ہیں۔ غالب کے نزدیک گلشن بہار خود تمنائے چیدن کی متقاضی ہوتی ہے اس لئے جائز ہے۔ اور اگر کوئی اسے ناجائز کہے تو غلط۔ غالب بہار گلشن کو پیدا کرنے والے کو اس طرح خطاب کرتا ہے:—

تماشائے گلشن تمنائے چیدن بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

غالب کے اس شعر میں اقبال کے تصورات کی حرکت اور قوت نہایت لطیف انداز میں نظر آتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ حکیمانہ موضوع شعریت کو مجروح کرتے ہیں اس شعر میں حکمت کو نغمہ کے ساتھ بڑی خوبی سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ غالب کے انتخاب میں یہ شعر چھوٹ گیا۔ اس غزل کے دو اور شعر نہایت بلند ہیں۔ کہتے ہیں:۔

نہ ذوق گریباں نہ پروائے داماں نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسد! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

آپ نے مندرجہ صدر مثالوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ کس طرح تخیل کی گلکاری سے غزل گو شاعر کی درون بینی انسانی جذبات کے طلسم کو فطرت پر طاری کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کائنات مدرکہ میں اس کو بس وہی نظر آتا ہے جس کو اس کا اندرونی احساس دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ تخیل و جذبہ دونوں مظہر الوہیت ہیں اور اس لئے تقدس کے حامل۔ یہ زندہ اور موثر حقایق ہیں جو خارجی کائنات کے حوادث کو اپنی گرفت میں لینے اور ان پر اپنا رنگ طاری کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ انھیں کے اشارۂ چشم و ابرو پر انسانی دنیا کی ساری حرکت اور رقص مبنی ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔ زندگی کا کیف و سرور دل زندہ کا رہین منت ہے:۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

تخیل و جذبہ کی آمیزش اور ہم آہنگی اپنے تخلیقی جوش میں ان ابدی اسرار کو ہم پر منکشف کر دیتی ہے جن تک پہونچنے کے لئے تعقل کے پر جلتے ہیں ان کے بادپا پر سوار ہو کر انسان ابدیت کی وادیوں کی سیر کر سکتا ہے۔ وہاں اسے جو طلسم اور تماشے نظر آتے ہیں انھیں رمز و ایما ہی کے ذریعہ بیان کرنا ممکن ہے۔ دراصل غزل کی ریزہ کاری کی بھی یہی وجہ ہے کہ رمز و کنایہ کو منطقی تسلسل بیان کی حاجت نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں بھی شدت احساس کی

کار فرمائی ہوگی وہاں کلام میں عدم تسلسل پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ سامع کے تخیل کا فرض ہے کہ وہ عبارت کے خلا کو اپنی ذہنی کاوش سے پُر کرے۔ دنیا کی اکثر الہامی کتابوں میں آپ یہی خصوصیت پائیں گے منطقی تسلسل خارجی واقعات اور حقایق کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے۔ منطق عقل کی زبان ہے۔ وجدان کی زبان رمز و کنایہ ہے جو منطقی استدلال و تسلسل سے بے نیاز ہے اور اسی وجہ سے اس کے جذب و تاثیر کی کوئی انتہا نہیں۔

یہ درست ہے کہ جذبہ کا رمزی بیان صرف غزل کے لئے مخصوص نہیں۔ اعلیٰ پایہ کی نظم میں بھی یہ ممکن ہے لیکن شاذونادر۔ نظم میں عمرانی اور فطری حقایق کے خارجی احوال کے علاوہ اندرونی کیفیات بیان کی جاسکتی ہیں۔ اور خاص حالات میں سامع کے دل میں انبساط و انقباض اور جوش و نفرت و محبت کے جذبات برانگیختہ کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن نظم کی ٹیکنک کا اقتضایہ ہے کہ مطالب واضح طور پر اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ ابہام اور اجمال نظم کے لئے سازگار نہیں۔ اور غزل کی یہی دونوں چیزیں جان ہیں۔ رمز و کنایہ میں اگر تفصیل آگئی تو وہ بے مزہ ہو جائیں گے۔ پھر اس کے علاوہ چونکہ غزل میں واردات حسن و عشق کو بیان کیا جاتا ہے جو نہایت گہری اور پر اسرار ہوتی ہیں اور تفصیل کی متحمل نہیں ہوسکتیں اس لئے رمز و کنایہ کے بغیر چارہ نہیں۔ قلبی واردات ہمیشہ ابہام اور اجمال کی متقضی ہوتی ہیں۔ شرح درد اشتیاق اور ذکر جمال اجمال چاہتا ہے، کنایہ چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو بات کہی جائے مبہم طور پر کہی جائے۔ دل کو کنایہ اور اجمال پسند ہے اور دماغ کو تشریح و وضاحت۔ استعارہ اور رمز و کنایہ کی ایمائی قوت سے شاعر کے محدود مشاہدہ میں بے پایانی پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کے شعر کا مطلب ایسا معنی خیز ہونا چاہیئے کہ تحریک ذہنی اس کے اندر مختلف جذباتی اور تخیلی کیفیات پوشیدہ دیکھے جن سے تحت شعور کی بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں، اور تازہ ہوتی

رہیں۔ غالب نے اپنے کلام کی جہاں خصوصیات بتائی ہیں ان میں اجمال، ابہام اور کنایہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ انھیں پر تاثیر کا دارومدار ہے۔ ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کی نظر ادب کے متعلق کتنی گہری اور وسیع تھی۔

وہ کہتا ہے :-

فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر   کلک میری رقم آموز عبارات قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح   میرے اجمال پہ کرتی ہے تراوش تفصیل

یہ اشعار اگرچہ ایک قصیدہ میں کہے گئے ہیں لیکن ان میں تغزل کی روح بیان کر دی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے قصائد میں بھی غزل کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اس کے قصائد دوسروں کے قصائد کی طرح محض بیانیہ نہیں ہوتے بلکہ ان میں استعارہ اور رمز و ایما کی جھلکیاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔

رمز و ایما کی اہمیت کے متعلق غالب کے کلام میں اور بھی اشارے ملتے ہیں۔ وہ لیلائے سخن کو محمل نشین راز ہی رکھنا چاہتا ہے :-

شوخی اظہار کو جز وحشت مجنوں اسد
بسکہ لیلائے سخن محمل نشین راز ہے   (نسخہ حمیدیہ)

سخن عشق کی سوختہ نفسی اس کے دل کی اندرونی بہار کی آئینہ دار ہے جسے وہ "رمز چمن ایمائی" کی خوشنما ترکیب سے ظاہر کرتا ہے :-

باغ خاموشی دل سے سخن عشق اسد
نفس سوختہ رمز چمن ایمائی ہے   (نسخہ حمیدیہ)

یقینی ہے کہ غزل گو شاعر اپنے کلام میں جو لفظ برتتا ہے ان سے ظاہری معنوں کے علاوہ بھی اس کا کچھ مقصود ہوتا ہے۔ لفظوں کو وہ علامتوں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بظاہر جتنا وہ کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ حقیقت میں کہہ جاتا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام   چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالبؔ نے فارسی میں اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ۔

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادا ئے دارد
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نزود

دوسری جگہ کہتے ہیں :-

ز فیست نہ اندک ز دلم تا بدل تو
معذوری اگر حرف مرا زود نیابی

غزل گو شاعر رمز و کنایہ کی ایمائی قوت سے لفظوں میں وہ تاثیر پیدا کرنا چاہتا ہے جو موسیقی میں بولوں سے پیدا کی جاتی ہے جو صوتی رموز ہیں۔ وہ چیزوں کے نام نہیں لیتا اور نہ واقعات کو مفصل بیان کرتا ہے بلکہ ان کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتا ہے ۔ دردؔ کے اس شعر کی ایمائی کیفیت ملاحظہ ہو۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

سوداؔ کے اس شعر کی ایمائی قوت کی کوئی حد نہیں۔

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ظفرؔ کا شعر ہے :-

لے جنوں ہاتھ سے تیرے نہ رہا آخر کار چاک داماں میں اور چاک گریباں میں فرق

غالبؔ اور مومنؔ کے ہاں رمز و کنایہ کو بڑی خوبی اور نزاکت سے برتا گیا ہے ۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں جن پر ہماری زبان اور ادب جتنا ناز کریں بجا ہے ۔

غالبؔ

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی — پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال — دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

غالب کی غزلیں کی غزلیں کنایوں سے بھری پڑی ہیں۔ پھر یہ کنائے محض کنائے نہیں بلکہ لطفِ شعری میں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ رمز و کنایہ کی کیفیت میں رچا ہوا ہے۔ پورا دیوان دیکھ جائیے کوئی غزل ایسی نہیں ملے گی جو لطف سے خالی اور محض بیانیہ ہو۔ بیانیہ غزلیں بھی جن میں تسلسل ملتا ہے، زیادہ تر استعارہ کی زبان میں کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں کا تسلسل رمز و کنایہ کا تسلسل ہے نہ کہ منطقی تسلسل۔ اس کی بزمِ خیال کی رنگارنگی ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں صرف دو غزلیں ملاحظہ طلب ہیں۔

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب — اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار، بادہ، حوصلہ ساقی نگاہ مست — بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ وارداں بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گلفروش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصد نگاہ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلال جنس رسوائی
دل خریدار ذوق خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے
روز بازار جان سپاری ہے

پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگان کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ان دونوں غزلوں میں جو تسلسل ہے وہ رمز اور استعارہ کا تسلسل ہے اگرچہ ضمنی طور پر مضمون کا تسلسل بھی آگیا۔ غزل کی اصلی خوبی مضمون کا تسلسل نہیں۔ شاعر کو اختیار ہے کہ اگر اسے باقی نہ رکھنا چاہے تو ہر شعر میں علحدہ رمزی کیفیت پیش کرے اس کے ہر شعر کو بجائے خود مکمل حیثیت حاصل ہوگی اور وہ اندرونی تجربہ کے ہر لمحہ کی طرح کافی بالذات ہوگا۔ اس طرح غزل گو شاعر رمز میں کچھ چھپاتا ہے اور کنایہ سے کچھ بتاتا ہے لیکن اس طرح کہ اشاروں کو سمجھنے والے ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

مومنؔ خاں کے کلام میں بھی رمز و کنایہ کثرت سے استعمال ہوا ہے اور چونکہ وہ کنایہ کے ساتھ بہت کچھ مطالب اور ان کی منطقی کڑیاں حذف کر جاتے ہیں اس لیے سامع کو بھٹک کر ذرا سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا کہہ گئے۔ ان کے کلام میں خالص کنایہ کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ جیسی اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔ مثلاً

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

شعلہ دل کو ناز تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

دیدۂ حیران نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
دل ربائی زلف جاناں کی نہیں پیچ و تاب طرۂ شمشاد کیا

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

پوچھنا حال یار ہے منظور — میں نے ناصح کا مدعا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا — تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

امتحان کے لئے جفا کب تک — التفات ستم نما کب تک

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق — ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

نہ جانے کیوں دل مرغ چمن کہ سیکھ گئی — بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی
خیال زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا — امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم — کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

معانی کی ایمائی رمزیت اردو کے سب بڑے شاعروں کی کلام میں ملتی ہے چند اور مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

(آتش)

اتنی بھی بُری ہے بے قراری — اب آپ سے اُنس کم کریں گے

(شفتہ)

کج ادائی یہ سب ہیں تک تھی — اب زمانہ کو انقلاب کہاں

(مجروح)

صدسالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور — نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

(گستاخ رامپوری)

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل — اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

(امیر مینائی)

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی — چاک داماں بھی باندازۂ داماں نکلا

(فانی)

کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو — بڑھ چلا ہے میرے دامن سے گریباں میرا

(فانی)

بہت خجل ہے تیرے درد سے دعا میری — یہ خوف ہے کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری

(حسرت)

زندانیوں کو آکے نہ چھیڑا کرے بہت — جانِ بہار نرگسِ رسوا کہیں جسے

(اصغر)

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — اک مسیحا نفس کی بات گئی

(جگر)

گلشن بہار پر تھا نشیمن بنالیا — میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا

(ثاقب لکھنوی)

انسانی شعور اور تحت شعور میں بہت یہ کچھ ہے جسے لفظوں میں صراحت سے

ظاہر نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس کے کوئی خارجی معین خطوط نہیں ہوتے بلکہ ایک مبہم سا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کے شعوری یا تحت شعوری تاثرات و احساسات کو صرف رمز و ایما ہی کے ذریعہ سے بیان کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ غزل کے ہر عمدہ شعر میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو معنی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس سے جو مسرت یا تاثر حاصل ہوتا ہے اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے جو نغمہ و موسیقی سے حاصل ہوتی ہے۔ تغزل موسیقی سے بہت قریب ہے اور اسی میں اس کی پائداری اور قوت کا راز مخفی ہے۔ لیکن شعر اور موسیقی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شعر الفاظ کا جامہ زیب تن کرتا ہے جن کے کچھ نہ کچھ معنی ہوتے ہیں اور وہ عمرانی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے صرف ان تصورات کا اظہار ممکن ہے جن میں دوسرے شرکت کر سکیں۔ ہر لفظ حقیقت میں ایک تصور ہے جو اپنے اندر بعض مخصوص تاریخی اور تمدنی لوازمات پوشیدہ رکھتا ہے۔ لیکن موسیقی لفظوں سے بے نیاز ہو کر رمز و علامت سے جمالیاتی اثر آفرینی کرتی ہے۔ شعر میں وزن اور بحر اور قافیہ اس کی ایمائی کوتاہی کو بڑی حد تک دور کر دیتے ہیں۔ اور خود لفظ اپنی مکانی اور عمرانی نوعیت کے باوجود زبردست ایمائی قوت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ انھیں ٹھیک طور پر استعمال کیا جائے۔ بعض بحریں ایسی پھڑکتی ہوئی اور قافیے بولتے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ بجائے خود شعر کے معنی سے زیادہ جاذب قلب و نظر ہوتے ہیں۔ سنتے ہی ان سے احساس متاثر ہوتا ہے۔ بعد میں دماغ معنی پر غور کرتا ہے۔ معنی اور لفظ دونوں سے زیادہ اہم خود شعر ہے جو اگرچہ بادی النظر میں لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ سے عبارت ہوتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں سے الگ اپنا آزاد طلسمی وجود رکھتا ہے۔ شعر صرف احساس و خیالات کو منتقل کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ اس سے کچھ زیادہ بھی ہے وہ لوگ جو شعر کے مقصد کو سمجھنے کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ انھیں

اس کا موقعہ نہیں ملتا کہ وہ یہ سمجھیں کہ خود شعر کیا ہے۔ اس قسم کے نقاد اکثر و بیشتر شعر کی موسیقیت کو نہیں محسوس کرتے۔ تحلیل و تجزیہ شعر کی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔ شعر کے بنیادی تصور کی جب توجیہ کی جائے تو وہ نثر بن جاتا ہے۔ شعر کی شعریت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس نقطہ پر پہونچ کر نقاد کا نقد و نظر سکوت سے بدل جاتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا وہ کچھ بھی نہیں۔ ابھی سب کچھ کہنا باقی ہے۔ شعری رمز کے آگے نطق و بیان سر بگریبان نظر آتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ غزل کے شعر کو صرف اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم میں سے ہر ایک کی انفرادیت الگ ہے اسی طرح ہر ایک کے ذاتی تجربے علیحدہ ہیں۔ اس لئے شعر فہمی کے علیحدہ علیحدہ معیار ہمیشہ رہیں گے اور انفرادی احساس کی طرح شعر کی شعریت کا تعین بڑا دشوار رہے گا۔ ممکن ہے دو اشخاص کم و بیش ایک ہی قسم کے اشعار کو پسند کرتے ہوں لیکن ان اشعار سے جو تاثرات مترتب ہوتے ہیں وہ دونوں کے لئے مختلف ہوں۔ ہر عہد کی تنقید میں شعر سے مختلف مطالبے کئے جائیں گے اور مطالبہ کرنے والے اپنی اپنی جگہ حق بجانب ہوں گے۔ کسی زمانے میں بھی کسی شخص کا یہ دعوی کرنا کہ شعر کو ایسا ہونا چاہیئے اور ایسا نہ ہونا چاہیئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہر زمانے میں شعر غزل سے جو مطالبہ کیا جائے گا اسمیں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر ملیں گی۔ مثلاً یہ کہ وہ موسیقی میں رچا ہوا ہو۔ ہمارے جذبات و شعور میں نزاکت پیدا کرے اور زندگی کے واقعات اور تجربوں کو رمز و کنایہ کی صورت میں اس انداز سے پیش کرے کہ ہم باطنی طور پر انھیں پہلے سے بہتر محسوس کر سکیں اور پہلے سے بہتر سمجھنے لگیں۔ لفظ "زندگی" بہت وسیع اور جامع لفظ ہے۔ ہمیں ان حقائق حیات کا تعین کرنا پڑے گا۔ جو غنائی شاعری یا غزل کا موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ بیکی

اور ریل گاڑی نظم کے موضوع ہو سکتے ہیں لیکن غزل کے موضوع نہیں بن سکتے۔ داستانِ حسن و عشق کے علاوہ جو کبھی فرسودہ نہ ہوگی حکمت و اخلاق اور تصوف کے نکات بھی غزل کا موضوع رہے ہیں۔ لیکن انھیں محض گوارا کیا گیا ہے۔ اس کا اصل موضوع ہمیشہ عشق مجازی ہی رہا۔ غزل گو شاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی نام ہے علائق کا۔ جہاں تعلق ہوگا وہاں جذبہ ہوگا اور جہاں جذبہ ہوگا وہاں تعلق بھی ضرور ہوگا۔ غزل گو شاعر کی رمز آفرینیاں اور استعارے زندگی کے طلسمی علائق کی تصویریں ہیں۔ ممکن ہے بظاہر معلوم ہو کہ یہ تصویریں زندگی کی ہو بہو نقل نہیں۔ لیکن نقل تو شاعر کے پیش نظر کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اشیا اور حقائق کو ویسا نہیں دیکھتا جیسے کہ وہ ہیں یا بظاہر نظر آتے ہیں۔ وہ حیات و کائنات کے مظاہر کو اپنے جذبہ کے ساتھ مربوط کر لیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ ان کی کیا شکل نکلی۔ وہ اپنے جذب درون سے زندگی کی تصویر میں رنگ آمیزی کرتا ہے، جبھی تو وہ جاذب نظر بنتی ہے۔

غزل گو شاعر کی دروں بینی اور تخیل نگاری کا مقصد حسن و عشق کی ابدی داستان کو ایمائی انداز سے بیان کرنا ہے۔ اس داستان کا وہ خود ہیرو ہوتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا ہر شعر اس کے دل کا ایک قطرۂ خون ہو اور اس کے اندرونی تجربہ کے کسی ایک لمحہ کا اس میں مکمل اظہار پایا جاتا ہو۔ عشق جذبات انسانی کا سرتاج ہے۔ عالم کی رونق اور ہما ہمی اسی کی کرشمہ زائیوں کی رہینِ منت ہے۔ زیست کا مزہ بغیر عشق کے ممکن نہیں۔ یہ درد کی دوا بھی ہے اور پھر خود ایسا درد ہے جس کی دوا نہیں۔ بقول غالب۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

فسانۂ محبت اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانی زندگی۔ اس دل پذیر افسانے کے جتنے ٹکڑے جسے یاد ہیں وہ انھیں سنائے بغیر نہیں رہتا۔ جگر نے کیا خوب کہا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی سناتا جا رہا ہے جسکو جتنا یاد ہوتا ہے
بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غزل لکھنے والے شاعروں کا ادعائے عشق مصنوعی اور ان کا معیار محبت پست ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ جب وہ حسن و جمال کا ذکر کرتے ہیں تو بالعموم ان کی مراد مجاز ہوتی ہے سوائے چند صوفیانہ رجحانات رکھنے والوں کے جو اس سے حقیقت مراد لیتے ہیں۔ سوائے میر درد، نیاز بریلوی، اصغر گونڈوی اور چند دوسرے شعرا کے غزل نگاری میں عشق مجازی ہی کو کمال بینی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور عینی محبت کے وارداتوں اور معاملوں کو لطف بیان میں سمو کر دل پذیر بنایا گیا ہے۔ پھر اس وادی کا کوئی نشیب و فراز ایسا نہیں جو ہمارے غزل گو شاعروں کی نظر سے بچ گیا ہو۔ ان کو محبت کی دنیا کے حقائق پسند ہیں۔ ان کے علاوہ خارجی عالم کے حقائق ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اس واسطے وہ ان کی طرف اگر کبھی نظر اٹھاتے ہیں تو نظر پلٹ آتی ہے اور پھر وہ اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کے ذہن و فکر پر عشق کا جذبہ ایسا طاری رہتا ہے کہ وہ اسی کی بصیرت سے دنیا کو دیکھتے ہیں، چاہے وہ حقیقت کی دنیا ہو یا مجاز کی۔

بقول ولی۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا

بعض غزل گو شاعروں کے ہاں شاہد بازی اور کامجوئی کے اشارے ملتے ہیں لیکن بالعموم بوالہوسی اور محبت میں فرق و امتیاز کیا گیا ہے۔

میر صاحب فرماتے ہیں:۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

غالب کا شعر ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

میر صاحب نے عشق بتان کے شعری رمز کو ایک جگہ صاف طور پر واضح کر دیا ہے

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا   ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

جذبات عشق کی پاکبازی اسی طرح لازم و شرط ہے جس طرح حسن کی معصومیت کا تصور۔ عشقیہ واردات اور اپنی رندمشربی کے لئے غزل گو شاعر جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ بطور علامات و رموز کے ہیں جن کے ذریعہ ان کہنی باتیں بھی کہدی جاتی ہیں اور اس سلیقہ سے کہی جاتی ہیں کہ کیا کہنا۔ اس باب میں ہمارے شاعروں نے رمز نگاری کا جو کمال دکھایا ہے میں سمجھتا ہوں اس کی مثال دوسری زبانوں کے ادب میں ملنی دشوار ہے۔ رمز و کنایہ کی ایمائی قوت اور تشبیہ و استعارہ کی بدولت کلام کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور لطائف و معانی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ سامع پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ مجاز و حقیقت میں جس طرف چاہے اپنی توجہ کے رخ کو پھیر دے۔ میر تقی میر کے اس شعر کو آپ دونوں طرح سے سمجھ سکتے ہیں اور دونوں طریقے پر اس کے معنی میں کوئی سقم نہیں پیدا ہوتا۔ اگرچہ میر صاحب عام طور پر مجازہی سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کا عشق خالص انسانی عشق ہونے کے علاوہ کوئی اور دعویٰ نہیں کرتا۔ شعر ہے۔

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں   کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

یا مثلاً غالب کا یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر حاوی ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو   جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

غزل میں دیدہ و دانستہ محبوب کے جنس کو نہیں ظاہر کرتے اس لئے کہ رمز و ایما کا یہی اقتضا ہے۔ جب کبھی اس کا ذکر آتا ہے تو مذکر صفات و افعال استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ بات غیر فطری ہے۔ لیکن جو شخص روح غزل کا رازداں ہے اس کے نزدیک اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غزل کی رمز نگاری کا یہی اقتضا ہونا چاہیئے تھا

کہ جس طرح حقیقت و مجاز کے فرق و امتیاز کو مبہم چھوڑ دیا گیا کہ ذوق خود اس کا فیصلہ کرے اسی طرح معشوق کے جنس کو بھی ابہام کے نقاب میں لپیٹ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ مشرقی آداب اسے گوارا نہیں کرتے کہ محبوب کی نسوانیت کو بے پردہ کیا جائے اور دوسرے غزل کی ٹیکنک رمز و کنایہ کو تفصیل و تشریح پر مقدم قرار دیتی ہے۔ پھر چونکہ اردو غزل نے اپنی خوشہ چینی فارسی غزل سے کی تھی جس میں محبوب کی جنس کو مذکر ظاہر کیا جاتا تھا اس لئے اردو میں بھی یہی طریقہ مستعمل ہوگیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ایرانی تہذیب و معاشرت سے اتنی مشابہ تھی کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اگرچہ بعض جگہ غزلوں میں محبوب کی نسوانیت ظاہر ہوگئی ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہے۔ جہاں نسوانیت ظاہر کی گئی ہے وہاں بھی ایک خاص سلیقہ پیش نظر رہا ہے۔ نسوانیت کا جہاں اظہار ہوگیا ہے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ میر صاحب کا شعر ہے:۔

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے ۔۔۔ اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

غالب کے شعر ہیں:۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز ۔۔۔ پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس ۔۔۔ سرمہ سے تیز دشنہ و مژگاں کئے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ۔۔۔ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے
چاہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ۔۔۔ زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں ۔۔۔ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

مومن خاں کے شعر ہیں:۔

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشین ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا سایہ سے میرے وحشت اے رشک پری اتنی

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

حسرت کا شعر ہے

پردہ سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے

ایسی مثالوں سے تو دیوان کے دیوان بھرے پڑے ہیں جن میں معشوق کے لیے بذکر صفات و افعال لائے گئے ہیں تاکہ اس کی پردہ دری نہ ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میر تقی میر

یار عجب طرح نگاہ کر گیا دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبائی کا سماں یار کی پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا
بات کہنے میں گالیاں دے ہو سنتے ہو میرے بدزبان کی ادا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا
دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

غالب

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

داغ

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں ۔۔۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

نظام رامپوری

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ ۔۔۔ دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

حسرت

بنے وہ رونقِ محفل جس انجمن میں رہے ۔۔۔ رہے بہارِ چمن ہو کے جس چمن میں رہے

اسی سے چھپتے ہیں ہوتی ہے جس پہ انکی نظر ۔۔۔ اگر یہی ہے تو اُمیدوار ہم بھی ہیں

نگاہِ یار سے اظہارِ التفات ہوا ۔۔۔ تو حالِ دل نے کہا "آشکار ہم بھی ہیں"

ناگوار ہے بہت تلخیٔ ہجران لیکن ۔۔۔ تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی

اربابِ اشتیاق سے پروا نہ چاہیئے ۔۔۔ اے حسنِ خود نما تجھے ایسا نہ چاہیئے

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے ۔۔۔ ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا ۔۔۔ یہ وہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کر دے

لطف یہ ہے کہ بعض خواتین صاحبِ دیوان گذری ہیں۔ وہ بھی اپنے لئے صفات وافعال مذکر استعمال کرتی ہیں اور اس طرح آدابِ غزل کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے۔ صبائی بیگم شاگرد آتش، نواب شاہ جہاں بیگم شیریں والیٔہ ریاست بھوپال اور شمس النسا، بیگم ترنم لکھنوی کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ رمز و ایما کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھانے کے لئے غزل گو شاعر محبوب کے لئے عام طور پر ایسے الفاظ بطور استعارہ

استعمال کرتے ہیں جن سے جنس ظاہر نہ ہو جیسے بت، صنم، نازنیں، شوخ، گلرو، گل، جاناں، دلدار، دلربا، دلبر، ظالم، تغافل شعار، خانہ خراب، تندخو، جفا جو، بے وفا وغیرہ۔ یہ الفاظ بغیر اسم اشارہ کے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان سے مراد محبوب ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بسان کاغذ آتش زدہ میرے گلرو — ترے جلے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں
(درد)

بیاں ہو چکی ہم سے اس گل کی خوبی — سرو برگ رنگیں نگاری کہاں تک
(حسرت)

تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
(درد)

کون دل ہے کہ جس میں خانہ خراب — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
(درد)

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا — میں بے صبر اتنا ہوں وہ تندخو ہے
(درد)

میلان دلربا ہو کیونکر وفا کے اوپر — دیتا ہے جان عالم اسکی جفا کے اوپر
(میر)

برقع سے اٹھا چہرہ وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
(میر)

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اس کی دیوار کا سر سے میرے سایہ نہ گیا
(میر)

ٹک بعد مرے میرے طرفداروں کنے تو — کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلی تو کر آوے
(میر)

آج اس راہ دل ربا گذرا — جی پہ کیا جلتے کہ کیا گذرا (میر)

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
(غالب)

کیوں نہ ہو دلبروں کو شوقِ ستم
اہلِ دل کو ہے بے کسی کی ہوس
(حسرت)

ظالم کہیں روا نہیں عاشق سے احتراز
کہدے اگر ہو شکِ سخن داد خواہ میں
(مومن)

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی
ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی
(مومن)

کھل گیا عشقِ صنم طرزِ سخن سے مومن
اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو
(مومن)

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اس بیوفا کے آنے کی
(مومن)

کسی طرح جو نہ اس بُت نے اعتبار کیا
میری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا
(داغ)

کیا صبا کوچۂ دلدار سے تو آتی ہے
مجھکو اپنے دلِ گم گشتہ کی بُو آتی ہے
(داغ)

اس نازنین نے جب سے کیا ہے وہاں مقام
گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام
(حسرت)

اس جفا جو سے بہ ایمائے تمنا اب تک
ہوسِ لطف و عنایات چلی جاتی ہے
(حسرت)

وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو
کیا اب جواب دوں دلِ نگہ انتظار کو
(جلیل)

ہے تیری جوانی کہ گھٹی پڑتی ہے ظالم
پر کوئی سنبھالے دلِ بے تاب کہاں تک
(جلیل)

غالب نے سخن محبوب کو بلائے جان بتایا اور اس کی گہری شاعرانہ نظر نے اس کو تین اجزا میں تقسیم بھی کر دیا۔ عبارت، اشارت اور ادا۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا[1]

یہی تینوں اجزا تغزل کے اصلی عناصر ہیں۔ غزل محبوب سے اور محبوب کی گفتگو ہے۔ اس کی خوبی اس میں ہے کہ کلام کا مقصد پورا ہو یعنی تاثیر۔ انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا تاثیر پیدا کرنا۔ اول الذکر افادی پہلو رکھتا ہے جو نثر نے اپنے ذمے لے لیا۔ شعر کا اور خاص طور پر غزل کے شعر کا سرمایہ اثر و تاثیر کے خمیر سے بنتا ہے۔ تغزل کی تاثیر کا راز اس میں ہے کہ عبارت، اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبہ کی تصویر کی رنگ آمیزی کی جائے۔ ان رنگوں کی آمیزش کے لئے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ مثلاً اگر غزل کے کسی شعر میں صرف اشارت کی خوبی موجود ہو اور عبارت اور ادا میں بھدا پن پایا جاتا ہو تو شعر ادھورا اور بے اثر رہے گا۔

عہد حاضر کے سب سے بڑے غزل گو شاعر حسرت نے بھی اس باب میں غالب کے خیال کی تائید کی ہے۔ ان کا شعر ہے:

ہر حرف میں اس نامۂ رنگین کے ہیں پنہاں
جدت کے، عبارت کے، اشارت کے لذائذ

فرق صرف اتنا ہے کہ مرزا غالب نے جس شئے کو ادا سے تعبیر کیا تھا اس کو حسرت نے جدت کہا ہے۔ مرزا غالب نے عبارت، اشارت اور ادا کی

---

[1] اگرچہ اس جگہ شاعر نے ادا سے ناز و ادا مراد لیا ہے لیکن ادا حسن اظہار کے لئے وسیع معنوں میں بھی آتا ہے۔ یہ حسن اظہار مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے زبان و بیان کے ضمن میں یہی حسن ادا اسلوب و طرز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

خوبیوں کو محبوب کی گفتگو میں محسوس کیا اور حسرت نے دوست کے نازہ رنگیں میں لیکن حقیقت میں بات دونوں نے ایک ہی کہی ہے۔ ادا میں جب تک جدت نہ ہو وہ ادا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک ہی ادا بار بار دہرائی جائے تو وہ لازمی طور پر بے مزہ اور بے کیف اور بے اثر ہو جائے گی۔ جدت ہی حسن ادا کی ضمانت ہے۔ غرضکہ مرزا غالب اور حسرت نے سخن محبوب کا جو تجزیہ کیا ہے وہ غزل کی خارجی اور معنوی خوبیوں پر حاوی ہے اور اس کے محاسن کا معیار کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ محبوب کی باتوں میں عبارت، اشارت اور حسن ادا کی کارفرمائی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ عشاق کی گفتگو ان شعری عناصر سے خالی رہے۔ غزل محض شاعر کا کلام نہیں بلکہ عاشق کا کلام ہے۔ اس پر وہی اصول عاید ہونے چاہئیں جن کی جھلک غالب اور حسرت جیسی حساس طبائع رکھنے والوں نے محبوب کے کلام میں دیکھ لی۔ بقول شکسپیر شاعر، عاشق اور دیوانہ ہم کیف ہستیاں ہیں جنھیں تخیل نے ایک ہی سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان میں بہت سی باتیں قدر مشترک کے طور پر ملتی ہیں۔ چنانچہ تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ ان کے معیار حسن و قبح میں بہت کچھ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ عاشق کی گفتگو بہت کچھ محبوب کی گفتگو کا انداز اور رنگ ڈھنگ اڑا لیتی ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دل بھی تیرے ہی رنگ سیکھا ہے　　آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

جگر نے اسی مضمون کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔

ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں　　کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

دوسری جگہ کہا ہے۔

عشق کا سحر کامیاب ہوا　　میں ترا تو میرا جواب ہوا

ایک جگہ اس طرح جذب عشق کی تاثیر کو ظاہر کیا ہے۔

تاثیر جذب عشق کا اللہ رے کمال　　آئینہ بن گئے تری اک اک ادا کے ہم (جگر)

عاشق اور معشوق کے انداز فکر اور کلام کی یکسانیت اس لئے ضروری نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ معاملات شوق زبان ونطق سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس تنزل تیں بغیر زبان جانے ہوئے بھی سب مطالب ادا ہو سکتے ہیں۔ حافظؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

یکے است ترکی و تازی دریں معاملہ حافظؔ
حدیث عشق بیاں کن بہ ہر زباں کہ تو دانی

اسی مضمون کو حسرتؔ نے بھی ادا کیا ہے۔

دل خوب سمجھتا ہے ترے حرفِ کرم کو
ہر چند وہ اردو ہے نہ ترکی ہے نہ تازی

حسن وعشق غزل میں زندگی کی تمثیل بن جاتے ہیں اور شاعر ان کے ذریعے سے رموز حیات کو بے نقاب کرتا ہے۔ عشق انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ ایک فطری کشش ہے جو دل میں ذوق اور شورش پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی انسان چاہے وہ کتنا ہی بے حس کیوں نہ ہو اپنی فطرت کی اس اساسی حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اسی کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی ہے اور اس کی منزلیں اتنی ہی وسیع ہیں جتنی کہ کائنات۔ حسن کی قدر افزائی چراغ عشق کی روشنی ہی میں ممکن ہے عشق اور حسن دونوں اپنی اپنی جگہ کائنات مدرکہ کے اہم مظاہر ہیں شاعر ان دونوں کو برابر کا رتبہ دیتا ہے۔ جس طرح بغیر عشق کے حسن کا وجود بے معنی ہے اسی طرح بغیر حسن کے عشق کے مقصود و منتہا کا معین کرنا ممکن نہیں اس مضمون پر حسرتؔ کے متعدد شعر ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

سچ پوچھیے تو حسن سے کچھ کم نہیں ہے عشق یہ جان عاشقاں ہے وہ جانان عاشقاں

اس شعر میں اگرچہ حسن وعشق کا مرتبہ برابر تسلیم کیا گیا ہے لیکن حوالہ کا مرکز عاشق کی ذات ہے نہ کہ محبوب۔ عشق میں ایک طرح کی دروں بینی اور خودی کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ عشق کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ جذبہ کو ہر چیز پر فوقیت دے۔

یہاں تک کہ بعض اوقات خود حسن پر بھی۔ جذبہ ذات الٰہی کی طرح مطلق محض بنا چاہتا ہے'
حسرت حسن کی عظمت تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بیان تمنا اور زبان محبت سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

بیان تمنا زبان محبت ۔۔۔ نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی (حسرت)

عشق چاہے کتنا ہی رام حسن رہے لیکن اس کو اپنے وجود کی اہمیت کا ہمیشہ احساس رہتا ہے:

عشق ہر چند رام حسن رہا ۔۔۔ پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس [1] (حسرت)

پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ عشقِ صادق حسنِ کامل سے نہ ذکر برتری کرے اور نہ سنے۔

عشق صادق نے حسن کامل سے ۔۔۔ نہ سنا ذکر برتری نہ کیا (حسرت)

لیکن کبھی کبھی نیازمندی کے عالم میں عشق حسن کی فوقیت کو عارضی طور پر تسلیم کر لیتا ہے۔ فانی کا شعر ہے:

خو حسن کمال حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے ۔۔۔ اور عشق کمال عشق ہے یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

کبھی کبھی حسرت نے بھی حسن کے رتبہ کو عشق سے بلند کر دیا ہے:

رتبہ ترے حسن فسوں کار کا ۔۔۔ شوق کے رتبے سے بھی مافوق ہے (حسرت)

دوسری جگہ کہا ہے۔

بڑھا تو خوب مگر نار عاشقی کا جلال ۔۔۔ حریف جلوۂ نور جمال ہو نہ سکا

اور چونکہ عشق وجدانی طور پر جانتا ہے کہ سوائے حسن کے اس پر کوئی دوسرا حکمراں نہیں ہو سکتا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنی گردن نیاز اس کے آگے خم کر دیتا ہے۔

سر عجز حسرت بھی خم کیوں نہ ہوتا ۔۔۔ ترا نام ہے حکمران محبت (حسرت)

---

(۱) امیر حسن دہلوی

عشق کا اب مرتبہ پہونچا مقابل حسن کے ۔۔۔ بن گئے بت ہم بھی آخر اس صنم کی یاد میں

نیاز شوق کے موضوع پر حسرت کی زمزمہ سنجی ملاحظہ ہو۔

روشن جمال یار سے دنیائے عشق ہے — گویا شراب حسن یہ مینائے عشق ہے
کیا کیا فراق حسن میں ہے نغمہ ریز غم — جان حزیں کہ بلبل گویائے عشق ہے
اے حسن بے مثال تری دید کے لئے — درکار دیدۂ دل بینائے عشق ہے
تیرا خیال منزل مقصود آرزو — تیرا جمال شاہد رعنائے عشق ہے
مدت کے بعد پھر وہ ہوئے مائل کرم — یہ بھی تو اک طریقہ احیائے عشق ہے
پنہاں حجاب ناز میں ہے صورت جمال — پیدا حروف شوق سے معنائے عشق ہے
حسرت کو پائے بندی ایمان سے کیا غرض — وہ کافر جمال ہے ترسائے عشق ہے

اردو کے تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف رہا۔ اگرچہ بعض شاعروں نے مجاز کی منزل سے آگے بڑھ کر حقیقت کے رموز و اسرار کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔ دراصل عشق مجازی ہی میں انسانی قلب پر وہ وارداتیں گذرتی ہیں جن کا براہ راست اس کو تجربہ ہوتا ہے اور جو اس کے لئے جذباتی اصلیت رکھتی ہیں۔ مجازی حسن چاہے کتنا ناکمل اور زوال پذیر ہو لیکن اس کی گیرائیاں عالمگیر ہیں۔ جمالیاتی تجربہ خود علم کی اعلیٰ ترین صورت ہے جس کی بدولت صداقت اور افادیت کے تضاد کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ اس تجربہ میں تخیل کے خواب سے حقیقت پیدا ہوتی ہے جس کی پرورش جذبہ اپنے آغوش میں کرتا ہے اور اشیاء اور حقائق کے تعلق کا تعین من مانے طور پر کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے غزل گو شاعر کا نقطۂ نظر داخلی ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کو استعاروں اور کنایوں کے جال میں اس طرح چھپا لینا چاہتا ہے کہ اس کا تعلق اس کے تخیلی پیکروں سے ٹوٹنے نہ پائے جو اس کے دل کی دنیا میں براجمان ہیں۔

انفرادیت خود مکتفی ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی خارجی منظر سے چاہے وہ کتنا ہی جمیل و حسین کیوں نہ ہو دل بستگی پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے کہ یہ اس کے ضعف اور بے کمالی پر دلالت ہو گی۔

لیکن فطرت نے انفرادیت کے پہلو میں عشق کی کسک پیدا کر دی تاکہ وہ کافی بالذات ہونے کے احساس کو شکست دے اور اپنے بعض دوسرے مقاصد عالیہ کی تکمیل کرے۔ درد اشتیاق کی کسک نے کافی بالذات خودی کو غیر خود کی کشش سے وابستہ کر دیا جسے فطرت کی زبردست کامیابی تصور کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی اپنی انفرادیت کی تنہائیوں میں گھٹ کر رہ جاتی اور اس کی افسردگی اس کی دائمی ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتی۔ غالب نے اس نکتہ کو بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک طرف تو انانی خودی کی خواہش ہے کہ وہ آزاد رہے اور اپنے آپ کو کسی سے وابستہ نہ کرے اور دوسری جانب فطرت یعنی غیر خود کی دلبستگی اس کو اپنی محبت کے دام میں پھانسنے کی فکر میں ہے۔ غرضکہ انسانی شخصیت کو عجیب و غریب کشمکش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شاعر خدا سے دعا مانگتا ہے کہ تو ہی میرے آزاد منشی کے دعوے کی شرم رکھ لے اس لئے کہ اگر میں اس کی زلف میں گرفتار ہو گیا تو میرا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ شعر ہے

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا　　رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ محبت سے مفر نہیں۔ سرو باوجود اپنی ساری آزادی کے گلشن کے زنداں خانہ میں گرفتار ہے اس لئے اس کا آزادی کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

الفت گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی　　سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے بس اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ انسان کے دل میں درد اشتیاق پیدا کر دیا بلکہ اس کے نفس کو جمالیاتی حس سے آشنا کر دیا اور اس کو یہ صلاحیت دی کہ وہ تخلیق حسن کرے جس طرح وہ آفرینش اخلاق کرتا ہے۔ جمالیاتی حس عقل و ارادہ دونوں سے مختلف ہے لیکن ان دونوں کی طرح اس کا وجود بھی ذہنی ہے۔ جس طرح عقل صداقت،

کی اور ارادہ نیکی کی تخلیق کرتا ہے اسی طرح جمالیاتی حس عالم فطرت اور عالم انسانی میں حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تخلیق حسن خارجی محرکات کی محتاج ہے؟ اس سوال کے جواب میں ارباب فکر میں بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے عشق وحسن کی داستان کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ تخلیق حسن کیلئے کسی نے اپنے اندرونی تجربوں کو کافی خیال کیا اور بعض نے تھوڑا بہت خارجی محرکات کا آسرا لیا۔ ہماری شاعری میں فکر واحساس کے یہ دونوں انداز ملتے ہیں اور دونوں میں جمالیاتی قدروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

چونکہ دروں بینی تغزل کی بنیادی خصوصیات میں ہے اس لئے بعض غزل گو شاعروں میں یہ میلان قدرتی طور پر پیدا ہو گیا کہ تخلیق حسن کو خارجی محرکات سے بے نیاز کر لیا جائے۔ یعنی عشق کیا جائے بغیر محبوب کے۔ دروں بینی نے یہ راہ بتائی کہ خود اپنی ذات کو ہی اپنا معشوق کیوں نہ بناؤ۔ یہ خیال اردو شاعروں کی ایجاد نہیں۔ اہل یونان کے ہاں بھی اس کا پتہ چلتا ہے یونانیوں کے دیومالا میں دریائے سے فیز کے بطن سے ایک فرزند تولد ہوا جو بڑا ہو کر پورے یونان میں سب سے زیادہ خوش رو نوجوان مانا جاتا تھا ایک دن کسی چشمہ کے پانی میں اس نوخیز خوش جمال نے اپنا عکس دیکھا تو دل وجان سے خود اپنی صورت پر فریفتہ ہو گیا۔ اپنے عکس کو دیکھنے میں اس پر ایسی محویت طاری ہوئی کہ چشمہ میں گر کر ڈوب گیا۔ اہل یونان کا عقیدہ تھا کہ اس خوشرو نوجوان کی روح ایک خوبصورت پھول کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اہل یونان نے اس کو نرگس کے نام سے موسوم کیا۔ نرگس کا پھول آنکھ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس وقت سے آج تک وہ کائنات حسن کا تماشائی ہے۔

یونانی نوجوان نرگس کے نام پر یورپ کی مختلف زبانوں کے ادب میں "نرگسیت" (نرسس ازم) کی اصطلاح رائج ہوئی جس کا مطلب یہ

ہے کہ آرٹسٹ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے۔ اس اصول کے حامیوں میں انتہائی دروں بینی اور انفرادیت پائی جاتی ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات کو مصدر خیر و شر تصور کرتے ہیں اسی طرح اس کو خالق حسن بھی خیال کرتے ہیں۔ چونکہ تخلیق حسن کا تعلق اپنی ذات سے ہے اس لئے نہ کسی خارجی محبوب کی حاجت ہے اور نہ جذبۂ عشق کی کارفرمائی کی۔ اس مسلک کے شاعروں اور ادیبوں نے حسن کو مطلق تجریدی شکل میں پیش کیا جو زندگی کی حرارت اور حرکت سے یکسر محروم ہے۔ یہ ایک طرح کا زندگی سے گریز ہے۔ اس قسم کے تصورات کا یہ اثر ہوا کہ احساس جمال کو عشق سے بے تعلق کر دیا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے انفرادیت پرست آرٹسٹوں نے اپنی ذات کو عشق و محبت کا مرکز ٹھہرا کر خارجی حسن سے بے نیازی کا اظہار کیا۔ لیکن ادب اور آرٹ کے یہ دونوں رجحان انتہاپسندی پر مبنی ہیں۔ اس لئے انھیں قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ دراصل جذباتی حقیقت دونوں انتہاؤں کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔

اردو غزل نگاروں میں بعض کے ہاں یہ رجحان ملتا ہے کہ عشق کو حسن سے بے نیاز کر لیا جائے۔ خاص طور پر عہد جدید کے شاعروں میں جگرؔ کے یہاں اس قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ مثلاً اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مایوس ہو کے پلٹیں جب ہر طرف سے نظریں ۔ دل ہی کو بت بنایا دل ہی سے گفتگو کی

کونین کی ان بھول بھلیوں سے نکل جا ۔ اپنی ہی طرف دیکھ ادھر جا نہ اُدھر جا

کہاں کا مئے خانہ کس کا ساقی کچھ اور بڑھنے دے بے خودی کو
یہی بنائے گی جام و ساغر یہی کرے گی شراب پیدا

بے تابیوں نے کام دیا دست ناز کا ۔ آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

دستِ جنونِ عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

فیضِ سوزِ عشق سے اے دل سراپا داغ ہو جو بہار اب مجھ میں ہے سارے گلستاں میں نہیں

نازک مزاج عشق کی اللہ رے خاطریں اپنی نزاکتوں کو مرا دل بنا دیا

ایک گوشے میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم میرا دامن ہے کسی اور کا آغوش نہیں

اِن شعروں میں یونانی دیومالا کے کیرکٹر نرگس کی تقلید کی گئی ہے۔

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

دیکھئے کیا شور اٹھتا ہے حریمِ ناز سے سامنے آئینہ رکھ کر خود کو اک سجدہ کریں

جگر کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بھٹکنا نہ کہیں اے دل! عشق معتبر ہو کر گزر جا ہاں گزر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر

عشق بے اعتماد کے قابل حسن کا اعتبار کون کرے
ہمیں بن جائیں کیوں نہ صورتِ یار دل کو پابندِ یار کون کرے

جس طرح عشق حسن سے بے نیاز ہو کر اپنی علیحدہ ہستی کا تحقق کر لیتا ہے اسی طرح وحشی بہار سے بے نیاز ہو کر صحرا کی طرف نکل جاتے ہیں۔

سوئے صحرا نکل چلے وحشی انتظارِ بہار کون کرے

عشق کیا چیز ہے! اک حشر در آغوشِ خیال حسن کیا؟ خواب ہے اک چشمِ تماشائی کا

اللہ اللہ ری وارفتگیٔ عشق میری اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

صیاد میرے دم سے ہیں سارے یہ چہچہے — جب میں نہیں تو رونق گلزار بھی نہیں

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے — یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو
کہاں کے سرو و صنوبر کہاں کے لالہ و گل — نگاہ ہی میں جو کیفیت بہار نہ ہو

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جگر نے ہمیشہ عشق کو حسن سے بے نیاز کر دیا ہے، وہ عشق کے لئے حسن کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور اس کی وسعتوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس کا شعر ہے۔

وہ بھی نکلی اک شعاع برق حسن — میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا

جگر ہر موقع پر خودی کو غیر خود کے عشق سے بے نیاز نہیں کرتا۔ حسن برق وش کی ادائیں اسے بھی گھائل کرتی ہیں اور بے تابی محبت وجہ سکون غم بنتی ہے۔ اس کی اس غزل کا موضوع یہی ہے۔

سب ان پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں — اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں
اُس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں — کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں
اس حسن برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں — شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں
آلودہ خاک ہی میں رہنے دے اسکو ناصح — دامن اگر جھٹک دوں جلوے کہاں سمائیں
بیتابیٔ محبت وجہ سکون غم ہے — آغوش مضطرب میں خوابیدہ ہیں بلائیں
اشعار بن کے نکلیں جو سینۂ جگر سے — سب حسن یار کی تھیں بیساختہ ادائیں

دوسری غزل ملاحظہ ہو جس میں اپنی خودی کو غیر خود کے جمال سے وابستہ کر دیا ہے۔

ملا کے آنکھ نہ محروم ناز رہنے دے — تجھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے
میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر — یہ چشم مست ابھی نیم باز رہنے دے
یہ تیر ناز ہیں تو شوق سے چلائے جا — خیال خاطر اہل نیاز رہنے دے
ازل سے حسن تو عاشق نواز ہے لیکن — جو عشق ہی اسے عاشق نواز رہنے دے

جگرؔ نے کبھی تو عشق کو حسن سے بے نیاز کر دیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خودی حسنِ برق وش کی اداؤں سے بری طرح گھائل ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اساسی حقیقت عشق ہے یا حسن؟ مرکز جمال خود ان کی ذات ہے یا محبوب؟ اس شعر میں اس کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

سب کچھ ہوا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز　　　تم جانِ آرزو ہو کہ ہم جانِ آرزو

عاشقانہ شاعری کا اعلیٰ ترین مقام عشق الٰہی یا عشق اقدار ہے۔ درمیانی مقام عشق مجازی اور اسفل مقام ہوس پرستی کے جذبات۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی میں فرق و امتیاز ناممکن ہو جاتا ہے۔ جگرؔ نے ایک موقع پر عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پرتو سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ صوفیانہ تغزل میں مجاز کو حقیقت کا پرتو بتاتے ہیں۔ جگرؔ کے اس نقطۂ نظر میں تغزل کی عمیق روح کار فرما ہے۔

صوفی نے جس کو شاہد مطلق سمجھ لیا　　　اک پرتو لطیف تھا حسن مجاز کا

اردو تغزل میں عشق مجازی کے واردات و معاملات کو پیش کرتے ہوئے ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کی مثال شاید فارسی کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں۔ عشق و محبت کا مضمون بظاہر چاہے کتنا فرسودہ سہی لیکن حقیقت میں اس کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ اس جذبہ کی نمایاں خصوصیت اس کی وسعت ہے جسے تغزل کے میٹھے سروں میں ظاہر کیا گیا ہے جو اپنی خود رفتگی اور دردمندی کے سبب سے تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانی خواہشات اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی۔ اگر حدیث شوق بیان کرنے والے کے لب و لہجہ میں اخلاص اور اس کے احساس میں شدت ہے تو دل چوٹ کھائیں گے اور سننے والے متاثر ہوں گے۔ لیکن اگر اس کے پیش نظر محض لفظوں کا الٹ پھیر یا ایسی مضمون آفرینی ہے جو تصنع کے بروں پر پرواز کرتا

چاہتی ہے تو اس کی بات بے اثر رہے گی اور خود کہنے والے کو جھٹلائے گی۔

غزل میں عشق کی واردات کے علاوہ محبوب کے حسن و جمال، ناز و ادا اور جور و جفا کا بیان اس طور پر کیا جاتا ہے کہ سامع کے حافظہ میں بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور وہ شاعر کے تجربوں میں خود بھی شریک ہو سکے۔ لیکن غزل گو شاعر ہر حالت میں ایک قسم کا لحاظ اور پردہ برقرار رکھتا ہے تاکہ اسے جو کچھ کہنا ہے اس میں ابتذال اور رکاکت راہ نہ پا سکے۔ بیان مجاز میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس واسطے کہ اس کے ڈانڈے ہوس پرستی سے آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ غزل کے بڑے بڑے استادوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے۔ میر صاحب کی شاعری تمام تر مجازی عشق کی شاعری ہے۔ انھوں نے انسانی عشق و محبت کے لطیف اور نازک جذبات کی سچی تصویریں کھینچی ہیں جن میں تصنع نام کو نہیں۔ ان کے ہاں معاملہ بندی اور واقعہ گذاری ہے لیکن اس کی سطح بہت بلند ہے۔ ان کی سادگی پر لاکھ تکلف قربان ہیں، ان کا ہر لفظ بلاغت اور سوز و گداز میں رچا ہوا ہوتا ہے، اس لئے نشتر کی طرح دل کے پار ہوتا ہے۔ ان کا سنجیدہ ذوق سخن اور اسلوب بیان بے مثل ہے۔ ان کے عشق و محبت میں مجازی اور انسانی پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔ ان کا کلام سن کر سامع لطف اندوز ہونے کے ساتھ اپنی فطرت میں بلندی اور بالیدگی محسوس کرتا ہے۔ سنیئے وہ کیا فرماتے ہیں۔

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہوگا   تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا   جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو   چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے   جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا
کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا

جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ
ہائے رے چشم دلبراں کی ادا

دل چلے جائے ہے خرام کے ساتھ
دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا

خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے بھی یہ خوب جانتے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

آرزو اس بلند و بالا کی
کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں وہ لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

خدا کرے مرے دل کو ٹک اک قرار آوے — کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آوے
ہمیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے — خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہار آوے
نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میرؔ — کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے

میر صاحب کی غزل گوئی انسانی اور مجازی رنگ لئے ہوئے ہے لیکن کہیں بھی طبیعت کو پستی یا ہوس پرستی کی طرف راغب نہیں کرتی۔ یہ ایک عشق باز کی نازک قلبی واردات کا بیان ہے جو اپنے خلوص اور سوز و گداز کے سبب سے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف جرأت کے تغزل میں جو چلبلا پن اور لطیف سی خارجیت اور ہوس پرستی ہے۔ جرأت کو الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے لیکن وہ بلند جذبات برانگیختہ نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان باتوں کو جو در پردہ کہنے کی تھیں صاف صاف کہہ دیا اور اس طرح اپنے کلام میں ایک عیب کو راہ دی جس سے وہ چاہتا تو بچ سکتا تھا۔ وہ معاملات جو رمز و ایما کی زبان سے بیان کرنے کے ہیں تفصیل کے کس طرح متحمل ہو سکتے ہیں۔ غزل میں معاملات کے اشارے ہونے چاہئیں نہ کہ معاملات کا بیان۔ جرأت کے کلام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں — بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ جی — یوں اور کیا جہاں میں کوئی حسیں نہیں

قشقہ جو وہ کھینچے تو کھنچ جائے ادھر جان — اور چھوڑ دے زلفوں کو تو بس مار ہی ڈالے
بے ہوش سا محفل میں مجھے دیکھ وہ کیا کیا — ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کچھ منہ سے نکالے

تو گیا اور ہم تری صورت کو تکتے رہ گئے — غمزدے روتے تڑپتے سر پٹکتے رہ گئے
عاشقوں کے دل بلاق یار کے موتی کیطرح — بوسہ کی خواہش میں اس لب پر لٹکتے رہ گئے

اس غزل کے اشعار سے ذہن کسی بلند خیال یا نازک احساس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ لیکن اسی غزل میں ایک نہایت بلند شعر بھی ہے جسے سن کر سامع ٹھٹھک جاتا ہے۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی رمزی اور ایمائی قوت موجود ہے۔

کارواں جاتا رہا اب اور ہم گم کردہ راہ — گرد کے مانند صحرا میں بھٹکتے رہ گئے

اس غزل کے مقطع میں لفظوں کا چناؤ اعلیٰ درجے کا ہے لیکن چونکہ شاعر نے رمز و کنایہ کی کوئی طلسمی کیفیت پیدا نہیں کی بلکہ حقیقی خارجی منظر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس واسطے سامع کے ذہن میں لطف کے ساتھ ایک قسم کا مضحکہ خیز تصور راہ پاتا ہے۔ مقطع یہ ہے۔

ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ — اور ہم جرأت پلک اپنی جھپکتے رہ گئے

اور دوسری مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اجل گر اپنی خیال جمال یار میں آئے — تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
اٹھے جہاں سے نہ جرأت اٹھا کے درد فراق — الٰہی موت بھی آئے تو وصل یار میں آئے

پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر جمال یار کے تصور میں موت آئے تو مزار میں بجائے فرشتہ کے پری آئے گی اور دوسرے شعر میں خدا سے تمنا کی ہے کہ موت وصل یار کی حالت میں آئے۔ دونوں تصورات بھونڈے، غیر شاعرانہ اور رکاکت کا پہلو لئے ہوئے ہیں جو ذوق سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔

کرو منع ناصح کو ہم سے نہ بولے — کہاں کا یہ غمخوار پیدا ہوا ہے

کہیے گر کوئی اس سے ملنے کو جرأت — تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
تو کہتا ہے وہ از رہِ طعن "ہاں جی — یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے"

مجھکو ڈر ہے کہ کرے حشر و بپا نہ کہیں — زیرِ پا اس دلِ مضطر کو دبائے رکھیے
بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرتِ شوق — آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھیے

یہاں بھی جرأت کی معاملہ بندی مجاز کی منزل سے نکل کر بوالہوسی کے کوچے میں قدم رکھتے ذرا نہیں جھجکتی۔ لیکن وہ لفظوں کا استعمال خوب جانتا ہے۔ آخری شعر میں بھڑائے کی جگہ "ملائے یا لگائے" لائیے تو شعر بے مزہ ہو جائیگا اگرچہ اس شعر میں رمز و ایما کی کوئی معنوی یا داخلی خوبی موجود نہیں لیکن لفظ "بھڑائے" نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ بعض لفظوں میں اظہار کی ایسی زبردست قوت اور تازگی ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے مطالب کی پستی کا عیب بڑی حد تک چھپ جاتا ہے۔

جرأت سے قبل خواجہ میر درد کے ہاں بھی "بھڑانے" کے لفظ کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا — بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

حسرت نے بھی اس لفظ کو برتا ہے۔

آج تو منہ سب ساغر سے بھڑا دے میرا — ساقیا تجھ کو میری مستیٔ پیماں کی قسم

شعرائے متوسطین میں مومن خاں مومن نے عشقیہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انھیں کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنی غزل کو عشق مجازی کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کی حدوں سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ ان کی مضمون آفرینی انسانی محبت کی وارداتوں اور معاملات تک محدود رہی لیکن ان کی خوش مذاقی نے انھیں کبھی پستی کی طرف نہیں جانے دیا۔ ان کی جذبہ نگاری کا دامن مستی اور مریضانہ جذبہ فروشی کے

داغ سے پاک ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں، حسن کی اداؤں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کنایہ اور استعارہ کے بادشاہ ہیں۔ اردو زبان کے اعلیٰ اور دلنشیں تغزل کی مثالیں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم — کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
مومن ایمان قبول دل سے مجھے — وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں — اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ — اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی
کہا ہے غیر نے تم سے میرا حال — کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی
کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن — کہا "میں کیا کروں مرضی خدا کی"

داغ کی غزلوں کا عام رجحان بھی عشق مجازی کی طرف ہے لیکن اس نے رمز و ایما کی کیفیات کو اکثر برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے جس کے سبب سے اس کا تغزل جرأت کے تغزل کے مقابلے میں زیادہ بلند ہے۔ اس کی شوخی اور البیلے پن میں ایک خاص شان ہے جسے خوبی بیان اور حسن ادا نے اور بھی چمکا دیا۔ اگرچہ اس کے یہاں وہی پرانے فرسودہ مضمون ملتے ہیں جنھیں قدما کے وقت سے اب تک باندھتے چلے آئے ہیں لیکن وہ انہیں

میں نئی جان ڈال دیتا ہے۔ اس کی زبان میں خاص نزاکت، لطافت اور لوچ ہے جو اس کے ہمعصروں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ امیر مینائی نے بہت زور لگایا لیکن وہ بات نہ پیدا کر سکے اور سامع کے لئے اُس دل بستگی کا سامان فراہم نہ کر سکے جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ترے غمزوں کو اپنے کام سے کام
کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے
تم آؤ جب سوار توسنِ ناز
قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ابھی تو کھیل ہیں اے داغ شوخیاں اُن کی
پھر آرزوئیں کرو گے حیا کے آنے کی

مرے سوال کے معنی وہ مجھ سے کہہ دیتے
مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا
تمہارے برق تجلی کو اضطراب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف
ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

منصفی دنیا سے ساری اُٹھ گئی
اے بتو ایمانداری اُٹھ گئی
بے طرح پھیلا ہے ان زلفوں کا جال
اب اُمید رستگاری اُٹھ گئی
دور میں اس چشمِ مست ناز کے
لذت پرہیزگاری اُٹھ گئی
کس سے رکھئے داغ چشم دوستی
اُٹھ گئی یاروں سے یاری اُٹھ گئی

بات میری کبھی سُنی ہی نہیں
جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں
لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
اڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
داغ کیوں تم کو بے وفا کہتا
وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

مندرجہ ذیل غزل کے اکثر شعر موسیقی میں رچے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصویر کشی جاذبِ نظر ہے۔ ایمائی محاکات اور ترنم کی خوبیوں نے داغ کے آرٹ کو اس غزل میں بہت بلند کر دیا ہے۔ خصوصاً دوسرا شعر خوب ہے:۔

حیا نے روک لیا جذبِ دل نے کھینچ لیا چلے وہ تیر کی صورت کھنچے کمان کی طرح
جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ گری ہی جاتی ہے بیمارِ ناتواں کی طرح
ادائے مطلبِ دل ہم سے سیکھ جائے کوئی انھیں سنا ہی دیا حال داستاں کی طرح

ایک اور شعر سن لیجیے۔

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

عہدِ جدید کے شعرا میں عشقِ مجازی کی کیفیات کو حسرت نے جس نزاکت اور لطافت سے بیان کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ رنگینی اور جوشِ بیان کے امتزاج سے وہ خیالات کا ایک طلسم سا باندھ دیتے ہیں جس میں داخلی تجربہ اور خارجیت کی جھلکیاں ایک دوسرے میں سموئی ہوتی ہیں۔ ان کا عشق خالص انسانی عشق ہے۔ وہ میر تقی میر کی طرح مجاز کی منزل سے آگے بڑھنے کے کبھی دعویدار نہیں ہوئے۔ خیالات کی رفعت اور ٹھہراؤ اور جذبات کے خلوص کے باعث انھیں اگر اس زمانے میں غزل کا امام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انھیں بندشوں کی چستی، لفظوں کی نشست، تشبیہوں اور استعاروں کی جدت میں کمال حاصل ہے۔ وہ عشق و محبت کے نازک اور لطیف جذبات اور ان کے اتار چڑھاؤ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ وہ اس وادی کے ذرہ ذرہ سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی رنج و کلفت کا ذکر ملتا ہے جو اس وادی میں قدم رکھنے والے کو پیش آتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ پُرامید رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے غزل گو شاعروں میں کوئی بھی اتنا پُرامید نہیں جتنے کہ وہ ہیں۔ انھیں ہمیشہ اس کا یقین رہتا ہے کہ آخر

میں ان کی سب آرزوئیں پوری ہوں گی۔ ان کے ہاں میرؔ کا سوز و گداز اور داغؔ کی نشاط انگیزی دونوں موجود ہیں۔ اگرچہ ثانی الذکر کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ زندگی کے امکانات سے کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اپنے تغزل کو شعریت کے علاوہ اور کسی دوسرے خارجی محرکات سے آلودہ نہیں کیا۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندگی سے گریز کرتے ہیں۔ اگر انسانی جذبات زندگی کا جز ہیں تو ہم یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ حسرتؔ زندگی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور ایسے رنگوں میں پیش کرتے ہیں جن کی آب و تاب آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی میں جو دل بستگی اور بے ساختہ پن ہے وہ دور جدید کے کسی غزل گو کے ہاں موجود نہیں۔

حسرتؔ کے ہاں صنفِ غزل اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں غالبؔ اور مومنؔ کی نازک خیالی نے نیا روپ اختیار کیا ہے۔ آئیے ذرا ان کے کلام کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ عشق و محبت کی داستان کو انھوں نے کس طرح سے بیان کیا ہے۔ حسرتؔ کے یہاں انسانی زندگی محبت سے عبارت ہے۔ اگر یہ نہیں تو زندگی بے رنگ اور بے کیف ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں عشق کے مختلف مدارج کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ اور اپنے تخیل کی مدد سے جنسی جذبہ میں تغزل کی کمال بینی پیدا کر دی ہے۔ اس کمال بینی میں جنسی جذبہ کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے اور تزکیہ بھی۔ وہ جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ خالص انسانی چیز ہے۔ اس کی شدت اور حرکت کے ہر راز سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ شروع شروع میں اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ دل چاہتا کیا ہے؟ فطرت کی شدت اپنے کسی منشا کی تکمیل کے لئے پراسرار طریقے اختیار کرتی ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پردۂ راز سے کوئی پکار رہا ہے۔

جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

وادیٔ عشق کا مسافر جذبۂ شوق کی آواز پر کشاں کشاں چلا جاتا ہے اور اُسے

کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ چلتے چلتے تھک کر چور چور ہو جاتا ہے اور قریب ہے کہ گر پڑے لیکن قوت عشق اس کو سنبھال لیتی ہے۔

قوت عشق بھی کیا شئے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں میں سنبھالا ہے مجھے

آغاز محبت کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

دل کو تیری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے
اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے

اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت
آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے

جب لے کے گئی ہے ہمیں تا کوئے ملامت
مجبوری دل خاک بسر لے کے گئی ہے

پہلے ہی سے مایوس ہیں کیوں ہم کہ دعا کو
قسمت مری محروم اثر لے کے گئی ہے

لیکن واضح رہے کہ حسرت اپنی داستان محبت کو مایوسی کے لے پر ختم نہیں کرتے وہ بڑے پر امید واقع ہوئے ہیں۔ باوجود ناکامیوں اور نامرادیوں کے امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ محبت کے ابتدائی تجربوں میں مایوسی ہوتی ہے۔ اس سے وہ بے خبر نہیں۔ کبھی مایوسی اور محرومی میں عاشق محبت سے دستبردار ہو جانا چاہتا ہے اور محبوب کو جتا دیتا ہے کہ دشمن وفا ہو کر دل کی خریداری ممکن نہیں۔ یہ جنس گرامی بے وفاؤں کے لئے نہیں۔

وفا سے دشمنی رکھ کر میرے دل کی طلبگاری
بہت مشکل ہے اس جنس گرامی کی خریداری

لیکن بالآخر حسن و عشق کی کشمکش میں حسن کو کامیابی ہوتی ہے اور وہ جنس گرامی جس پر عاشق کو بڑا ناز تھا خرید لی جاتی ہے۔ ایک دفعہ پھنسے تو ہمیشہ کے لیے پھنسے۔ اب اس جال سے رستگاری ممکن نہیں۔ ہجوم غم میں دل عشق کی نیرنگیوں کا جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ اسی عالم میں عاشق اس طرح گنگنانے لگتا ہے۔

ہوئیں ناکامیاں بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغاز محبت میں
نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری

نہیں غم جیب و داماں کا مگر ہاں فکر ہے اتنی
نہ الجھے گا مرے دست جنوں سے پیچ کاکل کا

نہ ان کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ممکن ہے — کہیں آسان ہو یا رب محبت کی یہ دشواری
دفور اشک پیہم سے ہجوم شوق بے حد میں — مری آنکھوں سے ہے اک آبشار آرزو جاری
غضب ہے بجلیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی — ہوئی ہے جن سے دامان محبت پر یہ گلکاری
نہیں کھلتی مری نسبت تری اے حیلہ جو مرضی — کہ ہے اقرار دل جوئی نہ انکار ستم گاری
نہ کرنا تھا ستم ہم درد مندوں پر کہ دنیا سے — مبادا ایک قلم اٹھ جائے تہذیب وفاداری
نہ دیکھے اور دل عشاق پر پھر بھی نظر رکھے — قیامت ہے نگاہ یار کا حسن خبرداری
یہی عالم رہا گر اس کے حسن سحر پرور کا — تو باقی رہ چکی دنیا میں راہ و رسم ہشیاری
وہ جرم آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں — مجھے خود خواہش تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری
نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت — جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

ہجر کی کلفتوں میں مشتاق دید اپنے آپ کو طرح طرح سے دھوکے میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محبوب کا حجاب اس کی حیرت سے ہم کلام ہے۔

تھا حجاب ان کا میری حیرت سے سرگرم کلام — تھی بظاہر خامشی در پردہ خاموشی نہ تھی

تمنا سو پردوں میں لطف و عنایت کی خواہشیں پیدا کر لیتی ہے۔ وہ دھوکے کھاتی ہے اور آئندہ اور دھوکے کھانے کے عذر تلاش کرتی رہتی ہے۔ اگر یہ فریب نظر نہ ہوں تو زندگی بڑی بے کیف اور بے رنگ ہو جائے۔ تمنا کی خواہش لطف و مراعات ملاحظہ فرمائیے۔

روش حسن مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
اس جفا جو سے بہ ایمائے تمنا اب تک — ہوس لطف و عنایات چلی جاتی ہے

یہ جانتے ہوئے کہ کرم یار ہم رنگ جفا ہوگا پھر بھی دل اسی کا متمنی رہتا ہے:

پھر اسی لطف ستم کوش کا مشتاق ہے دل — ہم نے جس لطف کو ہم رنگ جفا دیکھا تھا

ہجر و محرومی کی راتوں کو کاٹنے کے لئے، لطف ستم کوش کا متمنی کبھی یہ ترانۂ محبت گاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

ترے کُشتے اے جانِ جانِ محبت | حقیقت میں ہیں کاروانِ محبت
کرم بھی ترا یادگارِ وفا تھا | ترا جور بھی ہے نشانِ محبت
جنانِ آفریں تھی بہارِ تمنا | بہار آفریں ہے خزانِ محبت
جو سرگشتۂ یاس و حیرانِ غم ہو | وہی عقل ہے کامرانِ محبت
زہے قبلۂ دین و ایمانِ حسرت | خوشا رتبۂ آستانِ محبت

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روئے دلارا کے تصور سے عاشق کے خیال میں رنگ و بوئے یار پیدا ہو جاتی ہے جسے اس کی درون بینی کی کرامات کہنا چاہیئے۔

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے | یہ رنگیں ماجرا اے عشقِ شیریں کار پیدا ہے

عاشق جور و جفا سہتا ہے اور دل میں اس کی تاویلیں کرتا جاتا ہے تاکہ معشوق پر حرف نہ آئے۔

اس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے بنتا | سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ محبوب بھولا بھالا ہے ممکن ہے وہ اپنی ستم رانیوں کی توجیہ نہ کر سکے اور شش و پنج میں پڑ جائے اس لئے معاملات کو اس طرح سمجھ اور سمجھا دو کہ اس کو پشیمان نہ ہونا پڑے۔

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں | کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

کبھی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ تغافل انھیں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کے ساتھ خصوصیت ہوتی ہے۔

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ امتیاز ان کا | باندازِ جفا ہے التفاتِ دلنواز ان کا

کبھی عاشق کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اس کی وفا شعاری کا اس کو کوئی صلہ نہیں ملا اس واسطے کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو فراموش کر کے بے نیازِ مدعا ہو جائیے۔

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے | اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے
دل سے یہ دردِ نگارِ عاشقی دیجئے نکال | آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر　　مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے
ایک بھی ارمان نہ رہ جائے دلِ مایوس میں　　یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد　　اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

لیکن ان عزائم میں کامیابی نہیں ہوتی۔

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر　　اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

یہ کہکر دل کا حوصلہ بڑھایا جاتا ہے کہ جب اس میدان میں قدم رکھا ہے تو اب واپس جانا کیسا؟

کوئی عشقبازی کا مشغلہ نہیں کھیل اے دلِ مبتلا　　مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اٹھا

عاشق محسوس کرتا ہے کہ دردِ اشتیاق کی کسک میں ایک خاص قسم کی لذت ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی خواہش اور تمنا یہی رہتی ہے کہ کوئی پیرِ مغان عاشقی سیرابِ غم کردے تاکہ تشنگانِ عاشقی کی پیاس نہ بجھے۔ عاشقانِ عاشقی کا احوال اس غزل میں نہایت پُرتاثیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں تغزل اور شعریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو محبوب سے بھی زیادہ خود عاشقی سے محبت ہے۔ وہ محبت کرتا ہے محبت کی خاطر نہ کہ محبوب کی خاطر۔ محبت کا یہ اخلاص خود محبت کے مرتبہ کو بلند کردیتا اور اس کی شدت کو بڑھا دیتا ہے۔ عاشقانِ عاشقی کی زبان سے حسرت سوزِ نہاں کی کیفیات اس طرح بیان کرتے ہیں:-

حسرت کشانِ درد ہیں ہم تشنگانِ عاشقی　　سیرابِ غم کردے کہیں پیرِ مغانِ عاشقی
مطلوبِ آہِ سرد ہیں محبوبِ رنگِ زرد ہیں　　معشوقِ اہلِ درد ہیں ہم عاشقانِ عاشقی
ہیں واقفِ انجام ہم کیوں دیں انھیں الزام ہم　　جبتک رہیں ناکام ہم ہیں کامرانِ عاشقی
راحت سے دل گھبرائیگا رہ رہ کے غم یاد آئیگا　　کیونکر بھلایا جائیگا عیشِ زمانِ عاشقی
منظور دلداری رہا لطفِ نہانِ دلبران　　مقصود رسوائی رہی شانِ عیانِ عاشقی
وہ ہم کہاں وہ دل کہاں البتہ اتنا ہے کہاں　　باقی ہے اک سوزِ نہاں اب تک نشانِ عاشقی

باوجود امید پرست ہونے کے حسرت کا عقیدہ ہے کہ عشق کی روحِ پاک تحفۂ غم کے بغیر شاد نہیں ہو سکتی۔

عشق کی روحِ پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر — اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر
جان کو محوِ غم بنا دل کو وفا نہاد کر — بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر

حسرت باوجود وادیٔ عشق کی مایوسیوں اور محرومیوں کے اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ستمِ یار تمہیدِ کرم بن جائے گا۔

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے — محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے
بھلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری — تری تمکین بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
جفائے یار کا شکوہ نہ کر لے رنجِ ناکامی — امید و یاس دونوں ہوں بہم ایسا بھی ہوتا ہے
تری دلداریوں سے صورتِ بیگانگی نکلی — خوشی ایسی بھی ہوتی ہے الم ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی عاشق محض یادِ یار سے فراق کی گھڑیوں کو گوارا بناتا ہے۔ عشق کی ایذا میں دل کو راحت ملتی ہے۔ کرمِ یار کی جھلکیاں اب عالمِ خیال میں نظر آنے لگتی ہیں۔

از بسکہ یادِ یار مسیحائے عشق ہے — راحت فزائے دل ہے جو ایذائے عشق ہے
تیرا خیال منزلِ مقصودِ آرزو — تیرا جمال شاہدِ رعنائے عشق ہے
حسرت کہاں وہ شاہ کہاں تو گدائے حسن — زنہار اگر تجھے سر و سودائے عشق ہے
مدت کے بعد پھر وہ ہوئے مائلِ کرم — یہ بھی تو ایک طریقۂ احیائے عشق ہے

حسنِ جاناں سے عشق کا خطاب تو ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ خطاب کرنے والے کے تیور بتاتے ہیں کہ اس کو اپنی عظمت کا احساس ہے۔

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے ترا شہرۂ عشق — دور پہونچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا
بے خرد ہو کے محبت کی بدولت اے عقل — نام بھی اب نہیں لیتا دلِ فرزانہ ترا
فکرِ کونین سے بیگانہ ہوا تو حسرت — خوب ٹھہرا غمِ جانانہ سے یارانہ ترا

محبت کی مختلف آزمائشوں میں سے گذر کر شوق محفلِ حسن میں بار پاتا ہے۔ وہاں پہونچ کر دل اٹھنے کا نام نہیں لیتا لیکن مجبوراً اٹھنا ہی پڑتا ہے۔

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

بالآخر جذبۂ شوق کی رہبری میں وادیٔ عشق کا مسافر شہرِ وصال پہونچ جاتا ہے

کچھ بھی شہرِ وصال دور نہیں
جذبۂ شوق ہو جو راہ نما

منزل پر پہونچکر مسافر کو جو خوشی ہوتی ہے عاشق کو وہی مسرت اپنی کامرانی پر ہوتی ہے جسے شاعرانہ زبان میں وصل کہتے ہیں۔

اب حسرت کا ترانۂ وصل سنیے:

لِلّٰہ الحمد کہ تاریکیٔ فرقت ہوئی دور
مژدۂ وصل بصد جلوۂ انوار آیا

چمنِ جاں میں نسیمِ ہوس انگیز چلی
کشتِ امید پر ابرِ طرب آثار آیا

بادۂ عشق سے پیمانۂ تمنا رنگیں
ساغرِ شوق مئے ذوق سے گلنار آیا

بند کر دے گا لبِ یار کو بوسوں کا ہجوم
آج بھی ہم سے جو وہ برسرِ پیکار آیا

مندرجۂ ذیل اشعار میں شاعر نے اپنے مطالب کو صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ سامع کے ذہن میں اس کی مقصد برآری کی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ لب و لہجہ میں ضبط و اعتدال ہے۔ کہیں ابتذال اور عریانی کا شائبہ نہیں جو ذوق پر گراں گذرے بلکہ بیان کی تازگی اور صفائی کے ساتھ مرکزی کیفیت برقرار رہتی ہے جس پر تغزل کا انحصار ہے۔

چاندنی راتوں میں چھوٹے کٹے زیور کیا خوب
رنگ لائے گا تیرا پیرہن معطر کیا خوب

روشنی بخش تمنا ہے جو اک ماہِ منیر
وصل کی رات کا جھمکا ہے مقدر کیا خوب

دیکھتے ہی انھیں پہچان لیا جان لیا
ہم سے وہ چھپتے پھرتے تھے سرِ چادر کیا خوب

قابلِ دید تھی گرمی میں پسینے کی بہار
رنگ لایا ہے عرقِ حسن سے بستر کیا خوب

بن گئی ہے بدلِ گردشِ گردوں ساقی
آج محفل میں تری گردشِ ساغر کیا خوب

داستانِ عاشقی کا آخری منظر ملاحظہ ہو جس میں حسن شرابی کی ادائیں اور شوق بے محابا کی گستاخ دستیاں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہیں

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی
اے یار تیرا حسن شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکس مے ہے شیشہ گلابی

عشرت کی شب کا وہ دور آخر
نور سحر کی وہ لاجوابی

پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت ان کی وہ نیم خوابی

بزم طرب ہی وہ بزم کیوں ہو
ہم غمزدوں کو واں باریابی

اس نازنیں نے باوصف عصمت
کی وصل شب وہ بے حجابی

شوق اپنی بھولا گستاخ دستی
دل ساری شوخی حاضر جوابی

وہ روئے زیبا ہے جان خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی

خیال تھا کہ مقصد برآری کے بعد عاشق اطمینان کی نیند سوئے گا۔ لیکن یہ سارا ماجرا فریب نظر ثابت ہوا۔

وصل میں بھی نہ ہوئی وجہ سکوں کثرت شوق
ڈھونڈ لیتا ہے بہانے دل مضطر کیا خوب

پھر عاشق کو یہ ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ وصل زوال شوق کا سبب نہ بن جائے۔ غرض دل کو چین نہ ہجر و محرومی میں ہے اور نہ مقصد باری میں۔ اضطراب اور بے تابی زندگی کے ساتھ ہیں۔ جب تک جان ہے اس وقت تک ان سے چھٹکارا نہیں۔ یہی غم آرزو محبت کے نت نئے جادو جگاتا ہے۔

دل طالب وصال ہے بے شک مگر کہیں
حسرت یہی عروج نہ ڈھونڈے زوال شوق

غالب نے بھی وصل میں زوال شوق کے خیال کو اپنے خاص انداز میں ادا کیا ہے اور استعارہ بالکنایہ سے رمزی کیفیت کا ایک سماں باندھ دیا ہے

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

مطلب یہ ہے کہ اگر تیرے دل میں شبہ ہے کہ وصل کے بعد شوق میں ضعف پیدا ہو جائے گا تو اپنے دل سے اس شبہ کو نکال دے۔ موج کو دیکھ کہ باوجود بحر سے ہم آغوش ہونے کے اس کی بے تابی اور اضطراب میں کوئی

کمی نہیں پیدا ہوتی ۔

ایک اور جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وصل کے بعد حریص دل کا شوق اور زیادہ ہوجاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ساغر کا جیب شراب سے وصل ہوجاتا ہے تو اس میں جھاگ اوپر آنے لگے ہیں جو اس کی تشنہ لبی پر دلالت کرتے ہیں ۔

ہوا وصال سے شوق دل حریص زیادہ
لب قدح پہ کف بادہ جوش تشنہ لبی ہے (نسخۂ حمیدیہ)

ایک اور جگہ وصال کے مضمون میں غالب نے عجیب ندرت پیدا کی ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ عاشق پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جبکہ وصال داخلی تجربہ اور ذہنی لطف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کیفیت میں اس الجھن کی آمیزش ضرور ہوتی ہے کہ اگر وصال میسر نہ ہوا تو کہاں جائیں گے اور اگر ہوگا تو کیونکر ہوگا ۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال — کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

اس کے برخلاف داغ کے یہاں وصل کے تصور میں خارجیت کا پہلو نمایاں ہے ۔ وہ کہتا ہے :-

"شب وصال قیامت تھی جب کسی نے کہا — وہ دیکھ صبح نمودار ہوتی آتی ہے"

عشق اور موت شاعری کے دائمی موضوع ہیں ۔ عاشقانہ شاعری کو آپ درد و الم کے خیالات سے الگ نہیں رکھ سکتے ۔ عشق کا خاصہ جذب غم ہے[1] جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے لئے غم سہے جاتے ہیں کہ بغیر اس

---

[1] بقول حافظ شیرازی :

دوام عیش و تنعم نہ شیوۂ عشق است — اگر معاشر مائی بنوش جام غمے

اسی خیال کو نظیری نے یوں ادا کیا ہے

گریز دار صف ماہر کہ مرد غوغا نیست — کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

کے اخلاص مشتبہ رہے گا۔ عشق بغیر غم کے عنصر کے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا بغیر ادراکِ غم خود انسانی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔ غم کی دھیمی آنچ میں سلگنے سے شخصیت کے جوہر نکھرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں غم کے عناصر ایسے پیوست ہیں کہ انھیں اس سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ خوشی اور مسرت کے گریز پا لمحوں کی یادیں جلد فراموش ہو جاتی ہیں۔ لیکن غم کی یاد کبھی دل سے نہیں جاتی۔ اس کے نقوش ایسے گہرے ہوتے ہیں کہ زمانے کے ہاتھ سے بڑی مشکل سے بھرتے ہیں۔ غزل میں جذبۂ غم وہی حیثیت رکھتا ہے جو مغربی ادب میں ٹریجڈی (المیہ) کو حاصل ہے۔ ہر زبان کے ادب میں المیہ ہی کا مرتبہ آپ بلند پائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم زندگی کی ایک اساسی شئے ہے۔ زندگی کی یہ کوشش کہ اپنی تکمیل اور تحقق کی راہ پر گامزن ہو اپنے جلو میں غم کی پرچھائیاں چھوڑ جاتی ہے۔ انسان کا یہ احساس کہ زندگی کی ابھی تکمیل باقی ہے۔ بجائے غم آگین ہے۔ پھر ہر قسم کی سعی و جہد جو اس راہ میں کی جاتی ہے الم انگیز ہوتی ہے۔ زندگی کچھ عجیب سی چیز ہے۔ جتنا اس معمہ کو بوجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا ہی وہ الجھتا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ الجھاؤ کبھی سلجھنے والا نہیں اس واسطے کہ زندگی کا منشا ہی یہ ہے کہ یہ کبھی نہ سلجھے۔ اگر سلجھ جائے تو زندگی اپنی قوت محرکہ سے محروم ہو جائے گی جو منشا کے قدرت کے خلاف ہے۔

انسان کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ غم سے بیزار ہو کر مسرت کی منزل کی طرف رواں دواں جاتا ہے۔ جب وہاں پہنچ جاتا ہے تو کچھ کمی اور تشنگی محسوس ہوتی ہے اور کچھ دنوں میں وہی مسرت جس کا وہ دل و جان سے خواہاں تھا اجیرن ہو جاتی ہے۔ ایک قسم کی بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے اسباب اکثر اوقات نامعلوم ہوتے ہیں۔ تمنائی منزلوں کے خواب دکھانے لگتی ہے۔ حاصل شدہ مسرت ایک زنداں بن جاتی ہے

جس سے رہائی کے لئے دل بے تاب ہوتا ہے۔ دستِ جنوں اس زندان کی زنجیر کھڑکاتا ہے اور از سرِ نو تمنا کی وادیوں میں دشت نوردی شروع ہو جاتی ہے۔

رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا میرا کھجلائے ہے (ذوق)

سوزِ آرزو کی نیرنگیاں نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بقول میر اثر:-

کلیجا یک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے
ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیالِ خام رہتا ہے

قدمائیں میر تقی میر نے اپنے کلام میں درد و الم اور ناکامی اور مایوسی کی جھلکیاں دکھائیں اور اس سلیقہ سے دکھائیں کہ ان کی نظیر آج تک نہ پیدا ہوئی۔ میر کے سوز و گداز میں انفرادی رنگ ہے جس کی تاثیر بے پناہ ہے۔ وہ دلِ پرخوں کے ایک جام سے عمر بھر مدہوش رہے۔ ان کی مدہوشی غمِ زیست کی مدہوشی ہے

دلِ پرخوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے

ان کے نزدیک چمنِ حیات کا ہر گل لہو سے بھرا ہوا ساغر ہے۔

یہ عیش گاہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

میر صاحب کا کلام غمِ عشق کے سوز و گداز میں رچا ہوا ہے اسی لئے اس میں بے پناہ تاثیر ہے۔ انھوں نے جس غم کا ذکر کیا ہے وہ زندگی کی اساسی حقیقت ہے۔ اس کے بغیر انسانی سیرت نہیں بن سکتی اور اس کی پوشیدہ قوتیں اور صلاحیتیں نہیں ابھر سکتیں۔ عشق کی آگ میں جب جذبات تپائے جاتے ہیں تو ان میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ میر صاحب کا عشق بھی خالص انسانی عشق ہے۔ وہ مجاز سے بہت کم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی ان کے کلام کی بڑی خوبی ہے۔ چونکہ ان کے جذبات اصلی ہیں اس لئے وارداتِ عشق کی مصوری میں فطری سوز اور درد پیدا ہو گیا ہے۔ انسانی عشق و محبت کی کسک نے انھیں صاحبِ نظر بنا دیا اور ان کی ہر بات میں گہرائی پیدا کر دی۔ ان کے

کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

کروں جو آہ زمین و زمان جل جائے — سپہر نیلی کا یہ سائبان جل جائے

نہ بول میر سے مظلوم عشق ہے وہ غریب — اگر وہ آہ کرے سب جہان جل جائے

کب تیار عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ — آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — غم کے جانے کا نہایت غم رہا

قائل ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے — دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں — ایک خانہ خراب ہیں دونوں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک — پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی — دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے — دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے

صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا — آج کو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے

دل جاوے ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے
اب ہم تو چلے یاں سے تو رہ جو رہا چاہے
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

آج کل بیقرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

عہد جدید کے شعرا میں فانی نے غم کے مضمون کو ایسا اپنایا کہ گویا وہ اسی کا ہو گیا۔ میر کے غم اور فانی کے غم میں فرق ہے۔ میر کا غم محض ایک انفرادی تجربے کا بیان ہے۔ برخلاف اس کے فانی کے ہاں غم ایک جمالیاتی قدر کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کا سارا نظام تصورات غم کے محور پر قائم ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے جس پر کائنات کے حقائق کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ رنج و الم سے حواس و ادراک میں ایسی تیزی اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی مدد سے انسان کو زندگی کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے جس کی تہ تک مسرت نہیں پہونچ سکتی۔ میر نے غم کے جن خیالات کو انتہائی سادگی سے بیان کیا انھیں فانی فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ فانی نے غم کی پرورش کی تاکہ اس سے لطف اندوز ہوں۔ انھیں غم میں ایک طرح کی لذت محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ لذت الم اور عیش غم کے جویا رہے۔ ان کی یاس غیر مخلوط یاس ہے جس میں کسی قسم کی امید اور کامیابی کی آمیزش نہیں۔ انھیں ہر تبسم پردہ دار غم نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں غم کا تصور اور غم کا احساس دونوں خالص رنگ میں ہیں۔

ہر تبسم پردہ دار غم نظر آیا مجھے
گل خنداں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

اس میں شبہ نہیں کہ غم' زندگی کی ایک ضرورت ہے - اگر آرٹ کے ذریعہ حیات اجتماعی میں اس کی قدر حد سے زیادہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ جماعت کی عملی صلاحیتوں پر اس کا برا اثر پڑے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر کسی جماعت کے افراد احساس غم سے بے اعتنائی برتتے ہیں جیسا کہ جدید مادی تمدن میں نظر آتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری جماعت کا تحت شعوری احساس متاثر ہوگا اور وہ بے رحمی کے ایسے وسائل دریافت کرے گی جو دوسروں کو بھی مبتلائے غم کریں اور خود اس کو بھی۔ مثلاً جنگ کے ذریعے غم کی ضرورت کی تکمیل کی جائے گی - جرمنی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب دل غم کی لطیف کسک سے آشنا نہیں ہوتا تو وہ بے رحمی پر اتر آتا ہے اور دوسروں کو مبتلائے غم کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ اس لیے آرٹ میں غم کے عنصر حیات کو اس طرح سے پیش کرنا چاہیئے کہ جذبات کی تہذیب ہو سکے۔ فانی نے غم کے ذریعہ تہذیب جذبات کا کام لیا ہے جو یقیناً ایک کارنامہ ہے۔

فانی نے غم کو نیا مزاج دیا اور اسے نئے آداب سکھلائے - اس نے حیات کو غم سے ہم آہنگ کر دیا۔ غم کی ہر ادا میں اس کو نئی کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ امیر اور داغ کی شوخ نگاریوں کے بعد فانی کا ترانۂ غم تکملہ کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن بعض جگہ انھوں نے احساس غم میں اتنا غلو برتا کہ ان کے کلام کی شعریت مجروح ہو گئی۔ زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی' آہ و نالہ بھی ہے اور تبسم اور قہقہے بھی۔ ناکامیاں بھی ہیں اور کامرانیاں بھی۔

ع زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

فانی نے موت میں جو غم کا منتہا ہے بکمال بینی کی تصویر دیکھی اور اس تصویر کے بنانے سنوارنے میں انھوں نے ایسے تیز رنگ استعمال کئے کہ بعض دفعہ ذوق شعری پر گراں گذرتے ہیں۔ جب کوئی مضمون رمز و ایما کی حد سے

باہر نکل جائے اور سامع کو یہ خیال ہونے لگے کہ شاعر جو کہہ رہا ہے اس سے یادوں کو تازہ کرنا مقصود نہیں بلکہ بعض تصورات کے متعلق سطلع کرنا تو وہ بالکل دوسرے نقطۂ نظر سے شعر کو جانچتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موت ایک زبردست محرک شعری ہے لیکن اگر کفن اور جنازہ سے واقعی کفن اور جنازہ مراد ہو تو اس اندازِ بیان سے لازم ہے کہ ایک قسم کی کراہت پیدا ہونے لگے مثلاً ان شعروں کی شعریت میں مجھے کلام ہے۔ چاہے یہ شعر ہوں لیکن غزل کے شعر نہیں ہو سکتے اور نہیں ہونے چاہئیں اس لئے کہ انھیں سن کر ذہن رمز کے بجائے امرِ واقعہ کی طرف رجوع ہوتا ہے جو دل آویز نہیں۔

لئے جاتے ہیں جنازہ کسے دیوانے کا
ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانیؔ دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعش فانیؔ دیکھتے جاؤ

وہ ادھر رخ ادھر ہے میت کا
لوگ فانیؔ کو قبلہ رو تو کریں

داغؔ اگرچہ عام طور پر خوش باشی اور لذت پرستی کا علمبردار ہے لیکن تبرکاً کہیں کہیں غم کا مضمون بھی باندھ جاتا ہے۔ ایک جگہ موت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ عبرت کی بجائے کراہت ہوتی ہے۔ اس کا شعر ہے۔

میت پہ میری آکے دل ان کا دہل گیا
تعظیم کو جو لاش میری اُٹھ کھڑی ہوئی

چاہے کسی کے احترام کے لئے ہی کیوں نہ ہو لیکن لاش کا کھڑا ہو جانا ایسا مضمون نہیں جسے غزل میں برتا جا سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ شاعر رمز و ایما کی کوئی کیفیت نہیں پیدا کر سکا۔ سامع کو اس قسم کا شعر سن کر معاً یہ خیال ہوتا ہے کہ

وہ اپنے سامنے کسی لاش کو اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے جو یقیناً ایک گریہ منظر ہے۔ اسی مضمون کا ماہر لکھنوی کا بھی شعر ہے:۔

ماہر یہ کس ادا سے وہ شانہ ہلا گئے　　یوں دل ہلا کہ قبر میں لاشہ ہلا گیا

فانی کے شعر میں جو کفن سرکانے کا مضمون ہے وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ لیکن ویسے فانی کے ہاں غم کے متعلق بے نظیر اشعار ملتے ہیں جو تغزل میں اچھی طرح کھپتے ہیں۔ انھیں سن کر سامع کے ذہن میں غم کا وہ تصور آتا ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ انسان اپنے مقدر سے کبھی جنگ آزما ہو۔ یہ غم زندگی کا تخلیقی عنصر اور اس میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان اشعار پر ہمارا ادب جتنا ناز کرے کم ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

تو نے کرم کیا تو بہ عنوان رنج زیست　　غم بھی مجھے دیا تو غم جاوداں نہ تھا
آزردہ تھا کہ ضبط فغاں میں اثر نہیں　　شرمندہ ہوں کہ ضبط فغاں رائیگاں نہ تھا

مرے شکوے سپاس غم کی لے میں دل سے اٹھے تھے　　فغاں کو میں نے آہنگ طرب کا ہم نوا پایا

دل ہمیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر　　عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر
نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں　　سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر
بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں　　درد پر خدا کی مار دل میں ہو گیا رہ کر

غم خانۂ دل کا کیا کہنا وہ کچھ بھی سہی یہ بات کہاں
خلوت میں یہاں جو جلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں
سنتے تھے محبت آساں ہے واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے مشکل سی مشکل میں نہیں

گو راحت و رنج میں فرق نہیں یہ فرق مراتب کیا کم ہے
جو سعی حصول عیش میں ہے وہ عیش غم حاصل میں نہیں
جینے کی حدیں ملتی ہیں کہیں ایمائے اجل ہے آگے بڑھ
منزل کا نشاں ہے ہر منزل آرام کسی منزل میں نہیں
ہم بھی ہوں خیالِ یار بھی ہو اس فکر محال سے کیا حاصل
بس اب فانی ہم ہی نہیں یا کوئی ہمارے دل میں نہیں

فانی کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی　　لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی

آگئی ہے تیرے بیمار کے منہ پر رونق　　جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا　　ڈرتا ہوں کہ زخم دل نہ بھر جائے

زبانِ حال ٹھہر داستانِ عشق نہ چھیڑ　　کہ خواب مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی

غم کے بھڑکتے شعلوں سے جب جل کے کلیجہ خاک ہوا
داغ وجود حسرت سے تب دل کا دامن پاک ہوا
میرے سوا تھے اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا اب کوئی دم میں چاک ہوا

یہ غزل فانی کی ہمیشہ زندہ رہنے والی غزلوں میں سے ہے :-
شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

اس شعر کی بلاغت اور طلسمی رمزیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقاش نے اپنے مو قلم کی خفیف سی کشش سے جہانِ معنی پیدا کر دیا ہے۔ کچھ باتیں کہی گئی ہیں اور کچھ دیدہ و دانستہ نہیں کہی گئیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں لطافت زیادہ ہے یا ان میں جو اَن کہی چھوڑ دی گئیں۔ ایک زنداں کا منظر پیشِ نظر ہے۔ کوئی قید و بند میں مبتلا اس پر غور کر رہا ہے کہ آخر درِ زنداں کے کھلنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا موسمِ بہار آ گیا یا اجل کی آمد آمد ہے؟ کیا کسی قیدی کو چھوڑا جا رہا ہے یا کسی نو گرفتار کا خیر مقدم مقصود ہے۔ جو مطالب اس شعر میں حذف کئے گئے ہیں اور وہ جو بیان کئے گئے ہیں ان دونوں کا مجموعی اثر تغزل کی اعلیٰ ترین معراج کو ظاہر کرتا ہے۔ اس غزل کے باقی شعر بھی نہایت بلند ہیں۔

سمجھے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گذری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانیؔ نے اپنے مخصوص انداز میں عشق و حسن کے معاملات اور زندگی کے اسرار بیان کئے ہیں جن کی تشریح وہ غم ہی کی زبان سے کرتے ہیں۔ ان کے خیالات فرضی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ صداقت اور خلوص پر مبنی ہیں اس لئے ادب ہمیشہ ان کی قدر کرے گا۔ وہ بھی جو ان کے یاس و قنوطیت کے رجحان کو زندگی کی مکمل توجیہ نہیں سمجھتے اُن کے کلام کی تاثیر و متانت"

اور خلوص سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شعر محسوس کر کے لکھتے تھے اور ان کے احساس میں ایک خاص قسم کی گہرائی تھی جسے تحفۂ غم سمجھنا چاہیئے۔

زندگی کی کیا خوب توجیہ کی ہے۔

ایک معمہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ایک تو خواب اور وہ بھی ایک دیوانہ کا خواب ۔ رمز و ایما کی انتہائی کیفیات ان چند لفظوں میں موجود ہیں۔ دوسری جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

محبت کی ایک کیفیت اس شعر میں کیا خوب بیان کی ہے۔

محبت میں ایک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے

کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

بعض دفعہ رند شرب جگر بھی ایسی پتہ کی بات کہہ جاتا ہے کہ انسان پر ایک قسم کی حیرت سی طاری ہو جاتی ہے۔ آنسوؤں کے خشک ہونے کے مضمون کو ادا کیا ہے:

اس عشق کی تلافیٔ مافات دیکھنا

رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

اس شعر کا ایک ایک لفظ اثر و بلاغت میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق کی تلافیٔ مافات کا تصور بالکل نیا ہے۔ اور اس خیال میں کتنی حسرتیں پوشیدہ ہیں کہ جب آنسو خشک ہو گئے تو دل کو رونے کی تمنا ہے۔ جو حصہ حذف ہے یعنی یہ کہ جب آنکھوں میں آنسو تھے تو ان کی پوری طرح قدر نہ ہوئی کس قدر لطیف اور باکیف ہے۔

اسی مضمون کو غالب نے بھی ادا کیا ہے لیکن جگر کا شعر بڑھا ہوا ہے۔

زبان کے لحاظ سے بھی اور ایمائی کیفیت کے لحاظ سے بھی۔ غالب کا شعر ہے۔

غالب زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہوگئی (نسخہ حمیدیہ)

جگر کے شعر کا مضمون داغ کے یہاں دوسرے پیرائے میں ملتا ہے۔

جب پاؤں تھکے تو جستجو کی — جب دل نہ رہا تو آرزو کی

غالب نے بھی حسن سخن کے لئے سوز و گداز کو ضروری بتایا ہے۔ اس کے نزدیک کلام میں اس وقت تک اثر نہیں پیدا ہو سکتا جب تک کہنے والے کا دل غم کی لذت سے آشنا نہ ہو۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد — پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ایک جگہ اپنی غزل سرائی کی اس طرح توجیہ کی ہے۔

مجھے انتعاش غم نے پئے عرض حال بخشی — ہوس غزل سرائی تپش فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب — کروں خوان گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

غالب نے غم کی حقیقت کو محسوس کیا اور اپنے کلام میں اسے بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا۔ لیکن وہ ہر وقت اور موقع بے موقع ماتم کناں نہیں نظر آتا۔ اس کا غم ضبط کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ زندگی میں غم کی اساسی حقیقت کو اس شعر میں کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی — دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

بہار کو موسم خزاں کے پاؤں کی مہندی کہا جس کا رنگ بہت جلد غائب ہو جاتا ہے۔ دنیا کا عیش بھی رنگ حنا کی طرح نمائشی اور عارضی ہے۔ زندگی کی اصلی حقیقت غم ہے۔

دوسری جگہ زندگی اور غم کو ایک ہی چیز بتایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غم، غم عشق ہے جو زندگی کا حرکی عنصر ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ایک موقع پر کہا ہے کہ غم دل کے مکتب میں انسان ہمیشہ سبق لیتا رہتا ہے

اور ہمیشہ اس کی حیثیت ایک مبتدی کی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے عیش و فراغت کی انتہا پر انسان بہت جلد پہنچ جاتا ہے اور اسی لئے اس سے اتنا ہی جلدی اکتا بھی جاتا ہے۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ "رفت گیا اور بود تھا"

غالب کے یہاں غم مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ کبھی غم روزگار کی اور کبھی غم عشق کی اور کبھی دائمی تمنا اور انتظار کی۔ غم عشق کی بدولت غم روزگار سے بآسانی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اسی غم عشق سے زیست کا مزہ ملتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا　　درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

غم عشق کا چسکا ایک دفعہ پڑنے کے بعد چھٹتا نہیں۔ اس کے انداز جنوں سے دل بصیرت اندوز ہوتا ہے اور پھر اس کے آگے کسی دوسرے کی نہیں مانتا۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

عشق و محبت میں زندگی ایک دائمی مجبوری کی کیفیت بن جاتی ہے اس فراق و محرومی کی حالت میں دل کو سیر گلشن کی تاب نہیں رہتی۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

اس احساس مجبوری کا سبب محرمیٔ حسن کی تڑپ ہے۔ اس جستجو میں انسان ہمہ تن چشم شوق بن جاتا ہے۔

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں　　کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

حسن کی نارسائیاں تمنا کی آگ کو بھڑکاتی ہیں یہاں تک کہ عشق میں ایک ایسا مقام آتا ہے کہ عاشق حسن محبوب سے بے نیاز ہو کر تمنا کی خاطر تمنا کرتا ہے۔ تمنا، تمنا کی خاطر، اچھوتا مضمون ہے جو صرف غالب ہی کے یہاں

ملتا ہے۔ کہتے ہیں:

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا — مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

اصل مقصد حسرت و غم کی لذت ہے۔ دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے آئینہ خانہ مراد لیتے ہیں اور پھر مدعائے محروم کو اس کی سیر کراتے ہیں:۔

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے — آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

تمنا حیرت کا روپ بھر کر کسی کے سراغِ جلوہ کے لئے انتظار کی گھڑیاں جھیلتی ہے۔

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا — آئینہ فرشِ ششِ جہت انتظار ہے

اس غزل کے ایک اور شعر میں کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدہ کا احترام اسی شکل میں ممکن ہے کہ باوجود اس یقین کے کہ وہ نہ آئے گا' ہم برابر اس کا انتظار کئے جائیں۔ جس طرح تمنا' تمنا کی خاطر تھی' اب انتظار انتظار کی خاطر ہے۔

بیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

تمنا' حسرت اور انتظار یہ سب غم کی شاخیں ہیں جن کے ذکر سے کلامِ غالب بھرا پڑا ہے غالب کے غم میں غم کی حقیقت کا سراغ ملتا ہے جس کا نقطۂ عروج موت ہے جو ایک زبردست شعوری محرک ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

فانی نے جسے "مر مر کے جئے جانا" کہا ہے اسے غالب ذوقِ فنا کی ناتمامی سے تعبیر کرتا ہے۔

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے:۔

جلتا ہے جی کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے — اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

اپنے داغِ ناتمامی کو اس شمع کی تشبیہ و رعایت سے بیان کیا ہے جسے کسی نے بجھا دیا ہو اور اسے پورا جلنے کا موقع نہ ملا ہو۔

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

دوسری جگہ پھر شمع ہی کے استعارہ کو لے کر کہا ہے کہ غم کی فطرت ہے کہ وہ جانگدا ز ہے۔ دوسروں کی غمخواری سے اس کی یہ فطرت نہیں بدل سکتی۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں

لیکن ذوق فنا کی ناتمامی خود حیات کا اقتضا معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر غم زیست کیسے حاصل ہو؟ اور اگر غم زیست نہ ہو تو تمنا کی نیرنگیاں کیسے جلوہ افروز ہوں ؟ نفس شعلہ بار کی ناتمامی کے ذکر کے ساتھ اس کو زندگی کے ساتھ کس خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آکے دم ہوئے

وہی نالے جو عالم ازل میں کھینچے جاتے وہ وہاں نہ کھینچے جا سکے تو دنیا میں سانس بن گئے۔ اس طرح زندگی کی بنا غم و الم ٹھہرتے ہیں۔

کبھی عاشق پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ فرط غم سے اس کو اپنے وجود کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے سوز غم نے جگر کو ایسا پھونکا کہ سوائے داغ کے اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ اب اگر میں کسی سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے تو کوئی باور کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ اس سے یہ استدلال کیا ہے جو لطف اور بلاغت سے خالی نہیں کہ غم کی وجہ سے ہستی کا اعتبار ہی جاتا رہا۔

بعض جگہ غالب کے ہاں غم کے مضمون میں بھی ایک خاص قسم کی شوخی ملتی ہے جو اس کے مزاج شعری سے سازگار ہے۔ موت اور کفن کے مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

غالب کا تصورِ غم فانی کے تصورِ غم سے مختلف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب بھی اس کے قائل ہیں کہ زندگی کی بنیاد غم پر قائم ہے۔ لیکن ان کے نزدیک اس عمارت کے در و دیوار پر ایسے نقش و نگار بھی ملتے ہیں جو پُرمسرت اور جاذبِ نظر ہیں اور جن میں اتنی کشش ہے کہ وہ احساسِ غم کو بھی بھلا دیتے ہیں چاہے وہ عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ غم اور ناامیدی کی تاریکی پر بھی غالب کی حقیقت نگر آنکھ نے اُمید کی کرن دیکھی کہ یہی حیات کی ضامن ہے۔ چنانچہ زندگی کے پُرامید گوشوں پر اس کی نظر گئی اور اس نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی جس کا اظہار اس شعر میں بڑی خوبی سے کیا ہے

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالقِ فطرت نے جب دیکھا کہ انسان اپنی انفرادیت اور خودی کے خول میں ایسا بند ہے کہ اس سے باہر آنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تو اس نے انسانی دل کو غمِ عشق کی کسک سے آشنا کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خودی اپنے آپ میں گھٹ کر فنا ہو جاتی۔ غمِ عشق بھی فنا (ٹریجڈی) کی طرف لے جانا چاہتا ہے اور لے جاتا ہے اگر اس پر مذہب و اخلاق کی بندشیں نہ عاید ہوں جن کے بطن سے تہذیب جنم لیتی ہے۔ غالب کا اوپر کا شعر ہمیں عالمِ تہذیب کی سیر کراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ میری فطرت سراپا رہنِ عشق ہے لیکن اس کے ساتھ میری فطرت میں زندگی سے الفت ودیعت ہے۔ غمِ عشق کا منتہا چاہے ٹریجڈی ہو لیکن باوجود اس کے زندگی کی گہرائیوں میں سے کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ تیرا مقدر فنا نہیں بقا ہے۔ زندگی کی یہ عجیب و غریب اور پُراسرار کشمکش ہے کہ وہ ایک طرف تو برق کی پرستش کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حاصلِ حیات کو سینت سینت کر بچا بچا

کر رکھنا چاہتی ہے اس احساس نے غالب کو امید پرست بنا دیا جو باوجود غم عشق کی حقیقت کو ماننے کے زندگی کے خوشگوار اور پرمسرت تجربوں کی بھی قدر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی قدر کریں۔ غم و مسرت کی دھوپ چھاؤں جس سے انسانی زندگی عبارت ہے کائنات ہستی کا ایک طلسمی رمز ہے۔ اگر غم و مسرت ایک دوسرے کے پہلو میں موجود نہ رہیں تو زندگی کی حقیقت سادہ اور یک طرفہ ہو جائے غالب کا زندگی اور آرٹ کا یہ نقطہ نظر حقیقت پر زیادہ حاوی اور صحت مند ہے۔ اس کو غم کی تاریکی میں بھی امید کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں کہ یہی حاصل حیات ہیں۔

عہد جدید کے شاعروں میں حسرت رجائیت پسند ہیں لیکن لذت آزار سے وہ بھی بالکل بیگانہ نہیں۔ ان کی پُر امیدی کی تہ میں سوز و گداز اور درد مندی کی جھلکیاں قدم قدم پر دکھائی دیتی ہیں۔ جن سے ان کے تغزل کے اثر و آہنگ کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں:-

ہوتا ہے برا لذت آزار کا چسکا ۔۔۔ مرنا بھی کہیں مجھکو یہ دشوار نہ کر دے
کچھ حد بھی ہے اس شورش خاموش کی حسرتؔ ۔۔۔ یہ کشمکش غم مجھے بیکار نہ کر دے

عشق کی روح پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر ۔۔۔ اپنی جفا کو یاد کر، میری وفا کو یاد کر
جان کو محو غم بنا دل کو وفا نہاد کر ۔۔۔ بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کر

جگرؔ کے غم و الم میں بھی رنگینی ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔

رنگینیٔ الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر ۔۔۔ اے دل! وہی تو جلوے سرمایۂ نظر ہیں

غزل گو شاعر عاشق ہوتا ہے اور عاشق کی ہر بات دنیا والوں سے الگ ہوتی ہے۔ اس کا ہر انداز نرالا اور اس کی ہر شان میں انوکھاپن ہوتا ہے وہ دوسروں کی چلی ہوئی راہ پر نہیں چلتا بلکہ اپنی الگ راہ نکالتا ہے چاہے وہ سیدھی ہو یا ٹیڑھی اس سے اسے بحث نہیں۔ اگر ٹیڑھی بھی ہے تو ہوا کرے۔ اس کو یہ اطمینان کافی ہے کہ اگر وہ بھٹکے گا تو بھی اپنی ہی راہ پر بھٹکے گا

اس کی اصل منزل تو خود اس کا اپنا دل ہے جس تک اس کی رسائی رہنی چاہیئے اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں چاہتا۔ دوسرے غم سے گھبراتے ہیں لیکن عاشق غم کی پرورش کرتا ہے۔ لذت الم اس کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے جس کی وہ چھپا چھپا کر حفاظت کرتا ہے۔

دنیا والوں کا قاعدہ ہے کہ رنج والم اور مصیبت کو دور کرنے کے لیے دعا کرتے ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ دعا مانگو تاکہ تمہاری احتیاج پوری کی جائے اگر شدت خلوص سے کوئی چیز طلب کی جائے تو ضرور ہے کہ وہ حاصل ہو۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر میں دعا مانگوں گا تو وہ ایک طرح کی شکایت ہوگی۔ مذہب کہتا ہے کہ دعا سے بہت سی آنے والی بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ میں تو بلاؤں کو دعوت دیتا ہوں۔ ان کے بغیر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ جب تک غم زیست کی خلش نہ ہو زندگی کس کام کی؟ وہ زاہد ناداں کو اس طرح خطاب کرتا ہے:

نہ مانگ زاہد ناداں ذرا سمجھ تو سہی
شکایتیں ہیں کسی کی دعا کے پردے میں (بسمل دہلوی)

اگر کبھی اس کی زبان سے دعا کے لفظ نکل گئے تو بہت جلد انھیں واپس لینے کی فکر کرتا ہے۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے۔ وہ اپنی ندامت کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

بہت خجل ہے ترے درد سے دعا میری
یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری (حسرت)

دعا قبول نہ ہونے کی وہ دعا مانگتا ہے۔

کسی کی خاطر نازک کا آگیا ہے خیال
دعائیں مانگ رہا ہوں دعا قبول نہ ہو (جگر)

غالب کو جب اجابت دعا کا یقین ہو گیا تو اس نے سوائے دل بے

مدعا کے اور کوئی چیز طلب نہ کی۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ   یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

داغؔ کی دعا کو درِ قبول تک جانے میں اسی طرح تامل رہا جس طرح اس کے محبوب کو اس کے ہاں آنے میں۔

آئے وہ بے وفا یہاں اس کی بلا کو کیا غرض
جائے درِ قبول تک میری دعا کو کیا غرض

فانیؔ اسے محبت کی توہین خیال کرتے تھے اگر عاشق دعا میں اثر کا طالب ہو۔ ان کا شعر ہے اور اخلاقی حیثیت سے بڑا بلند شعر ہے۔

تنگ ہے سعیٔ عرضِ محبت فرضِ محبت پورا کر
اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے

دعا سے گذر کر جب نالوں تک نوبت آتی ہے تو عاشق کو اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ان کی رسائی نہ ہو جائے۔ اس کو فکر ہوتی ہے کہ اگر آہ فلک سوز اپنا کام کر گئی تو پھر شبِ ہجراں میں کس سے شکوے بیان کئے جائیں گے اگر فلک نہ رہا تو پھر ان شکوؤں کا سننے والا کون ہوگا؟ یہ عجیب و غریب شاعرانہ اندیشہ ہائے دور و دراز ہیں۔ مجروحؔ کا لاجواب شعر ہے :۔

پھر کس سے یہ شکوے شبِ ہجراں میں رہیں گے   کام اپنا کہیں آہ فلک سوز نہ کر جائے

کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں نالوں کی وجہ سے محبوب بے تابِ محبت نہ ہو جائے۔ جگرؔ کا شعر ہے۔

کون دیکھے اسے بے تابِ محبت اے دل   تو وہ نالے ہی نہ کر جن میں اثر ہوتا ہے

خوگرِ غم کے لئے نالہ کشی حسن طلب ہے۔ اس کے نالے شکوۂ جفا کے لئے نہیں بلکہ تقاضائے جفا کے لئے ہوتے ہیں۔ غالبؔ نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں   ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اب تک عشقیہ شاعری کے اس رجحان کا ذکر کیا گیا جس کا خطاب مجاز سے ہے لیکن انسانی ذہن و وجدان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مجاز و حقیقت کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کرنا دشوار ہے۔ حافظ کہہ گئے ہیں۔

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شُرب مدام ما

اہل نظر کو مجاز میں حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے۔ معرفت الٰہی بغیر معرفت نفس اور معرفت کائنات کے ممکن نہیں۔ ذات احدیت جو وجوب محض ہے اسماء و صفات سے منزہ اور خلق و مجاز سے ماوراء سہی لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مظاہر کونیہ کی اصلیت کیا ہے؟ بقول غالب

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟

ان سوالوں کا جواب غالب نے وہی دیا جو معارف و سلوک کے واقف کاروں نے اس سے پہلے دیا تھا۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہنگامۂ ہستی کی کرشمہ سازیوں میں اور پری چہروں کے غمزہ و عشوہ و ادا اور ان کی شکن زلف عنبریں اور نگہ سرما سا میں ارباب عرفان کے لئے تجلیات الٰہی کی جلوہ فرمائیاں موجود ہیں جو انسان کا حقیقی مطلوب ہے۔ اصلی حسن و جمال شاہد حقیقی میں پایا جاتا ہے اس لئے وہی عشق و محبت کے قابل ہے۔ دوسرے مظاہر جمال فریب نظر سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کا تصوف اتنا وارداتی نہیں جتنا کہ میر درد یا نیاز بریلوی کا۔ اس کا تعلق اندرونی احساس کے مقابلے میں ذہن سے زیادہ ہے اس کے اسی ذہنی رجحان نے اس کی وسیع مشربی کو اجاگر کیا جو تغزل کی روح رواں ہے۔

غالب سے پہلے میر درد کے یہاں خاص طور پر عالم انوار و اقدار اور عشق حقیقی کی زمزمہ سنجیاں ملتی ہیں۔ ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ تصوف تغزل سے ایسا ہم آہنگ ہے کہ ہر اعلیٰ درجہ کے غزل گو کے کلام میں اس کی تھوڑی بہت چاشنی موجود ہے۔ یہ خیال بجائے خود اپنے اندر شعریت رکھتا ہے کہ وجود حقیقی جب اپنے تعین کی طرف مائل ہوا تو عالم رنگ و بو اور مظاہرِ کونیہ کا ظہور ہوا۔ عالم میں خالق تعالیٰ جاری و ساری ہے جو کچھ ہے وہ اسی کے اسماء و صفات کا ظہور ہے۔ کثرت اور تعدد کی تہ میں اصول وحدت کارفرما ہے۔ چونکہ کائنات کی ہر شے میں ذات باری کا جلوہ موجود ہے اسکی بو آتی ہے اس واسطے مظاہر اپنے اندر کشش اور دلبستگی کا سامان رکھتے ہیں۔ حواس ظاہر کی رسائی چونکہ محدود ہے اس لیے، عشق حقیقی کے مقامات تک رسائی وجدان کے ذریعہ ممکن ہے۔ اگر ذات واجب انسانی خودی اور مظاہر کونیہ سے بالکل ماورا ہوتی تو اس کی موجودگی اور تاثیر کو انسان کیسے محسوس کرتا؟ ہمہ اوستی فلسفہ میں انسانی خودی کا منتہا یہ ہے کہ وہ انائے مطلق میں اپنے آپ کو ضم کردے اور حقیقت سے علیحدگی کا احساس باقی نہ رہے۔ غرضکہ ہمہ اوستی فلسفہ کے تمام تصورات بجائے خود شعر ہیں اور ان میں تغزل کے تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں جنھیں نئے نئے پیرایوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔

تصوف کے مسائل کو اردو غزل میں شروع ہی سے برتا گیا اس لیے کہ یہ موضوع رمز و کنایہ کے ساتھ خاص طور پر مناسبت رکھتا تھا۔ ولی اور میر تقی میر کو زیادہ تر مجاز سے دل بستگی رہی۔ لیکن ان اساتذہ کے ہاں بھی آپ کو ایسے اشعار ملیں گے جن میں تصوف کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی زبان اور اسلوب تصوف کے اسرار و رموز کو بیان کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ مجازی عشق کے معاملات کی طرح حقیقی

عشق کی کیفیات بھی تفصیل، منطقی تسلسل اور صراحت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ غزل میں تصوف کے مضمون اچھی طرح کھپ گئے۔ تصوف کے سہارے فلسفہ و حکمت نے بھی ایوان غزل میں بار پایا جن کی بدولت کلام میں تنوع پیدا ہوا اور لطائف علوم و فنون بیان ہونے لگے۔ حافظ سے لے کر غالب تک مشرقی ممالک کے علم و فن کی ساری ذہنی ترقی، ہمیں غزلوں میں نکات شعری کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ غزل کی حقیقی اساس جذبات ہی رہے لیکن جذبات جذبات میں فرق ہوتا ہے۔ ایک اس شخص کے جذبات ہیں جس کا سینہ علوم و معارف کی روشنی سے منور ہے۔ ایک اس کے جذبات ہیں جو مادی حیوانی زندگی سے آگے اپنی نظر نہیں لے جا سکتا۔ ضرور تھا کہ اس فرق کا اثر غزل لکھنے والوں کے کلام پر پڑتا اور پڑا۔

اُردو میں میر درد کا کلام عشق حقیقی کے رنگ میں رچا ہوا ہے لیکن وہ تغزل اور شریعت کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
دوستو دیکھا تماشہ یاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے
جوں شرر اے ہستیِ بے بود یاں بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

بسان کاغذ آتش زدہ میرے گرد — ترے جلے بجھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں
فلک سمجھ تو یہی ہم سے اور گلو گیری — یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں

متوسطین میں غالبؔ اور نیازؔ بریلوی کے یہاں تصوف کا رنگ ملتا ہے۔ خاص طور پر نیازؔ بریلوی نے جو اپنے زمانے کے مشہور صاحب حال صوفی گذرے ہیں اپنے کلام میں سلوک کے اسرار اور رموز بیان کئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دید اپنے کی تھی اسے خواہش — آپ کو ہر طرح بنا دیکھا
صورت گل میں کھل کھلا کے ہنسا — شکل بلبل میں چہچہا دیکھا
شمع ہو کر کے اور پروانہ — آپ کو آپ میں جلا دیکھا
کرکے دعویٰ کہیں اناالحق کا — بر سر دار وہ کھنچا دیکھا
تھا وہ برتر شما و ما سے نیازؔ — پھر وہی اب شما و ما دیکھا

کہیں ہے بادشاہ تخت نشین — کہیں کاسہ لئے گدا دیکھا
کہیں عابد بنا کہیں زاہد — کہیں رندوں کا پیشوا دیکھا
کہیں وہ در لباس معشوقاں — بر سر ناز اور ادا دیکھا
کہیں عاشق نیازؔ کی صورت — سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

تو نے اپنا جلوہ دکھانے کو جو نقاب منہ سے اٹھا دیا
وہیں محو حیرت بیخودی مجھے آئینہ سا بنا دیا
وہ جو نقش پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی
سو کشش سے دامن ناز کی اسے بھی زمیں سے مٹا دیا
کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال

سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا
رگ و پئے میں آگ بھڑک اٹھی پھونکے ہی پڑا سبھی بدن
مجھے ساقیا مئے آتشین کا یہ جام کیسا پلا دیا
جبھی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فنا کیا
جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہے شور جن و ملک کے اوپر کر رہا ہے اپنا زور
عشق کے میدان میں آ صورت انسان بنا عاشق مولا ہوا چاند کا جیسے چکور
سینے میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ رہا بل بے سمائی تیری او بے سمندر کے چور

خموشی کا عالم ہے اپنا مقام نہیں آشنا بحث و تکرار کے
مبارک رہے تجھ کو واعظ بہشت میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

غالب کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں کو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے۔ غالب کی شخصیت کی طرح اس کے کلام میں بڑی وسعت ہے اس کی چشم بینا نے حیات اور کائنات کو ہر ممکن نقطۂ نظر سے دیکھا اور ان کی اس طرح ترجمانی کی کہ اس میں سب کچھ آ گیا۔ مجاز اور حقیقت بھی، شرح درد اشتیاق بھی اور حسن کرشمہ ساز کی عجز نمائیاں بھی۔ شوخی اس بلا کی ہے کہ خود اپنے آپ تک کو نہیں چھوڑتے اور کبھی خود اپنے اوپر بھی چوٹ کر جاتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مسائل تصوف کے ساتھ پری وشوں کا ذکر بھی کرتے جاتے ہیں کہ کہیں تجربۂ حکمت کی خشکی انسانیت کی شگفتگی پر غالب نہ آ جائے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مجاز کو بعد میں دیکھیں گے۔ آیئے دیکھیں وہ حقیقت کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ انھیں جو کچھ کہنا ہے بڑی بلند آہنگی سے کہتے ہیں۔ مبتذل اور پیش پا افتادہ تشبیہوں سے انھوں نے ہمیشہ احتراز کیا۔ ان کے طرز ادا کی جدت کا یہ اقتضا تھا کہ خود اپنے تخیل سے نئی نئی ترکیبیں، بندشیں اور اچھوتے استعارے اور کنائے ایجاد کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ ہر بات کو انوکھے طریقے سے بیان کیا۔ واجب الوجود کے مسئلہ کو کس معنی آفرینی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہر چند ہر ایک شئے میں تو ہے ۔۔۔ پر تجھ سے تو کوئی شئے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی ۔۔۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ ۔۔۔ آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

ہے تجلی تری سامان وجود ۔۔۔ ذرہ بے پر تو خورشید نہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم ۔۔۔ کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

ہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ۔۔۔ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرۂ و موج حباب میں

بحر کا وجود ان صورتوں کے تعدد پر مبنی ہے جو کبھی قطرہ کا کبھی موج کا اور کبھی حباب کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ مختلف صورتیں بحر سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتیں بلکہ اس کی شانیں ہیں جن میں وہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر یہ شانیں نہ ہوں تو بحر کی ہستی نامکمل رہ جائے۔ شاعر نے بڑے ہی لطیف اور بلیغ

طریقے سے انسانی وجود اور مظاہر خارجی کو اس طرح خالق کائنات سے وابستہ اور خود ان کی وجہ وجود کو آشکارا کیا ہے۔

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غیب الغیب سے تصوف کی اصطلاح میں احدیت ذات مراد ہے جو عقل و ادراک کی حدود سے پرے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کو تم عالم ظاہر سمجھ رہے ہو جو کثرت و تعدد کی صورت میں نظر آتا ہے وہ ذات احدیت ہی ہے۔ اس کی جلوہ فرمائیوں سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ مظاہر کونیہ اس سے کوئی علیحدہ ہستی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس سے جدا نہیں ہیں۔ غالب نے بڑی دقیقہ سنجی سے مندرجہ بالا شعر میں خواب کی تمثیل سے اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ وضاحت تفصیل سے بے نیاز ہے۔ شاعرانہ وضاحت میں بھی رمز و ایما کی مبہم کیفیت موجود رہتی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ کوئی شخص اگر خواب کی حالت میں یہ دیکھے کہ وہ بیدار ہے تو کیا وہ واقعی بیدار ہوگا۔ نہیں۔ خواب میں اپنی بیداری کا خواب دیکھنے والا خواب ہی میں ہوگا۔ کائنات کے جلوؤں کی بوقلمونی اور انسان کی طاقت دید کے محدود ہونے کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

دیوان غالب میں اسی طرح کے اور اشعار ملتے ہیں جن میں سلوک و تصوف کے امور پیش کیے گئے ہیں۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات　　عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

لیکن غالب کے کلام کا بیشتر حصہ عشق مجازی کی کیفیت پر مشتمل ہے اور کہیں کہیں بڑی دقیقہ رسی سے زندگی کی گتھیوں کو حکیمانہ انداز میں رمز و ایما کے ذریعے

سلجھایا ہے۔ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اس کا طرز ادا ہے جس کو اردو شاعری کے لئے سرمایۂ نازش سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے اکثر شاعر ایک ہی لکیر کے فقیر ہیں۔ جو لذت پرستی کی طرف مائل ہوا تو وہ کائنات میں سوائے اس کے اور کچھ دیکھتا ہی نہیں جو اندوہ والم سے متاثر ہوا تو اسے حسرت و غم کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن زندگی تو بڑی وسیع شئے ہے۔ وہ مسرت اور غم اور لذت پرستی سب پر حاوی ہے اور پھر ان سے بالاتر بھی ہے۔ غالب نے اس نکتہ کو پا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں تنوع نظر آتا ہے جو اس کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس ہے۔ اس کے یہاں غم بھی ہے اور مسرت بھی، جوش جذبات بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی بھی۔ تخیل کے نقش و نگار بھی ہیں اور حقائق و محسوسات کی ترجمانی بھی۔ دیوان کا دیوان ایسی دل آویز موسیقی میں رچا ہوا ہے کہ اسے فردوس گوش کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔

غالب اور نیاز بریلوی کے بعد بھی غزل میں تصوف کے نکات اور مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ فانی، اصغر اور جگر بادۂ تصوف کے ذوق شناس ہیں۔ عارفانہ مضامین میں اگر جدت ادا کی دلاویزی بھی شامل ہو جائے تو یہ شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے اور اہل ذوق کے قلب پر بجلیاں گرنے لگتی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

فانی

تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب و گل
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانہ کا

اٹھتی نہیں تہمت نظارۂ جمال
منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

کوئی چٹکی سی کلیجہ میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

حسن مطلق بھی ہے حجاب ان کا
اعتبار است بر منا کی قسم

ہزار ڈھونڈئے اس کا نشاں نہیں ملتا　　جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا
تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ　　بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا
ترے نسبت ہے اعتبار اپنا　　ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک　　اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گذر جا

اصغر گونڈوی

شورش دل جو وہ ہوتی تھی بدستور ہے آج　　نہیں معلوم وہ نزدیک ہے یا دور ہے آج
جس سے کل تک دل بیتاب پھنکا جاتا تھا　　اسی شعلہ کو جو دیکھا تو سر طور ہے آج

پردۂ حرماں میں آخر کوئی ہے اس کے سوا　　اے خوشا درد کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے
میں تو ان مجبوریوں پر بھی سراپا دید ہوں　　اس کے جلوے کی ادا اک شان مستوری بھی ہے
میری محرومی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا　　قرب کی راہوں میں میری ایک رہ دوری بھی ہے

اس جلوہ گاہ حسن میں چھایا ہے ہر طرف　　ایسا حجاب چشم تماشا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرم روِ عرصۂ وجود　　میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے　　قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں بیاباں ہے
اے پیکر محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں　　جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

جگر

حسن کے معجزۂ وحدت و کثرت کی قسم　　چشم حیرت میں ہے سب کچھ سر حیرت کی قسم
تجھ کو دیکھا مگر اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں　　اپنی گم مائیگی جرأت و ہمت کی قسم

مجھ سے چھپنا تجھے زیبا نہیں اے پیکرِ حسن میں محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم

کرشمے ذات و صفات کے ہیں جمال قدرت دکھا رہے ہیں
کہ ہر تصور سے دور رہ کر وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں
کہاں کی دید اور کس کا عرفاں جو اس گم ہیں نظر پریشاں
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں
یہ حادثات زمانہ کیا ہیں اسی کے حسن طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں
کرشمے ہیں حسن بے جہت کے فسوں ہیں چشم مناسبت کے
ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں
نفس نفس میں صفات تازہ ممات تازہ حیات تازہ
انھیں میسر ہے ذات تازہ جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں

نگاہِ شوق ہی کچھ جانتی ہے راز مستوری وہ خود جلوہ ہے ان کا سب جسے پردا سمجھتے ہیں

یہ فریب جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دل بے خبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر
میں سہی در دہی مگر مجھے اور چاہیئے کیا جگر
غم یار ہے میرا شیفتہ میں فریفتہ غم یار پر

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم جلوہ بہ جلوہ آئے جا
تشنۂ حسن ذات ہوں تشنہ لبی بڑھائے جا
لطف سے ہو کہ قہر سے ہوگا کبھی تو روبرو
اس کا جہاں پتہ چلے شور وہیں مچائے جا

معراج شوق کہیئے یا حاصل تصور   جس سمت دیکھتا ہوں تو مسکرا رہا ہے

شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر منحصر ہے لیکن شعر کی روح چونکہ رمز و ابہام کے طلسم میں پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے لفظوں کے معنی میں تشبیہ اور استعارہ اور کنایہ سے وسعت پیدا کی جاتی ہے۔ تشبیہ میں وہ قوت اور تاثیر نہیں ہوتی جو استعارہ اور کنایہ میں پائی جاتی ہے اس لئے کہ اس میں رمز و ابہام کا ایمائی عنصر نسبتاً کم ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے ایک حد تک مطالب میں وضاحت آجاتی ہے۔ اگر استعارہ اور استعارہ بالکنایہ کا استعمال اس لئے کیا جائے کہ معنی کی تفصیل اور وضاحت ہو تو وہ بھی تشبیہ کے مثل ہو جائیں گے اور ان کی قوت و تاثیر میں کمی آجانا لازمی ہے۔ استعارہ سے حقیقت کی تصویر کشی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی پیچیدگی کو ظاہر کرنا۔ عالم فطرت کی وسعت، کثرت، تنوع، اس کی بلندیاں اور پستیاں، زمان و مکان کی کبھی نہ ختم ہونے والی پہنائیاں، ذہن کی شعوری اور غیر شعوری کیفیات دقیق اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں جن کی طرف شاعر متوجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ الجھی ہوئی حقیقت خود اس کے دل کی دنیا اور اس کے جذباتی حقائق ہیں جنھیں حرف و صوت کی شکل میں وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ہر استعارہ دوہرا مطلب رکھتا ہے۔ ایک کی جگہ دو تصورات ذہن کے سامنے آتے ہیں لیکن دونوں میں وحدت پوشیدہ رہتی ہے۔ استعارہ اور کنایہ کی مدد سے

جذباتی حقائق کی بوقلمونی ایک لمحہ میں دلنشین ہو جاتی ہے جس کی وضاحت اگر منطقی طرز میں کی جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں لیکن اصل بات کا پتہ نہ چلے۔ استعارہ ایک طرح کا پس منظر مہیا کرتا ہے جس پر شاعر کی بصیرت حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ غزل میں استعارہ اور کنایہ کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو اس لئے کہ ثانی الذکر کا مقصد تفصیل اور تشریح سے مضمون کو سامع کے دل نشین کرنا ہے اور اول الذکر کا رمز و ایما کے ذریعہ تحیر میں اضافہ کرنا۔ استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ معمولی سی بات کو کہاں سے کہاں پہونچایا جاسکتا ہے۔ مثلاً غالب اس مضمون کو تشبیہ و استعارہ کی زبان میں کیا خوب بیان کرتا ہے کہ انسان کی عمر گذری چلی جاتی ہے اور اس کی گریزپائی پر کسی کو کوئی قابو نہیں۔ یہ شعر رمزی محاکات کا کمال ظاہر کرتا ہے جس میں داخلی اور خارجی عناصر دونوں ہم آغوش ہیں۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

استعارہ نے معانی کو چار چاند لگا دئے اور معانی کی بلندی اور خوبی نے لفظوں کے چناؤ میں شاعر کو مدد دی۔ یہی حسن ادا ہے جس نے غالب کو غالب بنایا اور اس کے شاعرانہ رتبہ کو اتنا بلند کر دیا کہ اب تک وہاں کوئی نہ پہونچ سکا۔ انسان کی ہستی کی بے ثباتی کی تصویر استعارہ اور تمثیل کے ذریعہ دوسری جگہ یوں پیش کی ہے:

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت تازگی اور بلندی سے کیا جاسکتا ہے جو معانی و بیان کی جان ہوتے ہیں۔ استعارہ رمز آفریں

ہوتا ہے اس لئے جذبہ اور اندرونی تجربہ کی تصویر اس سے بہتر کھینچنے والا کوئی اور ذریعۂ کلام نہیں۔ زندگی اور خارجی حقیقت کی ہو بہو نقل کے بجائے استعارہ اور کنایہ سے اس کی توجیہ اور باز آفرینی ممکن ہوتی ہے۔ اگر تشبیہوں یا معنی کی تفصیل پر زیادہ توجہ کی گئی تو شعر کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ غزل گو شاعر کے پیش نظر معنی کی صحت سے زیادہ استعارہ بالکنایہ کی صحت ہوتی ہے۔ وہ اشیاء اور حقائق کائنات کو ویسا نہیں دیکھتا اور نہیں دیکھنا چاہتا جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں۔ وہ جب انھیں بیان کرتا ہے تو ان لطیف تعلقات کو بھی اپنے پیش نظر رکھتا ہے جو دوسری اشیاء اور حقائق سے انھیں وابستہ و پیوستہ کئے ہوئے ہیں پھر جب وہ ان کا تعلق استعارہ اور کنایہ کے ذریعہ اپنے اندرونی جذبہ اور تجربہ کی روشنی میں جوڑتا ہے تو لازمی طور پر اس کا نقطۂ نظر داخلی ہو جاتا ہے اور اس کے بیان میں رمز و ابہام کی کیفیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رمزیت موسیقی کی طرح حقیقت اشیاء کے جو ناقابل فہم عناصر ہیں ان کی علامت ہے۔ اسی کے ذریعے جذبات کی بھول بھلیاں کے پیچ و خم اور ان کی پر اسرار کیفیات کا پتہ چلتا ہے ورنہ ہماری منطق نہ ان تضادوں کو دور کر سکتی ہے جو وہاں قدم قدم پر ملتے ہیں اور نہ ان کی کوئی توجیہ کر سکتی ہے۔ جذبہ کے اوپر منطق سر بگریباں ہو جاتی ہے اور اپنی نارسائی کو تسلیم کرنے میں اسے تامل نہیں ہوتا۔

غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبات کو تخیل کی زبان میں بیان کرنے کے لئے کبھی معانی کے لئے موزوں الفاظ تلاش کرتا ہے اور کبھی الفاظ کے لئے معانی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معانی سے لفظوں کی خارجی صورت متعین ہوتی ہے اور لفظوں کے برمحل استعمال سے خود معانی کا تعین عمل میں آتا ہے۔ شاعر کا خیال زبان اور معانی دونوں میں قدر مشترک ہوتا ہے اور دونوں میں رشتہ اور ربط قائم کرتا ہے۔ الفاظ اور معانی کے صحیح ربط سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آ سکتی علم و نظر

کی وسعت نے معنی آفرینی کے میدان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کبھی بعض مخصوص شعری علامتوں یا تلمیحوں کا آسرا لیا جاتا ہے۔ کبھی صنائع و بدائع سے شعر کے الفاظ کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے اور کبھی نقل قول سے ایمائی اثر کو بڑھایا جاتا ہے۔ صنعتوں میں حسن تخیل، مبالغہ، تضاد، مقابلہ، ایہام، مراۃ النظیر اور تجاہل عارفانہ سب کی سب غزل کی رمزی کیفیت اور تاثیر کو بڑھاتی ہیں۔ صنائع لفظی و معنوی سے شاعر کو اپنے تخیل کی پرواز میں مدد ملتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال برمحل ہو۔ اگر صنعت کی خاطر صنعت برتی گئی اور شعر کہا گیا تو رمزی تاثیر مجروح ہو جائے گی۔ صنائع بھی بلاغت سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔ ضرور ہے کہ ان سے شعر کی طلسمی تاثیر میں اضافہ ہو نہ کہ کمی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غزل میں حسن ادا کہاں سے آتا ہے؟ اس کے قواعد و ضوابط مقرر کرنا ممکن نہیں۔ ایک مطلب کو ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے کہ لطف آجاتا ہے اور دوسرا وہی بات کہتا ہے اور سننے والے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ یہ امتیاز ذوقی چیز ہے۔ عشق کے پامال مضمون پر غالب کا ایک شعر ہے اور ذوق کا ایک شعر۔ دونوں شعروں کے فرق سے دونوں کی شخصیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ غالب کہتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا

ذوق اپنی فہم و نظر کے مطابق عشق کو تیرہ خاکدان کے لئے چراغ قرار دیتے ہیں۔ معانی اچھے ہیں لیکن لفظوں کی نشست سے اس مضمون کی بلندی کی طرف ذہن راغب نہیں ہوتا بلکہ معمولی اور ہلکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بلند بات کے لئے طرز و اسلوب کی بلندی لازمی ہے ورنہ کلام بے اثر رہے گا۔ ان کا شعر ہے۔

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے

اس غزل میں محض رعایت لفظی سے جو معنیٰ آفرینی کی کوشش کی ہے وہ کس قدر بھدی ہے۔ کہتے ہیں

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

ذوقؔ کے ہاں اسی رعایت لفظی کی کثرت سے طرز ادا کی ندرت یا حسن پیدا نہ ہو سکا۔ محمد حسین آزاد انھیں چاہے کچھ سمجھتے رہے ہوں لیکن تغزل میں ان کا مرتبہ بلند نہیں۔ اور غالب کی تو وہ گرد کو بھی نہیں پہو پنچے۔۔

غالبؔ کا شعر ہے:۔

سب کہاں کچھ لالۂ و گل میں نمایاں ہوگئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

ناسخؔ نے بالکل یہی مضمون باندھا ہے لیکن اس کے شعر میں غالب کے شعر کا سا طلسمی اور رمزی اثر نہیں پیدا ہو سکا۔ ناسخؔ کا شعر ہے

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

ناسخ نے منطقی استدلال کی کوشش کی جو روح غزل پر گراں گذرتی ہے اسی لئے اس کا شعر تاثیر سے محروم رہا اور اسلوب بیان میں کوئی بلندی یا نزاکت پیدا نہ ہوئی۔ اس کے برخلاف غالب نے دلیل کے بجائے محض دعوے سے اپنا کام نکال لیا اس لئے کہ اس کا شعر ایک مکمل استعارہ بالکنایہ ہے۔ وہ ذہن کی اشارہ سے رہبری کرتا ہے استدلال کی بھول بھلیاں میں اسے نہیں بھٹکاتا۔ رمزی اثر کی کمی کے باعث ناسخ کا شعر غالب کے شعر کے سامنے نثر معلوم ہوتا ہے۔

طرز ادا کا انحصار الفاظ اور معانی دونوں پر ہے جو کلام کے اجزا اپنے لاینفک ہیں۔ اگرچہ معانی شعر کی جان ہوتے ہیں لیکن انہیں الفاظ کی جو خارجی قبا زیب تن کرائی جاتی ہے وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

شعر کی اور خاص طور پر شعر غزل کی خارجی ہیئت و اثر کا دار و مدار الفاظ کے صحیح اور موزوں استعمال پر ہوتا ہے۔ لفظوں کو اگر صحیح استعمال کیا جائے تو وہ خود معنی بن جاتے ہیں جس طرح موسیقی میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ صورت صرف بڑے اساتذہ کے یہاں نظر آتی ہے۔ معمولاً لفظ اور معنی کی دوئی قائم رہتی ہے لیکن اس دوئی میں موزونیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر الفاظ کو شعر کا جسم اور معانی کو روح سمجھا جائے تو ضروری ہے کہ حسین و لطیف روح کا خارجی قالب کشش اور لطافت رکھتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کو نہایت ہی پر اسرار طور پر متاثر کرتے ہیں۔ انسانی روح کے احوال بڑی حد تک مادی جسم میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں اسی طرح مادی جسمانی کیفیات روح پر اپنا گہرا چھاپ لگائے بغیر نہیں رہتیں۔ بالکل یہی حال الفاظ اور معانی کا ہے۔ اگر کوئی لفظ موقع محل اور مقتضائے حال کے مناسب ہو تو اس کی تاثیر اس لفظ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی جو یوں ہی بدسلیقگی اور بے تکے پن سے استعمال کیا گیا ہو۔ چاہے آپ کے معانی کتنے ہی بلند اور گہرے کیوں نہ ہوں اگر ان کی خارجی صورت غیر جاذب نظر اور دل نشینی سے معرا ہے تو خود معانی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور تاثیر تو نام کو بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر غزل کی رمزی اور ایمائی کیفیت اس وقت تکمیل پاتی ہے جب الفاظ و معانی ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے سب مطالبوں کو پورا کرتے ہوں۔ اسی سے طرز ادا کی دل نشینی عبارت ہے جو کسی ایک خیال یا احساس حسن کے کسی ایک لمحے کو ابدی بنا دیتی ہے۔

الفاظ میں تصورات پوشیدہ ہوتے ہیں ہر تصور اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے جو ہمیں ذہنی طور پر مخصوص گرد و پیش میں لے جاتا ہے۔ غزل گو شاعر بعض دفعہ تلمیحات کے ذریعہ جو در اصل ایمائی حیثیت رکھتی ہیں ہمیں ایک

خاص فضا کی سیر کرا دیتا ہے۔ موسیٰ اور طور، شیریں اور فرہاد، لیلیٰ اور مجنوں، محمود اور ایاز کی تلمیحیں تلازمِ خیالات کی بنا پر آفرینی کے لئے زبردست محرکاتِ شعری بن جاتی ہیں۔ اور یہ صرف تلمیحات ہی تک محدود نہیں۔ ہر لفظ میں قوت اور توانائی کا خزانہ مخفی ہوتا ہے بشرطیکہ اس کو برتنے والا اس کے استعمال کا ڈھب جانتا ہو۔ بقول غالب۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ہر لفظ کی ایک جوہری انفرادیت ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی ایک لفظ سے جو خیالی تلازمات اور ذہنی متعلقات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے مرادف الفاظ سے کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک زبان کے شعر کا دوسری زبان میں جیسا ترجمہ ہونا چاہیئے ویسا نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعہ ایک لفظ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے۔ اور ذہن کو ایک خاص فضا میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ شعرِ غزل میں آہنگِ احساس اور آہنگِ سماعی کا جو ایک لطیف ربط قائم ہو جاتا ہے اس کو کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ بحر اور قافیہ اور ردیف کے سانچوں میں ڈھل کر لفظوں کی جوہری انفرادیت اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور انہیں سن کر تحت الشعور کی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض وقت خواب کی حالت میں گزشتہ واقعات اپنی جیتی جاگتی شکل میں نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ خواب کی کیفیت بھی دراصل اشارہ اور کنایہ کی کیفیت ہوتی ہے جن کی تفصیلی خلا کو حافظہ بعد میں پُر کر لیتا ہے۔

غزل کی ہر بحر اپنے اندر ایک قسم کا رمز و ایما رکھتی ہے۔ مثلاً بحرِ رمل جو سرعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اردو غزل نگاروں کے ہاں اپنی سماعی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ میں یہ بات دعوے سے تو نہیں کہہ سکتا

لیکن میرا خیال ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں اس بحر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوئی جتنی کہ اردو میں۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہ بحر ہندی بحروں سے نسبتاً قریب تھی۔ اس بحر کے اشعار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رمل مسدس مخبون مقصور

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی　　پھیڑیو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں
(مصحفی)

ناصحو آپ میں جرأت نہ رہا　　اب سمجھ کر اسے سمجھائیے گا
(جرأت)

رمل مثمن مخبون محذوف۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے
(غالب)

یہ جو کوکب بہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں
(صبا لکھنوی)

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے گر اعتبار ہوتا
(غالب)

رمل مسدس مخبون محذوف

نہ کچھ آشفتہ سری نے مارا　　کہ مجھے چارہ گری نے مارا
(مومن)

اہل تدبیر کی واماندگیاں　　آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
(غالب)

ہجر کے غم سے نہ گھبرا جرأت   اتنا ہجران نہیں رہنے کا
(جرأت)

یوں تو رو ٹھے ہیں مگر لوگوں سے   پوچھتے حال ہیں اکثر میرا
(نظام رامپوری)

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں   دو قدم کو چل رسوائی ہے
(جلیل)

بحر اور ردیف و قافیہ کے موزوں انتخاب کے علاوہ غزل گو شاعر خاص طور پر ایسے الفاظ برتتا ہے جن کے ساتھ شعری تصورات صدیوں سے وابستہ ہوگئے ہیں اور ان سے ایک خاص قسم کی ایمائی فضا کی تخلیق ممکن ہے۔ طرز ادا اور حسن سخن ان سے کوئی علیحدہ چیز نہیں۔ میں اس جگہ صرف چند اس قسم کے رمزی اور علامتی الفاظ کی مثالیں پیش کرتا ہوں جنھیں ہمارے غزل نگاروں نے محرک شعری کے طور پر برتا ہے مثلاً جنون، گریبان، زنجیر، صبح، نقاب، آشیاں، قفس، اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے اصطلاحی لفظ اور علامتیں ہیں۔ گریبان کے چاک ہونے میں عشق و شوق کی آشفتہ سری کی خاص رمزی اور ایمائی کیفیات پنہاں ہیں جنھیں ہمارے شاعروں نے محسوس کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جنون و گریبان۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی   اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
(میر)

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے   نہ رکھا مرے سر پہ بار گریباں
(میر)

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید کچھ نہ رہے   دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
(میر)

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا   بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے
(یقین)

اے دست جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی
اک جھٹکے میں لگتا ہے گریباں ٹھکانے
(مصحفی)

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا
مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط
(جعفر علی حسرت)

مرے دست جنوں کو شغلہ اچھا نکل آیا
گریباں پھٹ گیا تو دامنِ صحرا نکل آیا
(لالا اعلم)

بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
(غالب)

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے
(غالب)

نہ لڑ ناصح سے ناداں کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر
(غالب)

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی
لے چلے خار سے ہم گوشۂ داماں خالی
(آتش)

ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاجِ بہار
پہلے ہی چاک گریباں کیے بیٹھے ہیں
(داغ)

کیا کہیں آمد بہار ہوئی
کیوں گریبان پہ ہاتھ جانے لگے
(مجروح)

چاک ہو پردۂ وحشت مجھے منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ گریبان سے کچھ دور نہیں
(داغ)

چاک کر میرے گریباں کو نہ اے دستِ جنوں
نظر آتا ہے یہ کوچہ مجھے رسوائی کا
(اسیر لکھنوی)

فصلِ جنوں ہے جامہ دری کی بہار ہے ٹوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں سے دور ہے
(صبا لکھنوی)

اس کے دامن سے الجھتا ہے ادب اے دستِ شوق
یہ بھی دیوانے کوئی میرا گریبان ہو گیا
(فانی)

جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبطِ عشق کی سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا
(جگر)

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
(اصغر)

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری
(اصغر)

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہاراں کی
بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی
(بیخود دہلوی)

زنجیر :-

دل بند ہے ہمارا موجِ ہوائے گل سے اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی
(امیر)

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
(میر)

ہاتھ میں سلسلۂ زلف گرہ گیر نہیں زورِ دیوانہ ہوں میں بستۂ زنجیر نہیں
(خواجہ وزیر)

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

(غالب)

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

(غالبؔ)

ہے شوقِ یار میں ہمہ تن رنگ مضطرب موجِ بہار کیوں نہ ہو زنجیر پائے گُل

(رنگینؔ دہلوی)

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

(ذوقؔ)

زلفوں کی تری لہر نہانے میں گر آئے ہر موجۂ دریا پہ ہو زنجیر کا دھوکا

(عبداللہ خاں مہرؔ)

آگے زنجیر کو آنکھوں سے لگاتا ہے کون کس کے دل میں ہے ادب آپ کے دیوانوں کا

(شادؔ عظیم آبادی)

پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنون صحرا کو نذرِ تنگیٔ زنداں کئے ہوئے

(فانیؔ)

زنجیر پھر ہلا دی نسیمِ بہار نے پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا

(یگانہؔ)

موج :-

موج کی حرکت، بے تابی اور بے تعینی تغزل کی رنگ نگاری میں مختلف پیرائے میں ملتی ہے۔ کہیں موجِ بہار، کہیں موجِ رنگ، کہیں موجِ گُل، کہیں موجِ شراب، اور کہیں خالی موج بطور استعارہ محرکِ شعری بنی ہے

میر صاحب کا شعر ہے

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا

غالبؔ کے ہاں خاص کر لفظِ موج اصطلاحی شان کثرت سے ملتی ہیں۔ گُل میں موجِ رنگ کی شوخی فریفتہ ہونے کی چیز نہیں۔ رنگ تو اصل میں گُل کی

خونین نوائی کا نتیجہ ہے۔ حسن توجیہ ملاحظہ ہو۔

ہائے وائے نالہ لب خونیں نوائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
(غالبؔ)

محبوب کی رفتار کی شگوفہ طرازی کے ذکر میں موج کی دل نشین تشبیہ سے کیا خوب کام لیا ہے۔

موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا

موجِ بہار کی دیوانگی قابل ملاحظہ ہے کہ وہ معشوق کو درس خرام دینے چلی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو نقش پا کی طرح غیر متحرک اور پا بہ زنجیر ہونا پڑا۔

موجِ بہار تجھ کو زنجیرِ نقشِ پا ہے[1]
دیوانگی ہے تجھ کو درسِ خرام دینا
(نسخہ حمیدیہ)

---

[1] موج حرکتِ مستی کی علامت ہے جسے غالبؔ نے اپنے کلام میں طرح طرح سے استعمال کیا ہے خاص کر اس کلام میں جو بیدلؔ کے رنگ میں ہے۔ لفظ موج کو کہیں تشبیہ اور کہیں استعارہ اور کہیں استعارہ بالکنایہ کے طور پر باندھا ہے اور اس کے استعمال کی کثرت غالبؔ کے ذہنی تصور کے حرکی اور قوت آفرین ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح سیل اور سیلاب کے لفظ بھی جابجا ملتے ہیں۔ اس سے زیادہ حرکی تصورِ حیات کیا ہوگا کہ در و دیوار جیسی سکونی اور جمودی اشیاء کو بھی شاعر کی آنکھ سیلاب کا خیر مقدم کرتے وقت متحرک اور رقص کی حالت میں دیکھتی ہے۔ چاہے اس حرکت اور رقص کا نتیجہ در و دیوار کا انہدام ہی کیوں نہ ہو۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب

دوسری جگہ کہا ہے کہ عاشق کو اپنے مکان کی بربادی کی پروا نہیں۔ اس کو فکر ہے تو اس بات کی کہ سیلاب جلد آئے۔ سیلاب سے وہ ایسا مسرور ہوتا ہے جیسے کوئی جلترنگ سن رہا ہو۔ (بقیہ سلسلہ تحت صفحہ ۱۲۶ پر دیکھو)

اصغر کے شعر ہیں

یہ دیکھتا ہوں ترے زیر لب تبسم کو — کہ بحر حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو
یا زندگی تو تھی ہر موج حوادث کی — یا موت کا طالب ہوں انفاس مسیحا سے
رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکل آئی گلستاں کی
جرعۂ مے تری مستی کی ادا ہو جائے — موج صہبا تری ہر لغزش مستانہ بنے

(سلسلہ صفحہ ۱۲۵ حاشیہ)

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے — خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

شاعر کو دشت وفا میں موج سراب نظر آتی ہے جو سراسر فریب ہے اس سراب کا ہر ذرہ جوہر تیغ کی طرح تیز اور چمکدار ہوتا ہے۔

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال — ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا

لفظ موج کے استعمال کی دوسری مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ضبط گریہ گوہر آبلہ لایا آخر — پائے صد موج بطوفان کدۂ دل باندھا
ناامیدی نے بہ تقریب مضامین خمار — کوچۂ موج کو خمیازۂ ساحل باندھا
نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا
روانی ہائے موج خون بسمل سے ٹپکتا ہے — کہ لطف بے تحاشا رفتن قاتل پسند آیا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بد دماغی ہے — کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
اسد وحشت پرست گوشۂ تنہائی دل ہے — برنگ موج مے خمیازۂ ساغر ہے دم میرا
نفس موج محیط بیخودی ہے — تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا
بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار — یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
ذوق سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا — موج خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا
موج غم سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے — آستان یار سے اٹھ جائیں کیا
بسان جوہر آئینہ از ویرانی دل ہا — غبار کوچہ ہائے موج ہے خاشاک ساحل ہا

(بقیہ صفحہ ۱۲۷ کے تحت)

جگر کے ہاں ایک موج مے خانے کو بہا لے جاتی ہے۔ کہتے ہیں

میکشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں
آج اک موج بہا لے گئی میخانے کو

سلسلہ صفحہ ۱۲۶

بسکہ جوشِ گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا — چاکِ موجِ سیل تا پیراہنِ دیوانہ تھا
دل دردِ رکابِ صحرا خانہ خرابِ صحرا — موجِ سرابِ صحرا عرضِ خرابِ صحرا
ساقی نے از پئے گریباں چاکیٔ موجِ بادۂ ناب — تارِ نگاہِ سوزنِ مینا رشتۂ خطِ جام کیا
گر وہ شوخ ہے طوفاں طرازِ شوقِ خونریزی — گردِ بحر کمانِ بالیدہ موجِ تیر ہے پیدا
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب — دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن — سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے — سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر — موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

عام طور پر ہمارے شاعروں کے یہاں عیش و طرب ایسی سکونی حالت سے عبارت ہوتا ہے جس میں دل کی ساری آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس غالب کے یہاں عیش و طرب کا تصور بھی سکونی نہیں بلکہ حرکی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اس نے بتایا ہے کہ طوفانِ عیش کے گرداب کا اگر تجزیہ کریں تو اس میں موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا اور موجِ شراب کے اجزا ملیں گے۔

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو — موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز — دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

مندرجہ ذیل غزل میں رنگ اور موج دونوں محرکاتِ شعری کو معنوی قوت اور دلفریبی سے ایک دوسرے میں سمو دیا گیا ہے۔ ہر شعر سے مستی ٹپکتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نشۂ رنگ نے عالمِ مستی کو زندگی کی حرکت میں تبدیل کر دیا ہے۔ موجِ شراب کبھی تو رگِ تاک میں خون بن کر دوڑتی پھرتی ہے اور کبھی رنگ کے شہپر لگا کر ہنگامۂ ہستی میں بال کشائی کرتی ہے۔ رنگ کی

(بقیہ دیکھو صفحہ ۱۳۸)

جگر کے کلام میں لفظ موج کی ایمائی جھلکیاں جا بہ جا دکھائی دیتی ہیں۔

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا
بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے

(سلسلہ حاشیہ ص ۱۲۷)
مناسبت سے بال کشائی یا اڑنا لطف سے خالی نہیں۔

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشہ کے پردہ میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہے طوفانیٔ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

کون آیا جو چمن بیتابِ استقبال ہے
جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیٔ رفتارِ باغ

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

ہے فروغِ ماہ سے ہر موج ایک تصویرِ خاک
سیل سے فرشِ کتاں کرتے ہیں تا ویرانہ ہم

گر بعدِ مرگ وحشتِ دل کا گلہ کروں
موجِ غبار سے پرِ ریگِ دشت واکروں

گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو
مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں

بے دماغی حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں
ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

مبادا بے تکلف فصل کا برگ و نوا گم ہو
اگر طوفانِ مے میں جنبشِ موجِ صبا گم ہو

(بقیہ حاشیہ ۱۲۹ پر)

ترے جلووں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے
(جگرؔ)

(بسلسلہ حاشیہ نمبر ۱۲۶)

نہیں جز دردِ تسکین گوشہائے دیدۂ دل
کہ موجِ گریہ میں صد خندۂ دندان نما گم ہو

بلاگردانِ تمکینِ بتان صد موجۂ گوہر
عرق بھی جن کے عارض پر بہ تکلیفِ حیا گم ہو

ہے وحشتِ جنوں کی بہار اس قدر کہ ہے
بالِ پری بہ شوخیٔ موجِ صبا گرد

میکدے میں نہ دل افسردگیٔ بادہ کشاں
موج سے آتش خطِ جام ہے پر یا ماندہ

ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے
یک عمر نازِ شوخیٔ عنوان اٹھائیے

نہ آشنا پرستشِ تیغِ جفا پر ناز فرمائے
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

از خود گذشتگی میں خموشی پہ حرف ہے
موجِ غبارِ سرمہ ہوئی ہے صدا مجھے

ہاں آب و دانہ موسمِ گل میں حرام ہے
زنار واگسستہ ہے موجِ صبا مجھے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بے باکیٔ مستان
نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی

ہجمانِ زندانِ بر جستانِ دلہائے پریشاں ہے
طلسمِ شش جہت یک حلقۂ گردابِ طوفاں ہے

زجبیں رکھتی ہے شرمِ قطرہ سامانی مجھے
موجِ گردابِ حیا ہے چینِ پیشانی مجھے

ہمارا دیکھنا گر تنگ ہے سیرِ گلستاں کو
شرارِ آہ سے موجِ صبا دامانِ گلچیں ہے

چشمِ خوباں مے فروشِ نشۂ زارِ ناز ہے
سرمہ گویا موجِ دردِ شعلہ آواز ہے

دیوانگی ہے تجھ کو درسِ خرام دیتا
موجِ بہار یکسر زنجیرِ نقشِ پا ہے

دریائے مے ہے ساقی لیکن خمار باقی
تا کرچہ دادن موجِ خمیازہ آشنا ہے

یک رنگ ہے نوائے صد دعوتِ تیقن
طوفانِ نالۂ دل تا موجِ بوریا ہے

روانی موجِ مے کی گر خطِ جام آشنا ہووے
نکلے کیفیت اس سحرِ تبسم کی عبارت کی

ہے کمندِ موجِ گل آشفتہ فتراکی اسدؔ
رنگ یاں پر ہے سوارِ توسنِ چالاک ہے

ساقی کی فیض مست نگاہی کے میں نثار ... ایک ایک موج مے کو رگ جاں بنا دیا
(جگر)

کیسا قطرہ، کیسا دریا، کس کا طوفان، کس کی موج
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے (جگر)

"موج ہوائے دردِ دل" کی ترکیب اور اس کی معنویت قابل داد ہے۔
جس طرف وہ شوخ نظریں اُٹھ گئیں ‏ ‏ ‏ ‏ لے اڑی موج ہوائے دردِ دل (جگر)

عہد حاضر کے چند دوسرے شاعروں کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔
سکونِ خاطر بلبل ہے اضطراب بہار ‏ ‏ ‏ ‏ نہ موج بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا
(فانی)

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے۔
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں
(فانی)

لب دریا سے غرض ہے نہ تہِ دریا سے ‏ ‏ ‏ ‏ موج و گرداب سے ہے دست و گریباں ہونا
(یگانہ)

(سلسلہ حاشیہ ۱۲۹)۔

بیگانگیٔ خو جا موج رم آہو ہا ‏ ‏ ‏ ‏ دام گلۂ الفت زنجیرہ پشیمانی
درس نیرنگ ہے کس موج نگہ کا یارب ‏ ‏ ‏ ‏ غنچہ صد آئینہ زانوئے گلستاں زدہ ہے
مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے ‏ ‏ ‏ ‏ موج شراب یک مژہ خواب ناک ہے
اس بیاباں میں گرفتار جنوں ہوں کہ جہاں ‏ ‏ ‏ ‏ موجۂ ریگ سے دل پائے بہ زنجیر آوے
لے ہرزہ روی دشت تمکینِ جنوں کھینچے ‏ ‏ ‏ ‏ تا آبلہ محمل کش موج گہر آوے
بیتابی یاد دوست ہمرنگ تسلی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ موج تپش مجنوں محمل کش لیلیٰ ہے
مینائے مے ہے سرو نشاط بہار سے ‏ ‏ ‏ ‏ بال تدرو جلوۂ موج شراب ہے
ہے موج زن اک قلزم خوں کاش یہی ہو ‏ ‏ ‏ ‏ آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
خود نشاط و سرخوشی ہے آمد فصل بہار ‏ ‏ ‏ ‏ آج ہر سیل رواں عالم میں موج بادہ ہے

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکل آئی گلستاں کی

(اصغر)

پردہ و نقاب :-

نقاب خود رمز و طلسم کی کیفیت پیدا کرنے والی چیز ہے۔ چنانچہ غزل کی رمز نگاری کے لئے یہ لفظ اور اس کے ساتھ جو مفہوم وابستہ ہے وہ خاص مناسبت رکھتا ہے۔ اُردو غزل گو شاعروں کے دیوان حجاب و نقاب کی مضمون آفرینیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس مضمون میں معاملہ بندی اور واقعہ گزاری کی جو جزئیات پیدا کی گئی ہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کا سچا نقش اور تحلیل نفس کے ماہر کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا — کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ

(میر)

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

(غالب)

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا — جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

(غالب)

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

(غالب)

ایک جگہ غالب اپنے محبوب کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہم سے خصوصیت سے منہ نہ چھپاؤ ورنہ لوگ خواہ مخواہ متوجہ ہوں گے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اگر محبوب بیگانہ وار بے حجاب رہے تو دوسروں پر محبت کا حال نہیں کھل سکتا۔ حسنِ طلب کی بلاغت میں ایمائی اثر آفرینی کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے کہ محبوب غیر کے ساتھ بے حجابی سے

پیش آتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کے ساتھ اسے کوئی خصوصیت نہیں، لیکن قصہ اس کے خلاف ہے۔ یہ اظہار رشک کی بڑی لطیف صورت پیدا کی ہے۔

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگا دی نقاب میں
(شیفتہ)

اس روئے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب
نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی
(داغ)

نگاہِ شوق نے کیا خواب میں نہیں دیکھا
نیا حجاب ہے چھپتے ہو روبرو ہو کر
(داغ)

در پردہ جوشِ حسن نے بے پردہ کر دیا
ٹوٹی گرہ تڑاق سے بند نقاب کی
(داغ)

داغ کا دعویٰ ہے کہ محبوب چاہے چھپنے کی کتنی کوشش کرے لیکن وہ نہیں چھپ سکتا اس لئے کہ میری نظر میں کون و مکاں کے جلوے سمائے ہوئے ہیں۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

باوجود حجاب کے نگہ شوق میں محبوب کا جلوہ موجود رہتا ہے۔ اس شعر میں اثبات و نفی سے حسن کلام کے جوہر کو خوب چمکایا ہے۔

اف رے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے
اف رے پردہ کہ وہ ہے اور دل حیراں میں نہیں
(داغ)

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے حجاب
حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خوب تھا
(جلال)

وہ میں کہ دیکھ رہا ہوں نقاب بن کے تجھے
وہ تو کہ چھوڑ دیا ہے نقاب کر کے مجھے
(وقار رامپوری)

وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری
پھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

(حسرت)

ہجوم حسن کے پردے نقاب کے بدلے
وہ بے نقاب ہوئے بھی تو کیا ہوا کہ رہے

(حسرت)

کلیم برق طور تھی کہ تار تھا نقاب کا
جمال بے حجاب تھا کہ جلوہ تھا حجاب کا

(فانی)

نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا
جمال خود رخ بے پردہ کا نقاب ہوا

(فانی)

اس کے جلوے کی ادا ایک شان مستوری بھی ہے
عین عرفان مجبوری پر بھی سراپا دید ہوں

(اصغر)

مجھ کو خبر رہی نہ رخ بے حجاب کی
تھیں خود نمود حسن میں شانیں حجاب کی

(اصغر)

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا

(جگر)

مری نظر نہ ہوئی آپ کا حجاب ہوا
اسی سے دل کا ہر اک نقش جلوہ تاب ہوا

(جگر)

قفس اور آشیانہ :-

قفس اور آشیانہ کی رمزی علامت میں اردو غزل گو شاعروں نے جدت ادا کا حق ادا کیا ہے یہ محض جدت ادا اور حسن تخیل ہے جس کی وجہ سے فرسودہ مضمون میں بھی تازگی اور شگفتگی آجاتی ہے۔ لفظ کے معمولی معنی سے زیادہ اہمیت اس بات کو ہے کہ اس کے برتنے والے کے ذوق وجدان میں اس کا کیا مفہوم ہے۔ قفس اور آشیانے کے معمولی لفظوں کو دیکھئے۔ ہمارے شاعروں نے کس طرح علامتی طور پر برتا ہے۔

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

(میر)

کیسا کیسا قفس سے سر مارا — موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے

(میر)

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

(غالب)

کبھی قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

(مومن)

خوشا قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پردے

نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوار گلشن تک

(نسیم دہلوی)

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

(اصغر گونڈوی)

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے — ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے

(اصغر گونڈوی)

گلچیں برا کیا جو یہ تنکے جلا دیئے — تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

(ثاقب لکھنوی)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(ثاقب لکھنوی)

برق کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر — آشیاں کے ساتھ آنچ آئی مری حسرت پہ بھی

(ثاقب لکھنوی)

شاید میں درخور نگہ گرم بھی نہیں — بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

(فانی)

میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی
اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
(فانی)

فصل گل میں اجڑا تھا شاید آشیاں اپنا
فصل گل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا!
(فانی)

ہماری شاعری میں اسی طرح کے بیسیوں علامتی الفاظ ہیں جو باوجود پیش پا افتادہ اور بظاہر فرسودہ ہونے کے حسن استعمال سے ایمائی اور قلبی اثر کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دراصل کسی زبان کا کوئی لفظ کبھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوتا۔ نئے لفظ اور نئی بندشیں بیکار ہیں اگر ان میں ایمائی اثر آفرینی نہ ہو۔ اور اگر شاعر ایمائی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ پرانے اور رسمی لفظوں میں نئی جان ڈال دے گا۔ مثلاً چند رسمی لفظ یہ ہیں۔ رہرو اور منزل، کشتی اور ساحل، شمع اور پروانہ، جلوہ اور تماشا وغیرہ ان کی مثالیں دینے میں بڑی طوالت ہوگی۔ ان سب لفظوں کو ہمارے شاعر دو سو برس سے برت رہے ہیں۔ لیکن آج بھی ہمیں ان میں عجیب و غریب لطف ملتا ہے یہ اعجاز ہے قادر الکلامی کا۔ قادر الکلام شاعر لفظوں کو قاتحانہ انداز میں برتتا ہے، وہ اگر کسی ایسے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہے جسے اس کا کوئی پیشرو پہلے برت چکا ہے تو باوجود اس کے وہ اپنی شخصیت کے اثر سے اس میں تازگی اور ندرت پیدا کردے گا۔ کوئی لفظ اور کوئی مضمون محض پہلے برتے جانے کی وجہ سے فرسودہ نہیں ہوجاتا۔ اچھا شاعر اپنے نفس گرم سے مضمحل اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک سکتا ہے۔ غزل گو شاعر کے لئے لفظ محض علامتیں ہیں جو ذہن کو حقیقت کی طرف منتقل کرتی ہیں۔ تغزل کا یہی طلسم یا اعجاز ہے جو اس صنف سخن کو ہمیشہ باقی رکھے گا۔ اور جو شاعر اس قسم کا جادو جگا سکے گا اسی کو استادی کا فخر نصیب ہوگا۔ کوئی مضمون کسی شاعر کی ملکیت نہیں ہوجاتا۔ وہ اسی کا ہوجاتا ہے جو اسکو اچھی طرح برت سکے۔ اس باب میں تقدم و تاخر کوئی معنی نہیں رکھتے۔

اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو پہلے برتا اور دوسرے شاعر نے اسی کو کچھ عرصے بعد باندھا اور اپنے پیشرو کے مضمون کے مقابلے میں اس کو زیادہ بلند کر دیا یا اس میں کوئی ندرت پیدا کر دی تو وہ مضمون اس کا ہو جائیگا۔ نظیری کا مشہور شعر ہے۔

بوئے یارِ من ازیں سست وفا می آید　　گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا نے تھوڑے سے تصرف سے مضمون کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مومن خاں کا شعر ہے

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا　　اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

غالب نے اسی مضمون کو دوسری طرح سے پیش کیا ہے اور اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت　　یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

سودا کا شعر ہے۔

ساقی ہے یک تبسم گل موسم بہار　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

غالب نے اسی مضمون میں کیا طرفہ کاری دکھائی ہے۔

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی

غالب کا شعر ہے۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو　　اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

ذوق نے اسی مضمون کو زیادہ بلیغ انداز میں ادا کیا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ حضور یار میں انسان ہی نہیں بلکہ غیر جاندار اشیا بھی رعب حسن سے متاثر ہوتی ہیں۔

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

داغ نے اسی مضمون کو اپنی شوخ بیانی سے چار چاند لگا دیئے کیا خوب کہا ہے

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں　　ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

غالب نے شوق پابوسی کے مضمون پر معاملہ بندی کا نہایت اعلیٰ درجہ کا شعر کہا ہے۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر — ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائیگا

حسرت نے اسی مضمون کو اور زیادہ نکھار دیا ان کا شعر ملاحظہ ہو۔

وہ خواب ناز میں تھے اور نہ تھے شوق پابوسی
نہ سمجھی پستیٔ ہمت تری اس لطف ایما کو

اگرچہ طرز ادا معنوی خصوصیات سے عبارت ہوتا ہے لیکن اس کی تاثیر لفظی استعمال کے بعض مخصوص طریقوں سے پیدا ہوتی ہے۔ در اصل غزل ایک طرح کا طلسم ہے۔ غزل نگار شاعر اس طلسم کے بھیدوں کو جانتا ہے۔ اس کو لفظوں کے استعمال کے ذریعہ ایسی قوتیں عطا کی گئی ہیں جنھیں دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔ شاعرانہ لفظ انسانی ذہن کو اس کی بندھنوں سے رہا کرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر اثر آفرینی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ بعض ایسے لفظ ہیں جن سے رمزی کیفیت کی اثر آفرینی ایک خاص صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً وہ لفظ جن سے رنگ و بو کے محرکات کی تخلیق ہوتی ہے اور وہ غزل میں خاص تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ غزل گو شاعر پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نشہ کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ جس طرح نشہ کی حالت میں رنگ اور بو دونوں کی شدت زیادہ محسوس ہوتی ہے اسی طرح داستان شوق بیان کرنے والے پر ان دونوں محرکات کا اثر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ تحلیل نفسی کا ماہر اس کی چاہے کچھ بھی توجیہ پیش کرے لیکن توجیہ سے حقیقت کی تاثیر و تاثر تو نہیں بدلتے۔ رنگ اور بو دونوں میں بے پناہ ایمائی اور طلسمی خاصیت پائی جاتی ہے جو در اصل اندرونی بہار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اردو کے غزل گو شاعروں نے اس لطیف حقیقت کو ہر زمانے میں محسوس کیا۔ جدید شاعروں میں حسرت کے یہاں اس محرک شعری کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ بعض دوسروں کے یہاں بھی یہ احساس ملتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

گر گل ہے گاہ رنگ تمہے باغ کی ہے بو — آتا نہیں نظر وہ طرحدار ایک طرح
(میر)

دیکھ کے دست و پائے نگارین پیچھے بے رہ جاویں نہ کیوں
منہ بولے ہے یارو گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی

(میر)

کیا کوئی اس کے رنگوں گل باغ میں کھلا ہے — شور آج بلبلوں کا جاتا ہے آسماں تک

(میر)

مشک منبر طبلہ طبلہ کیوں نہ ہو کیا کام ہے — ہم دماغ آشفتہ ہیں زلف عنبر کے تری

(میر)

نکہت خوش اس کے پنڈے کی سی آئی ہے مجھے — اس سبب گل کو چمن کے دیر میں نے بو کیا

(میر)

گل پیرہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک سے — کس مرتبہ میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ

(میر)

موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم — حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

(میر)

میر صاحب نے گل کے رنگ و بو دونوں کو دنیا کی ناپائداری اور اس کی بے وفائی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور ان سے شعری محرک کا کام لیا ہے۔ شعر ہے۔

بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

ایک دوسرے شعر میں گل کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بو سے اپنی بے خودی کے پیدا ہونے کی توجیہ کی ہے کہ اس سے کسی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ گویا بو انتقال ذہنی کے لئے ایک وسیلے کا کام دیتی ہے۔
شعر ہے۔

سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی — کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی

اسی مضمون پر مصحفی کا شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں   ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ

جرأت کے اشعار ہیں۔

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی   بھری سہاگ کی تسپر یہ بو دلہن کی سی

بو محبت کی نسیم آہ سے کھلتی ہے وہاں   گرچہ سو پردوں میں جوں غنچہ چھپا لیجائیے

سنگھا بدن کو کہا کس مزے سے چتون میں   ربودگی یہ کسی عطر کی بھی بو میں نہیں

ٹک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو آب مجھے   جوں بوئے گل کرے ہے زخود رفتہ بو مجھے

جعفر علی حسرت کا شعر ہے

بہار ہو چکی اور شور بلبلوں کا گیا   مرے دماغ سے اس گل کی ہائے بو نہ گئی

غالب کے خیال میں پھول رنگ کے نشہ سے مست ہو کر اپنی بند قبا حسینوں کی طرح کھول دیتا ہے۔ حسن تعلیل لاجواب ہے۔

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل   مست کب بند قبا باندھتے ہیں

غالب کے اسی مضمون پر دوسرے شعر ملاحظہ ہوں۔

میں نے جنوں میں کی جو اسدؔ التماسِ رنگ   خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

شاعر کو اندیشہ ہے کہ کہیں رنگ کی گرمی چمن کی تباہی کا موجب نہ بن جائے سایۂ گل میں اسے داغ اور نکہت گل میں موجِ درد نظر آتی ہے۔ رنگ و بو کے دونوں محرکات شعری کو اس شعر میں ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے۔

سایۂ گل داغ و جوشِ نکہتِ گل موجِ درد
رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں سلہ
(نسخۂ حمیدیہ)

ظفر کا شعر ہے:
شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی چمک پھر ویسی ہی
جوڑے کی گندھاوٹ قہرِ خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہی

سلہ ۔ بمقابلہ بو غالب رنگ کے شعری محرک سے بہت زیادہ متاثر ہے ۔ یہ بات اس کے دو مخصوص رجحانوں کی آئینہ دار ہے ۔ ایک تو اس کے احساس و ذہن کی لطافت اور دوسرے اس کا زندگی کا حرکی نقطۂ نظر ۔ رنگ میں بہ نسبت بو زیادہ لطافت ہے ۔ رنگ کا احساس روشنی کی موجوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے ۔ گویا ہماری نظر کو کسی مادی توسط کا سہارا نہیں لینا پڑتا ۔ برخلاف اس کے بو میں مادہ کے ذرات فضا کے ذریعہ ہم تک پہونچتے ہیں ۔ چونکہ رنگ امواج کے توسط سے ہماری نظر تک پہونچتا ہے اس لئے وہ سراسر حرکت ہے اور بو کی طرح اس میں مادیت مطلق نہیں ۔ فطرت میں ہر طرف رنگ ہی رنگ ہے ۔ اگر کائنات کو صرف عالم رنگ کہیں تو بیجا نہ ہوگا ۔

اس پر تعجب نہیں کہ رنگ کی طلسماتی دلفریبی نے غالب کو متاثر کیا ۔ اس کے دیوان میں ایسے شعر کثرت سے ہیں جن میں بہ شعری محرک ملتا ہے جو اس کی لطافت طبع پر دال ہے ۔ لیکن یہ اشعار زیادہ تر بیدل کے رنگ میں ہیں ۔

شررِ فرصت نگہ سامانِ یک عالم چراغاں ہے
بقدر رنگ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

دریغ اے ناتوانی ورنہ ہم نا آشنایاں نے
طلسمِ رنگ میں باندھا تھا عہد استوار اپنا

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا
چراغِ گل سے ڈھونڈھے ہے چمن میں شمع خار اپنا

ناتوانی ہے تماشائیِ عمرِ رفتہ
رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا

رند کہتا ہے:-

خال عارض بہ گماں عنبر اشہب کا ہوا
سونگھ کر زلف کی بو مشک ختن یاد آیا

زکی مرادآبادی کا شعر ہے:-

عشق ہے رنگ حنا کو یہ کس خوبی سے
بوسہ لیتا ہے ترے ہاتھ کی تہ پائی کا

محرک بو کا مضمون تسنیم لکھنوی کے یہاں ملاحظہ ہو۔

چارہ گر سودا ہے بوئے زلف برہم کا مجھے
قید کر زنجیر موج نکہت برباد میں

بسلسلہ حاشیہ ص ۱۴۱

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

بہار رنگ خون گل ہے سامان اشک باری کا
جنون برق نشتر ہے رگ ابر بہاری کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہوتا

نشہ میں گم کردہ رہ آیا وہ مست فتنہ خو
آج رنگ رفتہ دور گردش ساغر ہوا

عیش بازی کدۂ حسرت جاوید رسا
خون آئینہ سے رنگیں ہے دبستاں میرا

غم مجنوں عزادار ان لیلیٰ کا پرستش گر
خم رنگ سیاہ از حلقہ ہائے چشم آہو تھا

رات دن گرم خیال جلوۂ جانانہ تھا
رنگ روئے شمع برق خرمن پروانہ تھا

وصل میں بخت رسائے سنبلستاں گل کیا
رنگ شب تہ بندی دود چراغ خانہ تھا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

شکست رنگ کی لائی سحر شب سنبل
یہ زلف یار کا افسانہ ناتمام ہا

سحر کہ باغ میں وہ حیرت گلزار ہو پیدا
اڑے رنگ گل اور آئینۂ دیوار ہو پیدا

بسکہ شرم عارض رنگیں سے حیرت جلوہ ہے
ہے شکست رنگ گل آئینہ پرداز نقاب

ہے بہاراں میں خزاں پرور خیال عندلیب
رنگ گل آتش کدہ ہے زیر بال عندلیب

(بقیہ سلسلہ دیکھو ص ۱۴۳)

برق نے رنگ و بو کے مضمون کو اس طرح پیش کیا ہے۔

نکہت زلف سے اے برق معطر ہیں دماغ
دمِ عیسیٰ ہیں مجھے بادِ صبا کے جھونکے

بسلسلہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱

حیرت حسن چمن پیرا ہے تیرے رنگِ گل
بسمل ذوق پریدن ہے پر و بالِ عندلیب

عمر میری ہو گئی صرف بہارِ حسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

ہر غنچہ و گل صورتِ یک قطرۂ خوں ہے
دیکھا ہے کسی کا جو حنا بستہ سرانگشت

تا ز لطفِ عشق باوصف توانائی عبث
رنگ ہے سنگِ جہاں دعوائے مینائی عبث

گل و صبح والی غزل پوری کی پوری رنگ و بو کے محرکات کے تحت لکھی گئی ہے لیکن بو سے زیادہ رنگ کا محرک غالب ہے۔ رنگ کے ساتھ گل اور صبح کی تازگی بھی معنوی محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

دعوئے عشق بتاں سے بہ گلستاں گل و صبح
ہیں رقیبانہ بہم دست و گریباں گل و صبح

ساقِ گل رنگ سے اور آئینۂ زانو سے
جامہ زیبوں کے سدا ہیں تہِ داماں گل و صبح

وصل آئینہ رخاں صحن چمنستان یکسر
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسد
غفلت آرائی یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

موقوف کیجئے یہ تکلف نگاریاں
ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند

بزم داغِ طرب و باغ کشادِ پرِ رنگ
شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند

ہوئی ہے بسکہ صرفِ مشقِ تمکیں بہارِ آتش
بہ اندازِ حنا ہے رونقِ دستِ چنارِ آتش

ہوں پرِ طاؤس جو ہر تختہ مشقِ رنگ ہے
بسکہ ہے وہ قبلۂ آئینہ محوِ اختراع

آتشِ رنگِ رخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سردِ صبا سے گرمیٔ بازارِ باغ

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

گرچہ ہے یک بیضۂ طاؤس آسا تنگ دل
ہے چمن سرمایۂ بالیدن صد رنگ دل

مضمون وصل ہاتھ نہ آیا مگر اسے
اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

(بقیہ دیکھو صفحہ ۱۴۳)

ملتا ہے بوئے گل سے نشان بوئے یار کا — نقشہ ہے بوئے گل میں گل روئے یار کا
موج نسیم سے نہ پریشاں ہو کیوں دماغ — دیوانہ ہوں میں نکہت گیسوئے یار کا
(ذوق)

بسلسلہ حاشیہ ۱۴۲

کس جرم سے ہے چشم تجھے حیرت قبول — برگ حنا مگر مژۂ خوں فشاں نہیں

اس شعر میں رنگ اور بو دونوں کے معنوی محرکات کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ نکہت گل کو موجِ درد کی تشبیہ سے ظاہر کرنا اور رنگ میں گرمی محسوس کرنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

سایۂ گل داغ و جوش نکہت گل موج درد — رنگ کی گرمی ہے تاراج چمن کی فکر میں
خیال سادگی ہائے تصور نقش حیرت ہے — پر عنقا پہ رنگ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں
ضعف نے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کہ دامن میں نہیں
اٹھاوے کب وہ جانِ شرم تہمت قتل عاشق کی — کہ جس کے ہاتھ میں مانند خوں رنگ حنا گم ہو
رہن خاموشی میں ہے آرائش بزم وصال — ہے پر پرواز رنگ رفتۂ خوں گفتگو
رنگ طرب ہے صورت عہد وفا گرو — تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو
عرض بساط انجمن رنگ مفت ہے — موج بہار رکھتی ہے اک بوریا گرو
برق آبیار فرصت رنگ دمیدہ ہوں — جوں نخل شمع ریشہ میں نشو و نما گرو
بیتاب سیر دل ہے سر ناخن نگار — یاں لعل ہے بہ آتش رنگ حنا گرو

حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ — غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گماں ہے
واں رنگ ہا بہ پردۂ تدبیر ہیں ہنوز — یاں شعلۂ چراغ ہے برگ حنا مجھے
میں نے جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ — خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے
ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
فرصت آرام غش ہستی ہے بحران عدم — ہے شکست رنگ امکاں گردش پہلو مجھے
بہ نقش ظاہری رنگ کمال طبع پنہاں ہے — کہ بہر نہ جائے دل زبان لال تنداں ہے

(بقیہ دیکھو تحت صفحہ ۱۴۴)

مٹی سرشت پاک میں یہ کس چمن کی ہے　　پھولوں میں بو تمام تمہارے بدن کی ہے

رنگ اس شوخ کا شوخی سے چُوا پڑتا ہے　　پاؤں جس خاک پہ رکھتا ہے حنا ہوتی ہے

بسلسلہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳

تصور بہرِ تسکینِ طپیدن ہائے طفلِ دل　　بباغِ رنگ ہائے رفتہ گلچیں تماشا ہے
غضب شرم آفریں ہے رنگ ریزی ہائے خودبینی　　سفیدی آئینہ کی پنبۂ روزن نہ ہو جائے
صبح ناپیدا ہے کلفت خانۂ ادبار میں　　توڑتا ہوتا ہے رنگ یک نفس ہر شب مجھے
نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب　　شیشۂ مے سروِ سبز جوئبارِ نغمہ ہے
تاکجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن　　چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے
یاد رکھیے ناز ہائے التفاتِ اولیں　　آشیانِ طائرِ رنگِ رسا ہو جائیے
حیرتِ طپیدن ہا خوں بہائے دیدن ہا　　رنگِ گل کے پردے میں آئینہ پرفشاں ہے
تماشا ہے کہ ناموسِ وفا رسوائے آئیں ہے　　نفس تیری گلی میں خوں ہوا اور باز رنگیں ہے
سودائے خیال ہے طوفانِ رنگ و بو　　یاں ہے کہ داغِ لالہ دماغِ بہار ہے
چمن زارِ تمنا ہو گئی صرفِ خزاں لیکن　　بہارِ نیم رنگ آہِ حسرت ناک باقی ہے
خدایا خوں ہو رنگِ امتیاز اور نالہ موزوں ہو　　جنوں کو تہمتِ بیتابی ہے تکلیفِ شکیبائی
صبح دم وہ جلوہ ریزِ بے نقابی ہو اگر　　رنگِ رخسارِ گل خورشید مہتابی کرے
شفق بدعوئے عاشق گواہِ رنگیں ہے　　کہ ماہ دزدِ حنائے کفِ نگاریں ہے
کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ　　خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
شرمِ طوفانِ خزاں رنگِ طرب گاہِ بہار　　گلِ مہتاب بہ کفِ چشمِ تماشائی ہے

بہارِ نالہ اور رنگینیٔ فغاں کی ترکیبیں اور استعارے بالکل انوکھے ہیں شاعر نے ان میں سحر و طلسم کے خزانے چھپا دیئے ہیں۔

طراوت اثر ایجادیٔ اشکِ سو　　بہارِ نالہ و رنگینیٔ فغاں مجھ سے
دردِ آئینہ کیفیت صد رنگ ہے یارب　　خمیازۂ طرب ساغرِ زخمِ جگر آئے
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے　　تماشا ہے کہ رنگِ رفتہ برگردیدنی جانے

بڑھ گیا اور جنون بو جو تمہاری آئی　　بن کے زنجیر بلا پائے بہاری آئی

ممکن نہیں کہ رنگ جمے آفتاب کا　　رنگ بہار عارض زیبا کے سامنے

داغ کے اشعار ہیں :-

کیا صبا کو چۂ دلدار سے تو آتی ہے　　مجھ کو اپنے دل گم گشتہ کی بو آتی ہے

غرور کیوں نہ ہو جب دل سی چیز ہاتھ لگے　　بشاد ماغ تری زلف مشک بو نے کیا

اس کی گلی سے آئے کیوں نکہتِ زلف لائے کیوں
مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض

جلال نے بھی اسی مضمون کے شعر کہے ہیں۔
زلف یار کا تصور جنون شوق کے لئے کس طرح سامان بہار مہیا کرتا ہے۔
بعد مدت اے جنون تیری بہار آنے کو تھی　　ہوش تھے جانے کو بوئے زلف یار آنے کو تھی
جلال نے ایک جگہ بو کو جذباتی محرک کی حیثیت سے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ تحلیل نفسی کے قائل ممکن ہے اس سے جنسی طلب و تکمیل کی توجیہ کریں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو بھی شعر کی اعلیٰ شعریت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے :-

---

ل امام غزل حافظ شیرازی کے اشعار میں بھی بو کا شعری محرک جلوہ جا ملتا ہے۔ نکہت زلف کے متعلق لسان الغیب سے سنیے۔

صبا تو نکہت آن زلف مشکبو داری　　بیادگار بمانی کہ بوئے او داری
زمانہ گر بہ مشک ختن دہد برباد　　فدائے تو کہ خط و خال مشکبو داری
بہ بوئے زلف و رخت می روند و می آیند　　صبا بہ غالیہ سائی و گل بہ جلوہ گری

وحشی وہ ہیں کہ ہم کو لگا لائی بوئے گل — پوچھی بہار میں نہ کسی نے چمن کی راہ

ایک دوسرے شعر میں گلِ داغِ عشق میں رنگ و بو کے محرک کو اس طرح محسوس کیا ہے :-

کیا پھول ہے جلال گلِ داغِ عشق بھی — گہ اس کی بو سے مست ہوں گہ غش ہوں رنگ پر

دوسری جگہ کہتے ہیں :-

ترے وعدوں نے بدلیں صورتیں بے اعتباری کی
کبھی بوئے وفا ٹھہرے، کبھی رنگ حنا ٹھہرے،

بادِ صبا کی بد دماغی کی شکایت ملاحظہ طلب ہے :-

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو — پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا[1]

حسرت نے رنگ و بو کے رمزی اور حاضراتی اثر (ان ووکیشن) کو جس خوبی سے اپنے عاشقانہ کلام میں استعمال کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ رنگِ حیا، خوشبوئے حیا، خوشبوئے حسن، خوشبوئے آرزو، بوئے وفا اور خوشبوئے دلبری کے استعاروں اور رمزی علامتوں میں بلا کی ایمائی قوت ہے جس سے حسرت نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

حسرت کے ہاں خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو عشق شیریں کار کا کرشمہ ہے۔

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے — یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہے

---

[1] میر صاحب کو بھی بادِ صبا کی بد دماغی کی شکایت ہے فرماتے ہیں۔

لگ نکلی ہے کسو کی مگر بکھری زلف سے — آنے میں بادِ صبح کو یاں اک دماغ ہے
شاید اس زلف سے لگی ہے میر — باؤ سے اک دماغ نکلے ہے

اب رنگ و بو کے استعاروں کی رنگا رنگی ملاحظہ کیجئے۔

جاں فزا تھی کس قدر یارب ہوائے کوئے دوست
بس گئی جس سے مشام آرزو میں بوئے دوست
ہو چکی اب ہم گرفتاراں فرقت کو نصیب
آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردہ گیسوئے دوست

اس پوری غزل میں بو کے شعری محرک کی پیشیں موجود ہیں۔

جس نے سونگھی ہو تری زلف سیہ کار کی بو ۔ کیا پسند آئے اسے نافہ تاتار کی بو
آج تک جس سے معطر ہے محبت کا مشام ۔ آہ کیا چیز تھی وہ پیرہن یار کی بو
بے پئے مست کئے دیتی ہے نے پیرہن ۔ مئے پرستوں کو ترے ساغر سرشار کی بو
ہوس انگیز تمنا ہے لب یار کا رنگ ۔ روشنی بخش نظر ہے مئے گلنار کی بو
دلدہی سے بھی تری بڑھ کے ہے کچھ ذوق فزا ۔ دلنوازی میں ترے نامۂ دلدار کی بو

ہجر ساقی میں یہ حالت ہے کہ اب جائے سرور ۔ بوئے مئے وجہ غم بادہ کشاں ٹھہری ہے

بلریز نور ہے دل حسرت زہے نصیب ۔ اک حسن مشک فام کے شوق تمام کا

آشنا ہو کے بوئے یار سے ہم ۔ سخت بیزار ہیں قرار سے ہم

میں اس طرۂ زلف مشکیں کی حسرت ۔ پئے غارت جان دوتا چاہتا ہوں

گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی مراد ۔ آہ وہ نکہت برباد کہ برباد نہیں

رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

یاد شہر و کوئے یار آنے لگی　　آرزو کو بوئے یار آنے لگی
شوق مخمور ہوس ہونے لگا　　نکہت گیسوئے یار آنے لگی

پیرہن کوئی اتارا نہ انھوں نے حسرت　　وہ کہ خوشبوئے محبت سے ہم آغوش نہ تھا

ہے بوئے شوق سے جو معطر مشام جاں　　ارمان نہیں ہوائے جناں کی شمیم کا

خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے　　تجھ تک نہ ہوا تھا جو گزر باد صبا کا

سونگھی تھی جو ایک بار وہ خوشبوئے گریباں　　اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشا ہے

کیا کیجیے بیاں اس تن نازک کی حقیقت　　خوشبو میں ہے گل بو تو لطافت میں ہے رنگ

پائی ہے جگہ پائی دامان نظر میں　　خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر

ایک بار بس گیا جو کہیں ان کی باس میں　　خوشبوئے حسن بن کے رہی اس لباس میں

رفتہ رفتہ مٹ رہی ہے صرصر بیداد سے　　رنگ ہیں بوئے وفا میں نکہت برباد کے

خوشبوئے حیا کے علاوہ رنگ حیا کا مضمون اس طرح باندھا ہے۔

غمزۂ دل فریب کو اور بھی جاں فزا بنا
پیکر ناز حسن پر رنگ حیا زیاد کر　　(حسرت)

دوسری جگہ یوں کہا ہے۔

یہ آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
ان میں یہ سحر کاریٔ رنگ حیا ہے کیا (حسرت)

خوشبوئے دلبری کی ترکیب ملاحظہ طلب ہے۔

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

محبوبی و رنگینی ہیں جزو بدن تیری — سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگین — یا عکس مے سے شیشہ گلابی

کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو — آنکھیں جب اپنی ملتے ہیں انکی ردا سے ہم

کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرت — گھیر لیتی ہے انھیں زلف معنبر کیا خوب

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں — شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

وصل میں بوئے جسم یار کو آج — شوق سے پردۂ قبا نہ رہے

مشک و عنبر میں یہ تفریح کے سامان کہاں — پیرہن ان سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو تیرا

دامن حسن ترا خون شہادت نے مرے — عطر خوشبوئے محبت میں بسا کر دیکھا

یہی لائی ہے اڑا کر ترے ملبوس کی بو ۔ بےخودی ہائے تمنا کی صبا ہے باعث

حسرت مجھے بھاتی ہے پریشانی دل بھی ۔ آئی ہے جو اس گیسوئے ابتر سے نکل کر

قریب ہے کہ ترے گیسوئے دراز کی بو ۔ نسیم باغ جوانی کو مشکبار کرے

رنگ و بو کے محرکات فارسی شاعروں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو غزل میں خیال کی جو لطافت اور نزاکت نظر آتی ہے وہ بہت کچھ فارسی شاعری کے اثر سے ہے۔ اہل ایران کسی چیز کی خوبی یا کمال ظاہر کرنے کے لئے رنگ و بو کے لفظ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ فردوسی نے ان دونوں لفظوں کو اسی معنی میں برتا ہے۔ وہ فوج کی تعریف ان نازک لفظوں سے اس طرح بیان کرتا ہے۔

سوئے شہر ایران نہادند روئے ۔ سپاہی بداں گونہ با رنگ و بوئے

رنگین ادائی اور رنگین بیانی وغیرہ کی ترکیبیں بھی اردو میں فارسی سے آئیں۔ اس کے علاوہ رنگ و بو کے ساتھ اور دوسرے لاتعداد محاورے اردو میں استعمال ہونے لگے۔ لیکن سب میں خوبی اور کمال کا پہلو موجود رہا۔

شیخ سعدی نے بو کے شعری محرک کو اخلاقی غرض کے لئے اپنی اس منظوم حکایت میں استعمال کیا ہے جو تمثیل (الیگری) کے انداز میں ہے۔ انھیں دست محبوب سے جو خوشبودار مٹی ملی اور اس نے ان سے جو گفتگو کی وہ ان لفظوں میں تھی جو بلاغت کی جان ہیں۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے ۔ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ۔ کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ۔ و لیکن مدتے با گل نشستم

جمال ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

رنگ و بوئے شعری محرکات کی مثالیں سعدی، حافظ اور دوسرے اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں۔ لیکن غالباً اتنی کثرت سے نہیں جتنی اردو میں ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ایران کے مقابلے میں ہندوستان گرم ملک ہے یہاں کے باشندوں کو ان محرکات کا احساس جتنی شدت سے ہوتا ہے وہ نسبتاً ٹھنڈے ملکوں کے لوگوں کو نہیں ہوتا۔ لیکن اس احساس کی شدت کے لئے صرف گرم آب و ہوا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ شعری ذوق و امتیاز کی صلاحیت بھی ضروری ہے جو ہر زمانے میں اہل ہند کی خصوصیت رہی ہے۔ سنسکرت اور ہندی شاعری میں اور ہندوستان کے ان شاعروں کے ہاں جنھوں نے فارسی میں شعر کہا اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ غنی کشمیری نے تو کہا ہے کہ محبوب کا رنگ حنا میری فکر رنگیں کے لئے محرک ہوتا ہے۔

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر فکر — تو حنا بستی و من معنیٔ رنگین بستم

اردو کے شاعروں کے کلام سے چند اور مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

ہم بوئے دوست تجھ کو سنگھائیں گے شیفتہ — محو شمیم طرۂ عنبر فشاں نہ ہو
(شیفتہ)

بوئے گل لائی ہے تو یار کی بو کے بدلے — اس تری چھیڑ کو ہم باد صبا جانتے ہیں
(مجروح)

کیا چمن میں سے گئی بوئے گریباں اس کی
آج غنچہ کوئی کھلتا جو گلستاں میں نہیں (مجروح)

لا کے اس کی شمیم عطر آگیں — مجھ کو تڑپا دیا صبا تو نے
(مجروح)

وہ نونہال خوبی نازک ہے دل ربا ہے — عالم ہے اُن کی بو میں گل کی نسیم کا سا
(رنگیؔ دہلوی)

کاکل جان فزا کی بو سونگھ چکی ہے اے صبا — کچھ تو سمجھ کے ذکر کر عنبر و مشک و عود کا
(شادؔ عظیم آبادی)

طرۂ گیسوئے جاناں! تری نکہت کی قسم — میں نے دیکھا تھا مگر مشک ختن یاد نہیں
(ثاقبؔ لکھنوی)

جذب شمیم زلف ہے دانۂ دام سے سوا — سینکڑوں دل کھنچ آئے ہیں گیسوئے مشکبار میں
(ثاقبؔ لکھنوی)

مرے لہو سے اگر ہو کے سرخرو آئے — ملو تو برگ حنا میں وفا کی بو آئے
(ثاقبؔ لکھنوی)

اوپر کے شعر میں خیال بالکل اچھوتا ہے کہ حنا سے بجائے رنگ وفا کے بوئے وفا پیدا ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک بو بمقابلہ رنگ زیادہ قوی محرک شعری ہے۔ شاعر کا یہ اشارہ بھی لطف سے خالی نہیں کہ حنا میں صرف رنگ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہی ہوتی ہے جس کی پتیوں میں روحِ مستی اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

دل بنے عجیب گل چمن روزگار میں — رنگت تو پھول کی ہے مگر بو وفا کی ہے (جلیلؔ)

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے — کلی کلی سے کہے بوئے یار آتی ہے
(جلیلؔ)

سونے میں کھل گئی ہے جو وہ زلف مشکبو — کیا کیا ملا رہا ہوں نسیم سحر کو میں
(جلیلؔ)

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے — کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری
(جلیلؔ)

مرزا یگانہ کے اس شعر میں رنگِ تماشا اور بوئے تمنا کی ترکیبیں ایمائی تازگی سے لبریز ہیں۔

حیراں ہیں نظر والے، بیتاب ہیں دل والے
کچھ رنگ تماشا ہے، کچھ بوئے تمنا ہے

یگانہ کے اور شعر ملاحظہ ہوں :-

حریم ناز میں کب تک گھٹے گی بوئے پیراہن
ہوائے شوق میں لازم ہے اک دن منتشر ہونا

یاد آئی بوئے پیرہنِ یار ناصحا
اپنا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا

بوئے یوسف خود دلیلِ منزلِ مقصود ہے
جذبِ صادق غائبانہ رہنما ہو جائیگا

بسی ہے نکہت آوارہ کن نازک دماغوں میں
مبارک ہستیٔ برباد پہ مغرور ہو جانا

کیوں نکہت آوارہ جامے سے نہ ہو باہر
کس دن کو وفا کرتی پیراہن رسوا ہے

جگر کے کلام میں رنگ و بو کے محرکات ملاحظہ ہوں

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

جا بھی اے ناصح ناداں نہ کر اس کو بدنام
ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

اصغر کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

اے دل شوخ دیکھ جو زیر کمین رنگ و بو — طائر قدس کو بھی لے دام گہ مجاز میں

فریب دام گہ رنگ و بو معاذ اللہ — یہ اہتمام ہے اور ایک مشت پر کے لئے

تھی بوئے دوست موج نسیم سحر کے ہاتھ — یہ اور لے اڑی مرے مشت غبار کو

موج نسیم صبح کے قربان جائیے — آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے

جلوۂ رنگین اتر آیا نگاہِ شوق میں — ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگین پر — چھپا کر کس نے ان پردوں میں برق آشیاں رکھدی

شعر غزل میں حسن ادا کا انحصار لفظوں کے خاص استعمال پر ہوتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانے سے حسن ادا کو چار چاند لگ جاتے ہیں مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "نکات سخن" میں جمع کے استعمال کو محاسن سخن میں شمار کیا ہے (صفحہ ۱۶۲)۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ایسا کیوں ہے؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزل کے لئے رمزی اور ابہامی کیفیت ضروری ہے۔ صیغہ واحد کے استعمال سے تفرد اور تعین کی صورت پیدا ہوتی ہے اور یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاعر نفس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے اشتباہ کا رمزی اور ایمائی اثر ہوتا ہے صیغۂ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اس لئے اس سے کلام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ خود حسرت کی غزلیں ملاحظہ کیجئے۔ جمع کے حسن

استعمال نے ان کو کس قدر بلند کر دیا ہے۔

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں — دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا — شوق کی بے قراریاں نہ گئیں
تھے جو ہم رنگ ناز اُن کے ستم — دل کی امیدواریاں نہ گئیں
حسن جب تک رہا نظارہ فروش — صبر کی شرمساریاں نہ گئیں

ہم پر کبھی مثلِ غیر ہیں کیوں مہربانیاں — اے بدگمان یہ خوب نہیں بدگمانیاں
حیرت ہے یادگارِ زمانِ جنون ہنوز — باقی ہیں شوقِ یار کی اب تک نشانیاں

خاموشیوں کا رازِ محبت وہ پا گئے — گو ہم سے عرضِ حال کی جرأت نہ ہو سکی

اللہ رے چشمِ یار کی خوبی کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
نشو و نمائے سبزہ و گل سے بہار میں — شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

میری مجبوریاں شوقِ جفا سے باز رکھیں گی — ترا شوقِ ستم ظالم خیالِ امتحان تک ہے

رنگینیوں کی جان ہے وہ پائے نازنیں — اپنی نگاہِ شوق جہاں پر کے پل گئی

جمع کا حسنِ استعمال ہر دور کے شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ قدما میں خاص طور پر میر صاحب کے کلام میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً

جب تک ملے جلے سی جفائیں بھی اُٹھ سکیں
کرنے لگے ہو اب تو ستم گاریاں بہت

یہ بے قراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں
جان کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں
طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میرؔ آب
دور پہنچی ہیں مری رسوائیاں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

مومنؔ کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

الجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم
کرتے ہیں اس پہ ناز ادا دانیوں میں ہم
ثابت ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گناہِ رشک
حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے خوشی کے مر گئے صبح شبِ فراق
کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

نسیم دہلوی کا شعر ہے:-

نسیمؔ غفلت کی چل رہی ہے اندھیری ہیں قضا کی نیندیں
کچھ ایسے سوتے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

داغ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

خفا ہوتے ہو کیوں عہد وفا کے ذکر پر سچ ہے
نہ تم وعدہ خلافوں میں نہ ہم بے اعتباروں میں

سرِ شوریدہ کو تسکین وہیں ہوتی ہے مجھ پہ احساں ہے اس کوچے کی دیواروں کا
دوش پہ اپنے جو صیاد نے زلفیں چھوڑیں اور جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

جگر کے شعر ملاحظہ ہوں جن میں جمع کے استعمال سے کلام کا حسن دوبالا ہو گیا:۔

دل میں باقی نہیں وہ جوش جنوں ہی ورنہ دامنوں کی نہ کمی ہے نہ گریبانوں کی

میں نے جب شرم سے محشر میں جھکالی گردن بخشوانے کو مجھے میری خطائیں آئیں

اللہ اللہ اعتبار راست نظر اور پھر ان سب کی بے بنیادیاں
اس نگاہ ناز ہی سے پوچھیئے اک اسیر شوق کی صیادیاں

نقلِ قول کے حسن استعمال سے بھی کلام میں بجائے تعین کے رمزو ابہام پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ حالانکہ نثر میں اس کے بالکل خلاف ہے۔ نثر میں نقل قول مطالب کی صفائی اور تعین کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے۔ غزل میں اس سے رمزی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ اور شعر کی بے تکلفی اور تازگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اساتذہ کے کلام سے یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

ٹک ہمرہان قافلہ سے کہہ دے اے صبا ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے
(سودا)

کہتے تو ہو "یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا"
کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(میر)

دل جائے ہے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے
"اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے"

(میر)

ٹھیرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے "تم کیوں ہوئے پیارے"

(میر)

کہیو صبا کہ "جس کو تو تو بھلا گیا تھا سو
جوں نقش پا پڑا تری دیکھے ہے راہ وہ"

(میر حسن دہلوی)

جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے کترا کے کبھی
دل مجھے پھیر کے کہتا ہے "ادھر کو چلیے"

(میر حسن دہلوی)

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگیٔ عشق
بولا کہ "یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس"

(مصحفی)

پڑتی ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری
وہ منہ کو پھیر کے کہتا ہے "اف پناہ تیری"

(جرأت)

کہے گر کوئی اس سے ملیے کہ جرأت
تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
تو کہتا ہے وہ از رہ طعن ہاں جی
"یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے"

(جرأت)

جتاؤں درد محبت تو کس ادا سے کہے
"کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی"

(جرأت)

اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا
"جادو بر حق ہے کرنے والا کافر"

(جرأت)

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
"کہ تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر"

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"
(غالب)

میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمہیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
(غالب)

میں نے کہا کہ "بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی" سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں
(غالب)

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال کہ یہ کہے کہ "سر رہگذر ہے کیا کہیئے"
(غالب)

رشک کہتا ہے کہ "اس کا غیر سے اخلاص حیف" عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا"
(غالب)

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیئے
(غالب)

ہنس کے بولے سوال بوسہ پر "ایسی باتوں کا یاں جواب نہیں"
(مجروح)

نقشِ پائے رفتگاں سے آرہی ہے یہ صدا "دو قدم میں اٹھ رہے ہے شوق منزل چاہیئے"
(آتش)

باغ میں آج جو اس گل کی سواری آئی شور بلبل نے کیا "باد بہاری آئی"
(ناسخ)

اٹھتے ہی تیری بزم سے اٹھا یہ غلغلہ "بہتوں کا دل کشاکش عشق میں رہ گیا"
(عیشی)

امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا نگاہیں بول اٹھیں "وہ لے لیا دل"
(امیر مینائی)

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی "ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی"

(امیر مینائی)

مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں سے "رہے خیال ہماری بھی نارسائی کا"

(امیر مینائی)

یہ کہتی ہیں ہم سے جفائیں تمہاری "نہیں باز آتیں وفائیں تمہاری"

(جلال)

نگاہ شوق بہت اضطراب خوب نہیں "ٹھہر، وہ آپ ہی پردہ اٹھائے دیتے ہیں"

(جلال)

کہاں کہاں دل مشتاق دید نے یہ کہا "وہ چمکی برق تجلی وہ کوہ طور آیا"

(داغ)

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا "دیکھ پچھتائے گا خاموش، یہ دستور نہیں"

(داغ)

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں "ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے"

(داغ)

یہ کیا کہا کہ "میری بلا بھی نہ آئے گی" کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

(داغ)

نگاہِ ناز یہ کہتی ہے تیر افگن کی "کہ میں ہوں دل کیلئے تیر ہے جگر کیلئے"

(جلیل)

نقاب کہتی ہے "میں پردہ قیامت ہوں" اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے

(جلیل)

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں "دو قدم کو چلے رسوائی ہے"

(جلیل)

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں "وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر میں ہوں"

(شاد عظیم آبادی)

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے "آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم"
مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
"آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم"
(شاد عظیم آبادی)

"محبت کیوں کرو گر ہو نہیں سکتی وفا مجھ سے"
یہ تم نے کیا کہا مجھ سے یہ تم نے کیا کیا مجھ سے
(حسرت)

"دیکھے نہ ہمیں کوئی محبت کی نظر سے" کیا خوب یہ انداز تحکم ہے تمہارا
(حسرت)

وہ اب یہ چھیڑ سے کہتے ہیں "میرے غم نے تجھے نہ بے قرار کیا ہے نہ بے قرار کرے"
(حسرت)

حال دل سے تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں اب کبھی "ہم کو خبر کیا تھی" نہ کہنا دیکھو!
(حسرت)

"دل سے ارباب وفا کا ہے بھلانا مشکل ہم نے یہ ان کے تغافل کو سنا رکھا ہے
(حسرت)

عشاق کی جانب سے تقاضائے وفا پر کہتے ہیں وہ "جھگڑا یہ نکالا ہے کہاں کا"
(حسرت)

کوئی شکوہ سنج ستم اور ہوں گے وہ کہتے ہیں "حسرت ہمارا نہ ہو گا"
(حسرت)

یہ کہہ کر دیا اس نے درد محبت "جہاں ہم رہیں گے یہ سامان ہو گا"
(جگر)

کہتی ہے یہ اب وسعت دیوانگی شوق "منزل بھی جو آجائے تو منزل نہ سمجھنا"
(جگر)

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار
خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے"
(جگر)

بزم سے باچشم تر اُٹھ گئے کہتے ہوئے "ہم سے تری داستاں اب نہ سنی جائیگی"
(جگر)

آرہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے "کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے"
(مرزا یگانہ)

رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی "ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں"
(مرزا یگانہ)

شاعر بعض اوقات غیر ذی روح اشیاء اور مجرد کیفیات کو ذی روح فرض کر لیتا ہے یا ان میں ایک طرح کا تشخص پیدا کر دیتا ہے۔ بادی النظر میں تشخص سے ایک طرح کا تعین لازم آتا ہے لیکن غزل گو شاعر کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے جس طرح نقل قول کے ذریعے بظاہر مطالب میں تعین پیدا ہونا چاہیئے۔لیکن غزل میں اس کا الٹا اثر ہوتا ہے اسی طرح تشخص سے بھی رمزی اثر بڑھانے کا کام لیا جاتا ہے اکثر اوقات اس قسم کا تشخص ندرت استعارہ کا کرشمہ ہوتا ہے۔ مجرد کیفیات کے تشخص کی مثالیں قدما کے کلام میں نہیں ملتیں یا اگر ملتی ہیں تو شاذ و نادر۔ غالب نے اس اسلوب کو برتا ہے۔ خاص طور پر جدید زمانے کے غزل کے استادوں کے یہاں اس کی مثالیں بہت کثرت سے ہیں۔غالب کے کلام میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

بھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا افسون انتظار تمنا کہیں جسے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے — دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب — ہم نے دشتِ امکان کو ایک نقشِ پا پایا

مدعا محو تماشائے شکستِ دل ہے — آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

یعنی مایوسیوں کی وجہ سے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور آئینہ خانہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ اب مدعا اس آئینہ خانہ کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہے۔ مدعا کا تماشا دیکھنا خاص لطف رکھتا ہے۔ شاعر نے مجرد کیفیت کو بڑی خوبی سے تشخص عطا کر دیا ہے۔

غالبؔ کے دو شعر اور ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب — اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست — بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اس آخری شعر میں شاعر نے اپنے تصورات کی دنیا کو ایک میکدہ فرض کیا ہے جس میں شربتِ دیدار شراب کا حکم رکھتا ہے، حوصلہ کے ذمے ساقی گری ہے اور نگاہ مےخواری میں مست ہے۔ ان سب کیفیات کے تشخص نے کلام میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

دوسرے غزل گو اساتذہ کے کلام میں سے چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں

وہ سادگی سے تغافل کو ناز کہتے ہیں
مگر سکھائی ہے شوخی کہ امتحان کیجئے
(ذکی دہلوی)

تم تو جب سوار توسنِ ناز — قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے
داغ

تیغِ قاتل پہ ادا لوٹ گئی — رقصِ بسمل پہ قضا لوٹ گئی
(امیر مینائی)

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی
(فانی)

یاس جب چھائی امیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں
دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کئے
(فانی)

گلہ ضرور نہیں حال بے خودی معلوم
تمہاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی
(فانی)

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے
(اصغر)

عشق کی بیتابیوں پر حسن کو رحم آگیا
جب نگاہ شوق تڑپی پردہ محمل نہ تھا
(اصغر)

اب طور پر وہ برق تجلی نہیں رہی
تھرا رہا ہے شعلۂ عریان آرزو
(اصغر)

اس جلوہ گاہ حسن میں چھایا ہے ہر طرف
ایسا حجاب چشم تماشا کہیں جسے
(اصغر)

دل سے ارباب وفا کا ہے بھلانا مشکل
ہم نے یہ ان کے تغافل کو سنا رکھا ہے
(حسرت)

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
(حسرت)

عشق سے کہاں روا ہے حسن
اس قدر اہتمام شرم و حجاب
(حسرت)

فرقت ساقی میں ہم حسرت کشاں بادہ سے
مل کے رویا خوب ابر نوبہار ابکی برس
(حسرت)

اس بزم سے آزردہ نہ کم نگی محبت
آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے
(حسرت)

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی — مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

(حسرت)

تری محفل سے ہم آئے مگر با حال زار آئے — تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمن اہل وفا تجھ سے — ہوس نے کام جاں پایا محبت شرمسار آئی

(حسرت)

ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں — کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

(جگر)

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں ہوتی — ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا

(جگر)

مزاج حسن و تکلیف تجلی، اے معاذ اللہ — بس اب رسوا نہ کر اے بیخودی شوق پشیماں کو

(جگر)

تلمیح بھی کنایہ اور استعارہ کی طرح رمز و ایما کو چاہتی ہے۔ اس میں بھی کنایہ کی طرح لازم و ملزوم میں واسطہ برقرار رہتا ہے جس کی لطافت کا یہ اقتضا ہے کہ تعقید نہ پیدا ہو۔ کنایہ کی طرح تلمیح بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ سامع اس کے ایمائی اثر کی تازگی کا متوقع رہتا ہے۔ مثلاً

بے ستون کیا ہے کوہ کن کیسا — عشق کی زور آزمائی ہے
مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر — کیا دوانے نے موت پائی ہے

(میر)

تھے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد — نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

(میر)

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(غالب)

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

(غالب)

غزل میں بعض اوقات استفہام سے بھی حسن کلام پیدا کیا جاتا ہے۔
استفہام بالعموم انشائیہ جملوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے جو خبریہ جملوں کے مقابلے میں زیادہ لطافت اور بلاغت رکھتے ہیں۔ استفہام میں متکلم وضاحت کے لیے مخاطب سے کچھ دریافت کرتا ہے لیکن غزل میں اس کے ذریعہ شعر کے رمزی اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعر ایک طرح کا تجاہل عارفانہ برتتا ہے۔ درحقیقت وہ استفہام سے کبھی اپنے اندرونی تحیر کو ظاہر کرتا ہے اور کبھی دیدہ و دانستہ اپنے تجربوں کی پیچیدگی اور الجھاؤ کو نمایاں کرتا ہے۔ استفہامی شعروں کی مثالیں ہر بڑے شاعر کے یہاں ملتی ہیں۔ یہاں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
میر صاحب کے دیوان میں کثرت سے اس قسم کے اشعار ہیں، و بعض غزلیں پوری کی پوری استفہامی رنگ میں ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تڑپتا نقش پائے ناقہ پر جاتا ہے تک مجنوں
بیاباں میں وہ لیلیٰ کا کدھر محمل ہے کیا جانے؟

شون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب
اب کیا مرے جنوں کی تدبیر میر صاحب؟

لے اس سرے سے یارو اجڑی ہے اس سرے تک
اقلیم عاشقی میں آباد گھر کہاں ہے؟
جاتا نہیں اگر وہ مسجد سے میکدہ کو
پھر میر جمعہ کی شب دو دو پہر کہاں ہے؟

ہے حوصلہ تیرا ہی جو تنگ نہیں آتا
کس سے یہ ستم ورنہ اے میر سہا جاوے؟

غالب کے یہاں بھی متعدد غزلیں استفہامی انداز میں ہیں۔ مثلاً۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں؟

غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں — کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے؟

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی؟

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟ — تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

کہو جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے — تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے؟

دوسرے مشہور شاعروں کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

گریباں پھاڑ کر دیوانے نے زنجیر کیوں پہنی
کرے کیا عقل دخل اس میں جنوں کا کارخانہ ہے؟
(آتش)

کون وہ دل ہے جو محو رخ جاناں نہ ہوا — کون آئینہ ہے جو دیدۂ حیراں نہ ہوا؟
(ناسخ)

سنتا ہی نہیں وہ بت گمراہ کسی کی — ایسا نہ ہو سن لے کہیں اللہ کسی کی؟
(رند)

رند کے اس شعر میں نفی اور استفہام کی دونوں خوبیاں موجود ہیں۔

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی باد بہاری — کیا اب کی برس چاک گریباں نہ کریں گے؟
(رند)

داغ نے اس شعر میں بھی نقل قول اور استفہام دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں:-

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ — ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں؟ (داغ)

محروم پھر آیا سوئے میخانہ سے واعظ — رندان قدح خوار کی ہٹ کو ہے کیا (مائل ہوئی)

انس ہے خانۂ صیاد سے گلشن کیسا؟ ناز۔ پروردِ قفس ہوں میں نشیمن کیسا؟
(تعشق)

حسرت کے یہاں بھی استفہامی اشعار کثرت سے موجود ہیں اور بعض غزلیں پوری کی پوری اس رنگ میں ہیں۔ طوالت کے خوف سے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کبھی کی بھی جواب دوا کیجئے گا؟ مجھے پوچھ کر آپ کیا کیجئے گا؟

حالِ مجبوریٔ دل کی نگراں ٹھیری ہے دیکھنا وہ نگہ ناز کہاں ٹھہری ہے؟

سب سے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا اے فریب نگاہ یار یہ کیسا؟

حسرت کے اس شعر میں نقل قول اور استفہام دونوں ہیں۔

محبت کیوں کرو گر ہو نہیں سکتی وفا مجھ سے " یہ تم نے کیا کہا مجھ کو، یہ تم نے کیا کیا مجھ سے

اِن دونوں شعروں میں استفہام سے تاثیر کہاں سے کہاں پہونچ گئی ویسے کہنے کو معاملہ کے شعر ہیں۔

سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا؟ باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا؟

نظر پھر نہ کی اس نے دل جس کا چھینا محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا؟

جگر کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں :-

محبت کیا ہے؟ تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں؟ ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

کہاں ہم اور کہاں اب فسانۂ غم عشق؟ وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا

اس ایک دل کی حقیقت کوئی کیا جانے؟ جو لاکھ بار بنا اور پھر خراب ہوا

کیا غرض مجھ کو ترے دل پہ اثر ہے کہ نہیں میں پرستارِ محبت ہوں خبر ہے کہ نہیں؟

وہ کون ہے ایسا کہ تری شکل دکھاوے؟ احسان ہے اس کا جو مجھے مجھ سے ملادے

جگر کی بعض پوری غزلیں استفہامیہ انداز میں ہیں۔ مثلاً:۔

عشق کی یہ نمودِ پیہم کیا؟ ہم نہیں تم اگر تو پھر ہم کیا؟

سن تو اے دل یہ برہمی کیا ہے آج کچھ درد میں کمی کیا ہے؟

یہ مے کشی ہے تو پھر شانِ میکشی کیا ہے؟ بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے؟

نگاہ شوق جگر وقفِ چارسو کیا ہے؟ جو دل حسین ہو تو دنیائے رنگ و بو کیا ہے؟

دِل چھنا یا بُرا ہے کیا کہیے؟ آپ کا نقشِ پا ہے کیا کہیے؟

اسی طرح فانیؔ کے یہاں بھی استفہامیہ غزلیں ملتی ہیں اور منفرد اشعار تو بے شمار ہیں مثلاً:

واہمہ ہی یہ خلقِ پیہم کیا؟ یاس و امید، شادی و غم کیا؟

اس نورِ مجسم کے افسانے کو کیا کہیے؟ ہے شمع بھی پروانہ، پروانے کو کیا کہیے؟

لفظوں کی تکرار بالعموم نثر اور شعر دونوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن اگر لفظوں کی تکرار اور الٹ پھیر ایک خاص سلیقے سے کی جائے اور وہ رمزی اور ایمائی احساس کو بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی بلاغت اور حسن میں اضافہ ہوگا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے
پارہ پارہ دل ہے جس میں تو وہ تو وہ حسرت ہے
(ذوق)

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
(غالب)

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
(غالب)

کس تجاہل سے وہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو
تیرے کوچے میں ستمگار تیرے کوچے میں
(شیفتہ)

ہوئے ہیں عاشق بھی کن گلوں کے کہ خود ہی شاکی ہیں جن گلوں کے
نہیں ہے وعدہ میں ان گلوں کے وفا کی بو امتیاز کا رنگ
(جلال لکھنوی)

بھلا بھلا کے جتایا ہے ان کو رازِ نہاں چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا
(داغ)

ان کو بے تاب کیا کچھ نہ کہا نالۂ دل یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، یہ تو اثر کچھ بھی نہیں
(داغ)

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ سے تھے گویا — اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے
(داغ)

دعا سے کچھ نہ ہوا التجا سے کچھ نہ ہوا — بتوں کے عشق میں یاد خدا سے کچھ نہ ہوا
پھری تو تھی مگر اپنے اثر کو لا نہ سکی — گئی تو تھی مگر آہِ رسا سے کچھ نہ ہوا
(مضطر)

کہاں گلوں کے وہ تختے وہ لالہ زار کہاں — بہار میں تو نظر لگ گئی بہار کہاں
(شاد عظیم آبادی)

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں
(فانی)

حکم وحشت ہے کہ زنداں کو بھی صحرا جانو — دلِ وہ آزاد کہ صحرا کو بھی زنداں سمجھے
(فانی)

کوئی ان کی بزم جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا
(حسرت)

جب سے لے گئی ہے ہمیں تا کوئے ملامت — مجبوریٔ دل خاک بسر لے کے گئی ہے
(حسرت)

آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور — دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے
(حسرت)

تازگیٔ بیان اور ندرت مضمون کا بعض دفعہ یہ اقتضا ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظوں کو غیر مذکور رکھا جائے اور مطلب کو اس طرح بیان کیا جائے کہ سامع کا ذہن خود بخود اس کمی کو پورا کرے مثلاً

موئے دلبر سے مشکبو ہے نسیم — حال خوش اس کے خستہ حالوں کا
(میر)

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
(مومن)

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
(مومن)

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا سو مجھے خاک میں ملانے کو
(مومن)

سلطنت دست بدست آئی ہے جام مئے خاتم جمشید نہیں
(غالب)

کیوں ردو قدح کرے ہے زاہد مئے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
(غالب)

ہم بھی امید وصل سے خوش ہیں ہے زمانے کو انقلاب بہت
(مجروح)

کل تک ہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی دنیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشیمن نے
(فانی)

بعض اوقات حذف کرنے کے بجائے مضمون کو دیدہ و دانستہ طول دیا جاتا ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اس سے ایمائی اثر حاصل ہوتا ہے اس لئے کلام کی تازگی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً غالب کو یہ کہنا ہے کہ فلک کے ظلم معشوق کے ستم سے کم نہیں فلک کے ظلم دیکھکر معاً معشوق یاد آتا ہے اس مضمون کے لئے یہ انداز اختیار کرتے ہیں۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

اسی مضمون کا صبا لکھنوی کا شعر ہے جو کسی طرح غالب کے شعر سے کم نہیں۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مجروح نے بھی اسی مضمون کو سیدھے سادے طور پر ادا کیا ہے جو لطف سے خالی نہیں۔

ملتی ہے اس کی وضع زبس خوئے یار میں
آئے نہ کیوں مزا ستمِ روزگار میں

مومن خاں جذبۂ رشک کے تحت اپنے محبوب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر سے سرگوشیاں نہ کیجئے بلکہ میری طرف التفات فرمائیے۔ لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ غیر کی طرف پہلے متوجہ ہو لیجئے۔ حالانکہ ان کا مدعا اس کے بالکل خلاف ہے۔

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

مقصود صرف اپنے گریبان کے چاک کی وسعت بتانا ہے لیکن اس ضمن میں دستِ جنون کے صدقے جاتے ہیں اور یہ اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔

دستِ جنون کے جائیے صدقے کہ چین سے
پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

رمزی اور ایمائی اثر آفرینی کے ضمن میں شاعر بعض وقت ایسا اندازِ بیان اختیار کرتا ہے جس سے سامع کا ذہن کبھی تکلم سے غیبت کی طرف کبھی غیبت سے متکلم کی طرف کبھی خطاب سے تکلم کی طرف اور کبھی خطاب سے غیبت کی طرف خود بخود منتقل ہوتا ہے۔ کبھی مفرد اور جمع کے صیغے ایک ہی شعر میں برتے جاتے ہیں۔ دراصل یہ سب رمزی طلسم کے کرشمے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ نثر میں یہ سب باتیں عیب ہیں مگر غزل میں انھیں حسنِ ادا کی سند حاصل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اب کے جو تیرے کوچہ سے جاؤں گا تو سنیو پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا
(میر)

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
(ذوق)

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے اپنے در کی دربانی مجھے
(غالب)

عجیب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا
(انشاء)

ترے در سے اب ہم سفر کر چلے جیو تم کہ اب ہم گزر کر چلے
(میر سوز)

فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے
(آتش)

پھنس گئے تم نہ سنی حضرت دل بات مری بندگی آپ کو اے قبلۂ حاجات مری
(امیر)

ادھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے
(داغ)

تخیل کبھی معمول کے خلاف مستقبل کے معنی ماضی کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے تاکہ ابہام و رمز پیدا ہو۔ مثلاً

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

مجھ گنہگار کو جو بخش دیا تو جہنم کو کیا دیا۔ تو نے
(داغ)

ایک ہی شعر میں مفرد اور جمع کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی نے "نکاتِ سخن" (ص ۹۸) میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی کو ابتدائی مشق کے زمانے میں اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی جس کا مطلع یہ تھا۔

ملتے ہیں اس طرح سے کہ گویا خفا نہیں   کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

منشی صاحب مرحوم نے پہلا مصرع بدل کر یوں کر دیا

ملتے ہو اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں

اور دوسرا مصرع جیسا تھا ویسا رہنے دیا۔ گویا ان کے نزدیک تم کے ساتھ آپ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اگرچہ حسرت کا خیال ہے کہ تم اور آپ اور تو اور تم کا اجتماع قابلِ احتراز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں ان کے استاد کا مسلک غزل کی تکنیک کے نقطۂ نظر سے بہتر اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مفرد اور جمع کے صیغوں کے اجتماع سے شعر کی رمزی کیفیت بڑھ جاتی ہے اور کسی قسم کی تعقید نہیں پیدا ہوتی۔ مطلب میں تعین کے بجائے ایک قسم کا ابہام اور پھیلاؤ آجاتا ہے جس سے شعری احساس لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن رمزی علامتوں کو برتنے میں اگر خاص سلیقے سے کام نہیں لیا گیا تو لطفِ سخن حاصل ہونا تو کجا وہی بات ذوق پر گراں گزرے گی۔

یہی حال رعایتِ لفظی کا ہے۔ اگر اس سے شعر کی رمزی اور ایمائی کیفیت بلا کسی تکلف کے بڑھ جائے تو سامع اس سے لطف اندوز ہوگا۔ ورنہ اگر یہ احساس پیدا ہو کہ شاعر نے تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے تو طبیعت اس کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہوگی۔ ایسی لفظی رعایتوں سے بجائے کوفت اور بے لطفی کے کچھ حاصل نہیں۔ یہ ضلع جگت روحِ تغزل کا خون کرتی ہے۔ لکھنؤ اسکول نے اسی جانب زیادہ توجہ کی جس کے سبب سے کلام میں طرزِ تصنع نے راہ پائی۔ بعض دہلی اسکول کے غزل گو شاعر بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ چند عام مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

توڑ دل کا نہ مرے مار کے پتھر شیشہ سنگدل ہم نے بنایا ہے یہ مرمر شیشہ
(شاہ نصیر دہلوی)

کیا ہے تازہ نخل غم کو آہیں سرد بھر بھر کر
بڑی محنت سے میں نے یہ ثمر جانے میں پالا ہے
(امانت لکھنوی)

کر رہا ہوں شام سے میں انتظار اس ماہ کا دیدۂ بیدار ہر ایک آج اختر ہو گیا
(امانت لکھنوی)

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا
(ناسخ لکھنوی)

شعلے اٹھے جو آتش رخسار یار کے بالے کی مچھلیوں کو سمندر بنا دیا
(برق لکھنوی)

بھاتا ہے نہایت دل کو خط رخ جاناں کا
گھسیٹے گا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستاں کا
(آتش لکھنوی)

سرخ رو دیکھئے کس کس کو کرے گا قاتل
سر پہ باندھے ہوئے مقتل میں کفن لاکھوں ہیں
(داغ دہلوی)

چلو گھر خاک ڈالو اب حنا کا خون ہوتا ہے۔
کف افسوس ملتے ہو کھڑے گنج شہیداں میں
(تسلیم لکھنوی)

ان مثالوں کے خلاف ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں رعایت لفظی جدت ادا میں جان ڈال دیتی ہے اور شعر کا معنوی اور رمزی اثر کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔

میرے سنگِ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے "یا استاد"
(میر)

گرچہ آوارہ چوں صبا ہیں ہم — لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
(میر)

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا
(غالب)

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
(غالب)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
(غالب)

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے
(غالب)

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے — تمہارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے
(غالب)

اس قسم کی مثالوں سے غالب کا دیوان بھرا پڑا ہے اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں رعایتِ لفظی سے کلام کی شگفتگی، بلندی اور تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

جس طرح حسن کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کیجا سکتی اسی طرح شعر کے حسنِ ادا کو بھی محسوس کرنا ممکن ہے۔ خیال میں محسوسات کی جو صورتیں جمع ہوتی ہیں ان کے اظہار پر جب تک پوری قدرت نہ ہو اس وقت تک طرزِ ادا میں جدت اور دلکشی نہیں آسکتی۔ حسنِ ادا کے لئے لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں درکار ہیں۔ وہی معمولی باتیں ہیں جنھیں سب کہتے ہیں۔ ایک کے کہنے کا اثر ہوتا ہے دوسرے کے کہنے سے کان پر

جیوں تک نہیں رینگتی۔

قطرۂ اشک کا مضمون پیش پا افتادہ ہے۔ لیکن غالب نے اسی مضمون میں ندرت اور نزاکت کی رنگا رنگی سمودی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قطرۂ اشک کی قدر و قیمت گہر سے زیادہ ہے۔ اس مضمون کو صاف طور پر بیان کرنے کے بجائے پہلے یہ دعویٰ پیش کیا کہ جتنی ہمت ہوگی اتنی ہی توفیق ہو گی۔ یہ قطرہ کی پست ہمتی ہے کہ وہ گہر بننے پر قناعت کر گیا۔ اگر اس کا حوصلہ بلند ہوتا تو اس کو انسانی آنکھ میں جگہ مل سکتی تھی جو اس کے رتبے کی معراج ہوتی۔ شعر میں دعوے سے زیادہ اہمیت ثبوت کو حاصل ہے جس میں رمزیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے شعر ہے :-

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

اس میں شبہ نہیں کہ غزل میں حسنِ ادا کی خوبی کے لئے لازمی عنصر ایمائی اثر آفرینی ہے۔ چاہے لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلتے ہوں یا خود لفظ خوشنما نہ ہوں لیکن اگر شاعر اپنے فکری اور جذباتی محسوسات کی صورتوں میں ذہنی تصرف پر قادر ہو گیا تو ضرور ہے کہ وہ ایمائی اثر پیدا کر سکے گا۔ محسوسات کی مختلف صورتوں میں ذہنی تصرف اس واسطے ضروری ہے کہ وہ انھیں حقیقت سے مجاز کی طرف اور تصریح سے کنایہ کی طرف لے جانا چاہتا ہے کہ بغیر اس کے شعری بلاغت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا اہتمام بھی ہونا چاہیئے کہ رمزی اور مجازی معنی حقیقت سے بالکل منقطع تو نہیں ہو گئے۔ مجاز و رمز کی دنیا میں جس سے غزل عبارت ہے امر معقلی میں تصرف جائز ہی نہیں فرض ہے تاکہ حسنِ ادا جلوہ گر ہو۔ غزل کے لفظوں کے ظاہری معنی کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتے اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ان سے رمزی اثر پیدا ہو جائے تو بس اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے۔

طرز ادا کی اعلیٰ کسوٹی پر اردو غزل نگاروں میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ وہ پست مضمون کو بھی ایمائی زور سے اوپر اٹھا کر آسمان پر پہونچا دیتا ہے۔ یہ ایمائی زور کہاں سے آیا؟ اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ معنوی اور رمزی اثر بہر حال لفظوں ہی کا رہین منت ہوتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ سب نقط بلند اور پست احوال کی طرف ذہن کو منتقل کر سکتے ہیں۔ در اصل لفظوں کی ترتیب و ترکیب ان کی فطرت کو بدل دیتی ہے اور معمولی باتیں سحر بن جاتی ہیں۔

غم کا مضمون بیان کرنا مقصود ہے۔ موت اور کفن کی شعری علامتیں پیش کی گئی ہیں۔ اس فضا میں کیا بلا کی شوخی لفظوں کی مناسب ترتیب نے پیدا کر دی۔ غالب کا شعر ہے۔

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

مرزا یگانہ اسی مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا شعر غالب کے شعر کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ کہتے ہیں۔

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجہ سے لگانا چاہا

سوال یہ ہے کہ مرزا یگانہ کے شعر میں کس چیز کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی تاثیر پھس پھسی رہ گئی ہے سارا طلسم لفظوں کی صحیح ترتیب اور حسن استعمال میں پوشیدہ ہے۔ غالب نے کفن کی مناسبت سے شہیدوں اور حور کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے اندر رمز و ایما کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا یگانہ نے اپنے شعر کو غلط نقطہ سے شروع کیا اور آخر تک غلطی میں مبتلا رہے۔ جامہ زیب اور جوبن کے نقط اس رمزی فضا میں جو وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کھٹکتے ہی نہیں بلکہ ذوق سلیم پر گراں گذرتے ہیں۔

کفن کے مضمون کے ساتھ اس قسم کے لفظوں کا تکلف یا چیلا پن اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ لفظ مقتضائے حال کے مطابق نہیں اس لئے ان کا شعر بلاغت اور تاثیر کے دربار میں بار نہ پا سکا۔
میر صاحب فرماتے ہیں۔

ہم نے جانا تھا کہے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مصحفی نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

مصحفی کے دوسرے مصرع میں رفو کا لفظ ایمائی اثر پیدا کرنے کے بجائے نفس واقعہ کے بیان کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے جس کے باعث شعر بے اثر اور کمزور ہو گیا۔ برخلاف اس کے میر کے شعر میں جدت ادا، بلاغت اور سادگی کی دل نشینی معمولی ذوق رکھنے والے کو بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رفو کا مضمون غالب نے بھی باندھا ہے اور اپنے انوکھے انداز میں باندھا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زخم کو جو میں رفو کرا رہا ہوں تو اس کا مطلب چارہ جوئی یا پاس درد سے غفلت نہیں بلکہ زخم سوزن سے لذت گیر ہونا۔ مرزا کے یہاں ایمائی اثر آفرینی نے مضمون کی غارجیت کو اپنے دامن میں چھپا لیا اور وہ عیب جو مصحفی کے شعر میں نظر آتا ہے مرزا کے شعر میں نہیں۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

رفو کے مضمون سے ملتا جلتا مضمون پیوند یا جوڑ لگانے کا ہے۔
امیر مینائی نے اس مضمون کو عجیب و غریب ندرت سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں

شب وصال بہت کم ہے آسمان سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا

اس شعر میں ایک تو نفس قول کی خوبی ہے جس میں رمز و کنایہ کا خزانہ چھپا ہوا ہے، اس کے علاوہ یہ کہ شاعر نے ایک تیر میں دو نشانے اڑائے ہیں۔ وہ فلک سے شکایت کرتا ہے کہ شب وصال بہت کم ہے اور شب فراق اتنی طویل کہ کاٹے نہیں کٹتی۔ شکایت کے ساتھ اپنے حسب مدعا فلک پیر کو ایک ترکیب بھی بتائی ہے کہ شب جدائی کی درازی میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر شب وصال میں جوڑ دے تو کیا خوب ہو۔ اس طرح شب فراق کی درازی میں کمی پیدا ہو جائے گی اور شب وصال کی مدت کچھ بڑھ جائے گی جو عین مقصود ہے۔

شاعر نے یہ سب باتیں اتنے کم لفظوں میں اور اس سلیقہ سے ادا کر دی ہیں کہ بلاغت ناز کرتی ہے۔ شعر سن کر سامع کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا شب وصال اور شب فراق زندگی کی دائمی کیفیات ہیں جن میں ایک لطیف اور مبہم سا فلق ہے جو تغزل کی جان ہے۔

خواجہ میر درد کا شعر ہے۔

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط   پر آہ میں تو موج نسیم دمیدہ ہوں

بہت بلند شعر ہے۔ اسی مضمون کو ذرا بدل کر رند نے یوں ادا کیا ہے۔

میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

بلاشبہ رند کے شعر کا ایمائی اور رمزی اثر جو لطافت جذبات کی ترجمانی کرتا ہے خواجہ میر درد کے شعر سے بھی بڑھ گیا۔ لفظوں کی ترتیب نے مضمون کی

دلاویزی میں اور اضافہ کر دیا سیدھے سادے لفظ ہیں لیکن ان کا مجموعی اثر
پُراسرار طور پر ذہن میں عجیب و غریب یادیں برانگیختہ کرتا ہے۔

میر تقی میر کا شعر ہے۔

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں کیا عشق میں ہوا ہے لے میر حال تیرا

اگرچہ شعر میں تفصیل زیادہ آگئی ہے لیکن پھر بھی ہر لفظ سے خلوص ٹپکتا ہے جس کی بدولت
تفصیل کا عیب بڑی حد تک چھپ گیا ہے۔ حسرت موہانی نے اسی مضمون میں اپنے
ایجاز بیان سے اور زیادہ نزاکت پیدا کر دی۔ دوسرے مصرعہ میں استفہام کا
لطف خاص طور پر ملاحظہ طلب ہے۔ شعر ہے۔

عشق بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہے؟

سعدی شیرازی کا مشہور شعر ہے۔

دوستان منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

میر تقی میر نے بالکل اسی مضمون کو ذرا سی تبدیلی سے ادا کیا اور پہلے مصرع
میں گناہ کے لفظ کو لا کر لطف کو دوبالا کر دیا۔ شعر ہے۔

پیار کرنے کا جو خوبان ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے

میر صاحب کا شعر ہے۔

دین و مذہب عاشقوں کا قابلِ پرسش نہیں
یہ ادھر سجدہ کریں ابرو جدھر اس کی ہلے

خواجہ میر درد نے بالکل اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے مضمون کو اور زیادہ

نکھار دیا۔ ان کا شعر ہے

ہم جانتے نہیں ہیں لے دردِ کیا ہی کعبہ — جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

اردو غزل میں غالب جدتِ ادا کا امام ہے۔ میر اور مومن بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالب انھیں فاتحانہ انداز میں برتتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لئے بنے ہیں۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

باوجود میر صاحب کی استادی کو ماننے کے غالب کو خود بھی اپنی خوش ادائی کا احساس ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو حسنِ ادا اس کے کلام میں ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں موجود نہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اردو میں مرزا کی غزل میں رمزی اور ایمائی اندازِ بیان اپنے کمال پر پہونچا۔ ذوق کی رسمی معاملہ نگاری کے سمجھنے والوں کے لئے یقیناً غالب کا کلام سمجھنا دشوار ہوا ہوگا جس نے اپنی ابتدائی شاعری میں بیدل کا تتبع کیا تھا۔ چنانچہ انھیں لوگوں کی خیالی پستی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

سطحی علم و نظر رکھنے والے نکتہ چینوں کے جواب میں اس کو کہنا پڑا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بیدلؔ کے تتبع کا زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مرزاؔ نے اپنے ندرت بیان اور جدت تخیل کے لئے اپنا علحدہ طرز ایجاد کیا جو اس کے لئے مخصوص رہا اور آج تک کوئی اس کی پیروی نہ کر سکا۔ اس طرز نے مرزاؔ کو اردو زبان کا عدیم المثال اور کامل شاعر بنا دیا۔ مرزاؔ نے آخری زمانے میں اس طرز کے غریب اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی اشکال باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن، ایمائی اسلوب بیان کا لازمی نتیجہ تھا اس کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرزا صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ حکیم نکتہ دان بھی تھے۔ انھوں نے تغزل میں حکمت و فلسفہ کو بڑی خوبی سے سمویا اور اس طرح زندگی کی بصیرتوں میں اضافہ کیا۔ مرزاؔ کی ان غزلوں کو بھی جن میں کوئی مشکل لفظ نہیں آتا ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔ انھیں سمجھنے کے لئے ایک خاص علوئے ذوق و امتیاز اور علمی بصیرت درکار ہے جس کی کاوش و کاہش کے بغیر رموز و معانی بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ مرزا کا تغزل اردو زبان میں رمز نگاری کا آخری نقطہ ہے۔ وہاں صرف انھیں کی رسائی ہو سکتی ہے جو اس کے سمجھنے کی خاص وجدانی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے سہل ممتنع کی ایمائی کار فرمائیوں میں رموز و معانی کی گہرائی برقرار رہی اس لئے کہ اس کے تخیل کی پرواز کا انداز ہی نرالا اور اچھوتا تھا۔ اس کی نواہائے راز کو محرمان راز ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اپنی رمز نگاری کی جانب کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالبؔ نے عامیانہ خیالات اور مبتذل محاوروں سے ہمیشہ احتراز کیا۔ اگرچہ اس نے رعایت لفظی سے اپنے کلام کے حسن کو دوبالا کیا لیکن اس باب میں بھی اس کی راہ دوسروں سے الگ رہی۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے اس شعر کی بہت تعریف کی اور اسدؔ شاگرد سوداؔ کا یہ شعر پڑھا۔

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی ۔۔۔ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اسد کے تخلص کی وجہ سے دھوکا ہوا کہ یہ شعر شاید مرزا کا ہوگا۔ مرزا شعر کو سن کر برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے "اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی"

لیکن مرزا غالب نے حسن ادا کو چمکانے کے لئے جہاں مراعات لفظی برتی ہیں وہاں شعر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہونچا دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ۔ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔ کیوں ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی ۔ پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی ۔ کیوں ترا راہگذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ۔ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال ۔ دل گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد ۔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس غزل کے ہر شعر میں لفظی اور معنوی رعایت موجود ہے لیکن تصنع نام کو نہیں۔ ہر لفظ اپنا مقام رکھتا ہے اور کس خوبی کے ساتھ رمز و کنایہ سے ہم آہنگ ہے۔ پوری غزل ایمائی تاثیر میں رچی ہوئی ہے۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ معانی کے لئے اور معانی لفظوں کے لئے بنے ہیں۔ یہ تغزل کا کمال ہے۔

مندرجۂ ذیل غزل میں کوئی لفظ مشکل نہیں لیکن مرزا کے اچھوتے طرز ادا نے معمولی لفظوں کو بے پناہ تاثیر، قوت اور وسعت عطا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غزل کا اشکال لفظی نہیں رمزی ہے۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرایش خم کاکل ۔ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لاف تمکین فریب سادہ دلی — ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتار الفت صیاد — ورنہ باقی ہے طاقت پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے — ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

مرزا کے نغموں میں حقیقت جمالی کا انکشاف مختلف پیرایوں میں ہوا ہے۔ اس کے کلام میں کہیں حسن و عشق کی واقعہ نگاری اور اس کے سارے لوازمات ہیں، کہیں رندانہ جسارتوں کی بلند آہنگیاں اور شوخیاں ہیں اور کہیں رموز حیات کی حکیمانہ تعبیر و توجیہہ۔ مرزا کے ہاں داخلیت اور خارجیت دونوں ایک دوسرے میں سموئی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُس نے اس باب میں انتہا پسندی سے پرہیز کیا۔ نہ ایسی دروں بینی ہے کہ غیر خود کا رجود ہی نہ رہے اور نہ ایسی خارجیت ہے کہ جس کی وجہ سے اپنی ذات کے اندرونی تجربوں اور تاثرات کی دنیا بے رنگ و بو ہو جائے۔ خارجیت جب غزل میں برتی جاتی ہے تو محبوب کے خدوخال، چال ڈھال، زلف و رخسار اور قدو قامت کے بیان میں شاعر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ داخلی زندگی کے احوال پیش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ مرزا غالب کی خارجیت جرأت ناسخ اور لکھنؤ کے دوسرے شاعروں کی خارجیت سے بالکل مختلف ہے رمزی اثر آفرینی کی وجہ سے اس میں اندرونی تجربہ کی جھلک ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح مرزا کی دروں بینی میں اگرچہ بعض جگہ ماورائیت پائی جاتی ہے لیکن بالعموم وہ اپنے مجازی رنگ کے باعث اسی دنیا کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ چاہے مضمون کچھ ہی ہو مرزا کے لب و لہجہ کی متانت اور سنجیدگی، لفظوں اور بندشوں کی موزونیت اور رمزی اثر آفرینیاں دلوں کو تسخیر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ بعض دفعہ انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ تاثیر کہاں سے آ گئی۔ مرزا غالب کے ہاں جذبۂ وجدان اور تخیل کا ایسا لطیف امتزاج ملتا ہے کہ اردو کے کسی اور

شاعر کے یہاں اس کی نظیر نہیں۔ غزلوں میں سب ہی بحریں برتی گئیں ہیں لیکن کہیں بھی موسیقیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا کہ شعر کا جادو اسی سے جگایا جاتا ہے۔

حسن و عشق کی داستاں سرائی میں غالب نے تصنع سے احتراز کیا۔ صنائع و بدائع ویسے بھی اس کے کلام میں کم ملتے ہیں لیکن واقعہ گذاری میں ان سے اور بھی بچنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کوئی صنعت یا رعایت آگئی ہے تو وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہے، اور ذوق کہیں بھی انگشت نمائی نہیں کرسکتا واقعہ گذاری کے ضمن میں دوسرے شاعروں کی سی معاملہ بندی کی توقع مرزا سے نہ کرنی چاہیئے۔ اس باب میں بھی اس کا انوکھاپن اور اپج نمایاں ہیں۔ تحسین حسن اور کیفیات محبت کو بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عشق و حسن کے سارے نازک پہلوؤں پر مرزا کی نگاہ پڑی۔ چنانچہ کہیں عجز و نیاز کا اظہار ہے تو کہیں دامنِ محبوب کو حریفانہ کھینچنے کی دعوت

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

ایک اور جگہ محبوب کے دامن کو کھینچنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گریبان کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر جاتے ہیں۔ خود بالکل معصوم بن کر اپنے ہاتھوں کو برا بھلا کہتے ہیں کہ انھیں کسی طرح چین نہیں پڑتا۔ ان کی کھینچا تانی کی عادت نہیں جاتی کبھی میرے گریباں کو چاک کرنے لگتے ہیں، کبھی جاناں کے دامن کو کھینچتے ہیں اس شعر میں رنگِ تغزل اپنی ساری شوخیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

جذبۂ رشک کی عجیب و غریب توجیہہ کرتے ہیں۔ یہ رشک دوسروں سے زیادہ خود اپنی ذات سے ہے۔

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

باوجود محبت کی مایوسیوں کے مرزا پُر امید رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں محبت اور اُمید دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ کہتے ہیں

اس لب سے مِل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض اوقات جرأتِ رندانہ آہ و بکا کے مقابلہ میں حصولِ مدعا کے لئے زیادہ مدد و معاون ہوتی ہے۔ فریاد کی بے اثری کے متعلق کہتے ہیں۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

دوسری جگہ اسی مطلب کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

چاہے وفا اتفاقی ہو یا نہ ہو لیکن ایک لگاؤ ہمیشہ باقی رہنا چاہیئے۔ محبت نہیں تو عداوت ہی سہی۔ بغیر لگاؤ کے زندگی دوبھر ہو جائے گی

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

پھر کس سادگی اور پُرکاری سے اس مطلب کو ادا کرتے ہیں۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کبھی آرزو اس لئے کی جاتی ہے کہ ناکامی کی حسرت سے دل لذت اندوز ہو۔

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں — آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اسی بات کو دوسرے پیرایہ میں یوں کہتے ہیں۔

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تمنا کا سفر کسی منزل پر ختم نہیں کرتا۔ جب ایک منزل پر پہونچ جاتا ہے تو آگے کی منزل کی روشنی اسے دور سے نظر آنے لگتی ہے اور وہ اپنا قدم اس طرف بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس بلند اور حکیمانہ مضمون کو اس خوش اسلوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے کہ حکمت و نغمہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پا پایا

جس منزل پر پہونچ گئے وہ نقش پائے رہرو کے مماثل ہو گئی۔ جب نقش کی طرح اس میں جمود ہے تو دل اس پر کیسے رہ سکے۔ دل تو دائمی حرکت چاہتا ہے۔ کس خوبی سے سوال کرتے ہیں کہ دشت امکاں جب نقش پا کے مثل ہے تو اب تمنا دیکھو اپنا دوسرا قدم کدھر بڑھاتی ہے؟ تمنا کے لئے دشت امکاں کے علاوہ اور دوسرے بہت سے جہاں ہیں جن کی تسخیر اس کا مقصود و منتہا ہے اور جہاں اسباب و علل کی دنیا کی طرح مجبوریاں نہیں۔

غالب کے کلام کا بیشتر حصہ مجاز کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس مجاز سے حقیقت کا دامن بندھا ہوا ہے۔ یہ بھی رمز نگاری کا کمال ہے کہ سامع حقیقت اور مجاز کے دونوں پہلو اپنے ذہن کے مطابق کلام میں سے ڈھونڈھ نکالے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ کبھی خاص حالات میں ایک پہلو مزہ دیتا ہے اور دوسرے حالات میں اسی شعر کا دوسرا پہلو لذت بہم پہونچاتا ہے۔ سعدی حافظ اور دوسرے غزل کے اساتذہ کے کلام میں بھی آپ یہ صفت پائیں گے جس کے باعث ان کے کلام کی ہمہ گیری آج تک مسلم چلی آتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی عشق مجازی کی شورش اور

ستی اور عشق حقیقی کا جذب و عرفان بدرجہ اتم ملتا ہے۔ دونوں صورتوں میں تخیل اور اصلیت ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ رہتے ہیں۔ اُس کی دنیائے خیال میں تنوع ہے۔ اس لئے کہ اس کا اندرونی تجربہ نہایت وسیع ہے۔ حقیقت کے اس پہلو کو جو نامعلوم اور غیر مرئی ہے اور جس کا احساس صرف وجدان کر سکتا ہے غالبؔ نے رمز و کنایہ کی زبان میں بیان کیا چنانچہ اس طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالبؔ کی اس ہمہ گیری میں اس کی عظمت مضمر ہے۔ لیکن بعض جگہ نہایت واضح طور پر مجازی کی گفتگو کی ہے۔ اور اس میں کھینچ تان کرکے حقیقت کے پہلو نکالنا ذوقِ سلیم کے لئے گراں ہے۔ مثلاً یہ شعر سوائے مجاز کے اور کوئی پہلو اپنے اندر نہیں رکھتے۔ لیکن ان میں آپ کہیں عریانی یا ابتذال کا نشان تک نہ پائیں گے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اسی مضمون کا مومنؔ خاں کا شعر بھی خوب ہے۔

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالب کے واقعہ گذاری کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں جن کی خوش ادائی پر بلاغت جتنا ناز کرے کم ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

ہجر و انتظار کی کیفیات غزل گو شاعروں کا ایک عام اور پیش پا افتادہ مضمون ہے جسے غالب نے اپنے ندرت بیان اور حسن ادا سے بالکل دوسرے ہی پیرائے میں پیش کیا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

انتظار اور تمنا کو کس خوبی سے آغوش در آغوش کیا ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا افسون انتظار تمنا کہیں جسے

محبت یکسر انتظار و تمنا ہے۔ آرزو جب تک پوری نہ ہو اس وقت تک انتظار کی زحمت گوارا کرنا محبت کے آداب میں داخل ہے۔ محبت کی فطرت میں صبر و انتظار کے عناصر موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی تکمیل کر سکے۔

دوسری جگہ انتظار کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

ہے آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

محبوب کو کس خوبی سے سمجھاتے ہیں کہ میرا نالہ شکوۂ بیداد نہیں بلکہ تقاضائے ستم ہے تو غلط مت سمجھ۔ یہ شعر رمز نگاری اور واقعہ گذاری دونوں کا اعجاز ہے۔ کہتے ہیں۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اسی مضمون کو دوسرے طور پر یوں بیان کیا ہے۔

گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

شکوے شکایت کے مضمون کو مختلف انداز سے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اسی خیال کو دوسری جگہ یوں باندھا ہے۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ

ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو

حذر کرو مرے دل سے کہ اسمیں آگ دبی ہے

محبوب جب خصوصیت کے ساتھ پردہ کرتا ہے تو اس کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا چھوڑ دو ورنہ خواہ مخواہ لوگوں کو اس طرف متوجہ ہونے کا موقع ملیگا۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

جب وہ پردہ نہیں کرتا اور سامنے آتا ہے تو نظارہ کی تاب نہیں۔ کبھی خود نظارہ کرنے والی نگاہیں رخ جاناں پر بکھر کر پردہ بن جاتی ہیں۔ کبھی بہار کی رنگا رنگی حجاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی خود حسن برق نظارہ سوز بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے[1]

---

[1] کم و بیش اسی مضمون کو اصغر نے بھی بڑے دل آویز طریقہ پر ادا کیا ہے۔

تھیں خود نمود حسن میں شانیں حجاب کی مجھکو خبر رہی نہ رخ بے نقاب کی

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

غرضکہ عجیب شاعرانہ کشمکش ہے۔ اگر محبوب پردہ کرتا ہے تو وہ ناگوار ہے۔ اگر وہ پردہ نہیں کرتا تو تابِ نظارہ نہیں۔ تغافل کا گلہ کرنے گئے اور اس نے ذرا توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں فنا ہو گئے۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

کبھی عشق کی نگاہِ کرم نقابِ حسن کے سب بند ایک ایک کرکے کھول دیتی ہے۔ سب پردے اُٹھنے پر غالبؔ کو یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ نگاہ کا پردہ اب بھی باقی رہ گیا۔ [1]

وا کر دیئے ہیں عشق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

کبھی نظارہ کی تاب لے آتے ہیں لیکن ادائے مطلب کے لئے زبان بند ہو جاتی ہے۔

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا [2]

شوقِ وصل اور شکوۂ ہجراں کا مفصل ذکر کرنے کی خواہش دل ہی دل میں رہتی ہے

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے اُس سے کہ میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غالبؔ کے طرزِ ادا میں بلا کی شوخ نگاری ملتی ہے جس کی نظیر اردو کے کسی دوسرے

---

[1] اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف ایسا حجابِ چشمِ تماشا کہیں جسے (اصغر)
حیرانیٔ نگاہ سے حسرت جمالِ یار تھا پردۂ حجاب میں گو بے نقاب تھا (حسرت)

[2] اسی مضمون کے میرؔ کے متعدد شعر ہیں۔

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
کہتے تھے اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیئے میرؔ وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات
جی میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیئے میرؔ جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر
دل میں کتنے مسودے تھے ولے ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا۔

شاعر کے یہاں نہیں۔ یہ شوخی عشقیہ مضامین تک محدود نہیں بلکہ دوسرے مسائل کو بھی بڑی خوبی سے مس کرتی اور ان کے متعلق ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ شوخی اور البیلا پن داغ کے یہاں بھی ہے لیکن اس میں بعض جگہ خفیف سوقیانہ پن آگیا ہے۔ غالب کی شوخی کا معیار بہت بلند ہے اور اس کے طرز ادا نے اس بلندی میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

زندگی اپنی جب اس طرح سے گذری غالب　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی　　سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز　　سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں　　ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رندانہ مضامین میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے لیکن اس کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قایم رکھا ہے۔ اس طرح شعر کی نزاکت اور باریکی اور زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

یعنی ویسے تو میرے لئے تلچھٹ ہی کافی ہے لیکن یہ بات ساقی پر ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کہیں وہ نہ سمجھے کہ کیسا کم حوصلہ آدمی ہے۔
اس شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر ہو سکتا ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی ترا ملنا اگر دشوار ہوتا تو ہم مایوس ہو جاتے اور تیری جستجو ترک کر دیتے لیکن بڑی دقت یہ ہے کہ نہ دشوار ہے اور نہ سہل۔ یہ احساس کہ تیرا ملنا دشوار نہیں ہے شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتا اور یہ احساس کہ آسان نہیں ہے سعیِ آرزو کے لئے مہمیز کا حکم رکھتا ہے۔

غالب نے اپنے حکیمانہ انداز کے اشعار میں بھی طرزِ ادا کی جدت سے تغزل کی خوبیوں کو قایم رکھا ورنہ یہی مضمون بالکل روکھے پھیکے ہو جاتے اس کے کلام میں واعظانہ مقدمات نہیں ملتے۔ ہاں حکمت و اخلاق کے

مسائل کو رمز و ایما کی زبان میں ادا کیا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کی شاعری خالص تصورات کی شاعری بن گئی ہے جس کو لطافت اور دل نشینی کی رنگ آمیزی نے چار چاند لگا دیے ہیں۔

قبلہ مقصود بالذات نہیں بلکہ محض قبلہ نما ہے مقصود و منتہا کی طرف اس سے رہبری ہوتی ہے اور بس۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

———

کثرت آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

———

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

———

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

حکیمانہ رموز و اسرار کا کس خوبی سے انکشاف کیا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

———

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

———

تنگیٔ دل کا گلہ کیا کہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

———

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

———

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

چمن میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

مرزا غالب کے کلام کی اصلی خوبی ان کے طرزِ ادا کی جدت اور انوکھا پن ہے۔ انھیں معمولی بات بھی اگر کہنا ہے تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں جو جذبہ کی تاثیر اور خیال کی دل کشی میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش میں اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں عام ڈگر سے ہٹ کر نئی علیحدہ راہ اختیار کی ہے اور ضرورت کے وقت لفظی اور معنوی تصرفات سے بھی کام لیا ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔ ان کے مضامین

اور استعاروں کا اچھوتا پن ان کی شاعرانہ بصیرت پر دال ہے۔ بعض جگہ قدما کے مضمون میں تعجب انگیز نزاکتیں پیدا کر دی ہیں۔ در اصل کوئی مضمون کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ جو اس کو دل نشیں انداز میں باندھ دے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب نے جب کبھی دوسرے استادوں کے مضمون مستعار لئے ہیں تو ان میں اپنے بیان کے پیرائے سے کوئی جدت ضرور پیدا کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں

سعدی کا شعر ہے۔

یا وفا خود نبود در عالم — یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اسی مضمون کو مرزا نے اپنے حسن ادا سے اور بلند کر دیا۔

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

خسرو کا شعر ہے۔

جانان اگر شبیست دہن بر دہن نہم — خود را بخواب سازد و گوئیں دہان کیست

غالب اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

خسرو کا دوسرا شعر ہے۔

زہے عمر دراز عاشقان گر — شب ہجران حساب عمر گیرند

غالب کہتے ہیں۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس میں شبہ نہیں کہ خسرو کے شعر میں ایما و اجمال کی جو خوبی ہے وہ غالب کے شعر میں نہیں۔ اس نے غیر ضروری تفصیل اور توضیح سے کام لیا جو خسرو کے یہاں نہیں۔

خسرو کا ایک اور شعر ہے۔

اے گل چو آمدی زز میں گو جگو نہ اند — آن روئیہاکہ در تہہ گرد فنا شدند

میر تقی میر نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر قطعہ چمن پہ ٹک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

غالب نے اس مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

خسرو کا شعر ہے۔

جراحت جگر خستگان چہ می پرسی — زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ شوخ کردیا۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

حافظ دنیائے غزل کا سب سے بڑا امام ہے۔ اس کا تغزل بے مثل ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کو نہیں لایا جاسکتا۔ تاہم یہاں چند ہم مضمون شعر پیش کئے جاتے ہیں جنھیں پہلے حافظ نے باندھا اور اس کے بعد غالب نے ان پر طبع آزمائی کی۔ حافظ کی تنقیص مقصود نہیں۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ قدیم اساتذہ نے جو مضمون غزل میں باندھے ہیں ان میں بعض اوقات ذرا سی تبدیلی کرکے متقدمین نے اور لطف میں اضافہ کردیا اور حسن ادا سے وہ مضمون گویا انھیں کا ہوگیا۔ اس طرح پرانے سے پرانے مضمون میں بھی اچھوتا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جدت ادا سے اس پر نئی چھاپ پڑجاتی ہے۔ اساتذۂ غزل کے چند شعروں کا غالب کے شعروں سے اسی نقطۂ نظر سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب — کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

غالب نے تھوڑے سے تصرف سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بلاشبہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ زود پشیماں کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ کر دیا ہے اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حافظ کا شعر ہے

من ز مطول گشتہ ام از نقش فرشتگان　　قال و مقال عالمے میکشم از برائے تو

غالب کا شعر حسن ادا اور تاثیر میں حافظ کے شعر سے کم نہیں۔ کہتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

عرفی کا شعر ہے

نالہ می کشم بلند درد تو گاہے لیکن　　تا بلب می رسد از ضعف نفس می گردد

غالب نے اسی مضمون میں کیا خوب نزاکت پیدا کر دی۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

فیضی کا شعر ہے

نوش دارو ئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست
سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

میر تقی میر کا شعر ہے۔

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہ کہ گھر سب پھک گیا

میر صاحب کے شعر میں ذوق شعری کوئی کور کسر نہیں نکال سکتا۔ لیکن غالب نے اپنے اعجاز بیان اور حسن ادا سے مضمون کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ وہ اسی بات

کو یوں کہتا ہے۔

دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میر صاحب کا شعر ہے۔

آوے گی اک بلا ترے سر سن لے اے صبا
زلف سیہ کا اس کے اگر تار جائیگا

غالب نے اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔
کہتے ہیں

ہم نکالیں گے سن اے موجِ صبا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہو گے

میر صاحب کا شعر ہے۔

اس نازکی سے گذرے کس کے خیال میں شب
مرجھائے پھول سے ہو جو کچھ ملے وے تم

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں

میر صاحب کا شعر ہے

شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا
سراہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم

میر صاحب کے شعر میں رمزی کیفیت اتنی نمایاں نہیں ہوئی جتنی کہ نفس واقعہ کی توعیت۔ اسی مضمون کو غالب نے تھوڑی سی تبدیلی سے زیادہ بلیغ اور پرلطف بنا دیا۔ شعر ہے۔

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو

میر صاحب جس بات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں غالب نے اجمال سے وہی کام بڑی خوبی سے نکال لیا اور استفہام کے ذریعہ رمزی کیفیت اجاگر کر دی۔
میر صاحب فرماتے ہیں۔

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پہ
میں اس کا خواہاں یاں تک وہ مجھ سے بیزار اس قدر

غالب کا شعر ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میر صاحب کا شعر ہے۔

جب درد دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں

غالب نے اس مضمون میں اپنی خوش ادائی سے اور نزاکت پیدا کر دی

اس کا شعر ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیئے؟

لفظ کرشمہ کی ایمائی اثر آفرینی ملاحظہ طلب ہے۔ شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر بلا تکلف ہو سکتا ہے اور دونوں صورتوں میں معنی کی دلاویزی میں کسی طرح کمی نہیں آتی۔

میر صاحب کا شعر ہے۔

جی ہے جائے ہے میر جو اپنا دیر کی جانب کیا کریئے
یوں تو مزاج طرف کعبہ کے بہترا ہم لاتے ہیں

غالب نے اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آئی

میر صاحب کا شعر ہے

بہر فردوس ہو آدم سو الم کا ہے کو وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کا ہے کو

غالب نے فارسی میں اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ساقی بیار بادہ کہ از دودۂ جمم زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

میر صاحب نے سیدھے سادے لفظوں میں ابتدائے محبت کا نقشہ کھینچا ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

غالب نے اسی مضمون کو اپنی رمز نگاری کی بدولت اور زیادہ بلند کر دیا

ان دونوں شعروں میں میر اور مرزا کا اسلوب بیان اپنے اصلی اور نکھرے

ہوئے رنگ میں نظر آتا ہے۔

رگ و پئے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمایش ہے

تلخی کام و دہن کی آزمایش کے بعد زہر غم رگ و پئے میں اترتا ہے۔ اگر کوئی تلخی کام و دہن سے گھبرا اُٹھے تو وہ منزل عشق کے اس مسافر کے مثل ہوگا جو سفر کے شروع ہی میں تھک کر بیٹھ جائے اور اپنا حوصلہ پست لے۔

طرز ادا کے انوکھے پن کی ایسی مثالیں سوائے غالب کے اور کسی کے یہاں نہیں ملتیں۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ لڑ ناصح سے ناداں کیا ہو اگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی
وہ جو اک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

طرز ادا کی رمزی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لئے بعض اوقات غزل گو شاعر ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جن سے عدم تعین مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً ما، سی، تو اور یہی کے لفظ۔ ان وصفی اور تزئینی کلمات کے استعمال سے رمزی اور ابہامی دونوں کیفیں بڑھ جاتی ہیں اور طلسمی اثر پیدا کرتے ہیں مدد ملتی ہے۔ میر صاحب کے دیوان میں خاصکر ان لفظوں کے استعمال کی مثالیں کثرت سے ہیں میں سمجھتا ہوں اردو کے کسی دوسرے شاعر نے ان لفظوں کو اتنا استعمال نہیں کیا۔ یہاں چند ملاحظہ طلب ہیں۔

جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے رو سا
تب آنکھوں تلے میرے اترتا ہے لہو سا
تعبیر جسے کرتے ہیں ہنگامۂ محشر
وہ یار کے کوچہ کا ہے کچھ شور غلو سا

کعبہ کی یہ بزرگی شرف سب بجا ہے لیکن
دلکش جو پوچھئے تو کب اس آستاں سا ہے
(میر)

سمجھے تو ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی   جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا
(میر)

دل دفعتاً جنوں کا جھپا سا ہو گیا   دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا
(میر)

جلوہ تیرا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا   اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا
(میر)

لطف کہاں وہ بات کئے پر پھول سے جھڑنے لگ جاویں
سچ کلی بھی گل کی اگرچہ یار کے لعل لب سی ہے
تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں
میر تو چپ تصویر سے تھے یہ بات انھوں سے عجب سی ہے

زندگی اپنی خواب کی سی ہے   یہ نمایش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہئے   پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے
مصحفی کے شعر ہیں۔
آج کچھ سینہ میں دل ہے خود بخود بیتاب سا   کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گل تر کیا ہے اس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اس کے ہے اک آب سا

جرأت کے شعر ہیں۔

ہے دشت خار اب اپنے قدم کی برکت سے — قدم قدم پہ بہاریں ہیں سو چمن کی سی
جتاؤں درد محبت تو کس ادا سے کہے — کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دوانہ پن کی سی

دل ہے یا رسیا خدا جانے کہ کیا آفت ہے یہ — تلملاتا ہے پڑا پہلو میں جو سیماب سا

مومن خاں کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا — اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
یہ شوق یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت — دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس پر بھی — نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

زکی دہلوی کا شعر ہے۔

وہ نونہال خوبی نازک ہے دل ربا ہے — عالم ہے اس کی بو میں گل کی شمیم کا سا

داغ کے شعر ہیں۔

عرض وفا پہ دیکھنا انکی ادائے دلفریب — دل میں کچھ اعتبار سا آنکھوں میں کچھ ملال سا
پوچھتے کیا ہو کون تھا ہو نہ ہو وہ ہی داغ تھا — در پہ تمہارے تھا مگر کوئی شکستہ حال سا

فانی کے اشعار ملاحظہ ہوں

نالے وہ اب ہیں لب پہ جو کھوئے ہوئے سے ہیں — آغوش اضطراب میں سوئے ہوئے سے ہیں
غم ہائے روزگار سے ممکن نہیں گریز — یہ بھی ترے ستم میں سموئے ہوئے سے ہیں

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی　　دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردۂ دل سے　　اُمید کی آواز ہے تھرائی ہوئی سی

جگر کے کلام میں بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ایک پوری غزل اسی انداز میں ہے۔

جان ہی بیقرار سی جسم ہے پائمال سا　　اب نہ وہ دل نہ وہ جگر صرف ہے ایک خیال سا
حسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھئے　　وصل کبھی ہے ہجر سا ہجر کبھی وصال سا
یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ　　کچھ انہیں اجتناب سا کچھ مجھے احتمال سا

تو اور سہی کے لفظ بھی اسلوب بیان میں اسی طرح کا ابہام پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً

واماندگی نے مارا اثنا رہ میں ہم کو　　معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو
افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں　　سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو

(میر)

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی

(غالب)

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی　　امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

(غالب)

ساز خیال یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے　　نغمۂ آرزو سنا تو جو یاس بھی سہی

(فانی)

سُن تو لیا ہے حال دل تجھ سے سن کے کیا کہیں　　پھر مرے منہ کی بات ہے کیسی ہی دلنشیں سہی

(فانی)

بعض اوقات شیوۂ نازک خیالی اور طرز ادا کی ندرت اور لطف کو دوبالا کرنے کے لئے شاعر دو تمثیلی تصورات کو ایک دوسرے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ مقصود ہے۔ کبھی تشبیہ و

استعارہ کی ندرت سے اور کبھی مراعات لفظی اور صفات کے استعمال سے بظاہر معانی کا تعین مقصود ہوتا ہے لیکن در اصل اس طرح ایمائی اثر آفرینی کی طرف ذہن کو منتقل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تلمیح و تشبیہ سے کیفیات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سودا نے ان شعروں میں پہلے مجنوں اور کوہکن کا مقابلہ کیا ہے اور پھر ان دونوں کا خود اپنی ذات سے۔

سودا قمار عشق میں مجنوں سے کوہکن بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز لے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

میر صاحب بھی اپنا مقابلہ قیس و فرہاد سے کرتے ہیں اور بڑی آن بان سے کرتے ہیں۔

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور اب مرے عہد میں فسانے ہیں

اپنا مقابلہ مجنوں سے اس طرح کیا ہے۔

گزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے

سودا نے بالکل یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے۔

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

میر صاحب کے کلام میں مقابلے کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ کہیں جنت کا مقابلہ کوئے یار سے کیا ہے۔ کہیں مسجد کا دیر سے اور کہیں بجلی اور اپنے خاشاک آشیاں کی مٹ بھیڑ کرا دی ہے۔

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں مارے اسکی گلی کا ساکن ہرگز ادھر نہ جھانکے

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

اپنی میری ... ... کا ... کرتے ... ... کو کس خوبی سے

خطاب کیا ہے۔ اس شعر میں مقابلہ اور نقل قول کے محاسن نے شعر کی تاثیر کو بڑھا دیا اور سادگی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

کس کی ہوا کہاں کا گل ہم تو قفس میں ہیں اسیر
"سیر چمن کی روز و شب تجھ کو مبارک اے صبا"

محبوب کی جلوہ گاہ اور بہشت کا مقابلہ غالب نے اس طرح کیا ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو
(غالب)

اپنا اور آدم کا مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہمیں محبوب کے کوچہ سے نکلنے میں جو رسوائی نصیب ہوئی وہ آدم کو بھی جنت سے نکلتے وقت نہ ہوئی ہوگی۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
(غالب)

غالب کے اور شعر ملاحظہ ہوں۔

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

ایک طرف محبوب کی وفاداری ہے اور دوسری طرف عشق و محبت کا جھوٹا دعویٰ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بناوٹی جنون اپنے اوپر طاری کرے۔ جس طرح بہار کا یہ اقتضاء ہے کہ جنون سچا اور حقیقی ہو اسی طرح وفا کا یہ اقتضا ہے کہ عشق و شوق کا دعویٰ سچا اور بلا تصنع ہو۔

وفا اور عشق بے بنیاد اور جنون اور فصل گل کی لفظی رعایتوں اور معنوی مناسبتوں نے حسن ادا کے جوہر کو چمکا دیا شعر میں ہر لفظ اپنی جگہ پر نگینہ کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔

زلف کی درازی کا مضمون بہت پرانا اور پامال مضمون ہے۔ غالب نے اس میں عجیب و غریب ندرت پیدا کر دی۔ وہ محبوب کی زلف کا مقابلہ

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

غرضکہ عجیب شاعرانہ کشمکش ہے۔ اگر محبوب پردہ کرتا ہے تو وہ ناگوار ہے اگر وہ پردہ نہیں کرتا تو تابِ نظارہ نہیں۔ تغافل کا گلہ کرنے گئے اور اس نے ذرا توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں فنا ہو گئے۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

کبھی عشق کی نگاہِ کرم نقابِ حسن کے سب بند ایک ایک کرکے کھول دیتی ہے۔ سب پردے اُٹھنے پر حال کو یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ نگاہ کا پردہ اب بھی باقی رہ گیا۔

وا کر دیئے ہیں عشق نے بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا ۱؎

کبھی نظارہ کی تاب لے آتے ہیں لیکن ادائے مطلب کے لیے زبان بند ہو جاتی ہے۔

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں — غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا ۲؎

شوقِ وصل اور شکوۂ ہجراں کا مفصل ذکر کرنے کی خواہش دل ہی دل میں رہتی ہے

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے اُس سے کہ میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غالبؔ کے طرزِ ادا میں بلا کی شوخ نگاری ملتی ہے جس کی نظیر اردو کے کسی دوسرے

۱؎ اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف — ایسا حجاب چشمِ تماشا کہیں نہ تھا (امیر)
حیرانیٔ نگاہ سے حسرت جمالِ یار — تھا پردۂ حجاب میں گو بے نقاب تھا (حسرت)

۲؎ اسی مضمون کے میر کے متعدد شعر ہیں۔

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
کہتے تھے اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیے میر — وہ آ گیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات
جی میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیے میر — جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر
دل میں کتنے مسودے تھے ولے — ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا۔

شاعر کے یہاں نہیں۔ یہ شوخی عشقیہ مضامین تک محدود نہیں بلکہ دوسرے مسائل کو بھی بڑی خوبی سے مس کرتی اور ان کے متعلق ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ شوخی اور البیلا پن داغ کے یہاں بھی ہے لیکن اس میں بعض جگہ خفیف سا سوقیانہ پن آگیا ہے۔ غالب کی شوخی کا معیار بہت بلند ہے اور اس کے طرز ادا نے اس بلندی میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی ۔ سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

زندگی اپنی جب اس طرح سے گذری غالب ۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی ۔ سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ۔ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز ۔ سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ۔ دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ۔ ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۔ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رندانہ مضامین میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے لیکن اس کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قایم رکھا ہے۔ اس طرح شعر کی نزاکت اور باریکی اور زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی ویسے تو میرے لئے تلچھٹ ہی کافی ہے لیکن یہ بات ساقی پر ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کہیں وہ نہ سمجھے کہ کیسا کم حوصلہ آدمی ہے۔

اِس شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر ہو سکتا ہے۔

مُلنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی ترا ملنا اگر دشوار ہوتا تو ہم مایوس ہو جاتے اور تیری جستجو ترک کر دیتے لیکن بڑی دقت یہ ہے کہ نہ دشوار ہے اور نہ سہل۔ یہ احساس کہ تیرا ملنا دشوار نہیں ہے شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتا اور یہ احساس کہ آسان نہیں ہے سعیٔ آرزو کے لئے مہمیز کا حکم رکھتا ہے۔

غالب نے اپنے حکیمانہ انداز کے اشعار میں بھی طرزِ ادا کی جدت سے تغزل کی خوبیوں کو قایم رکھا ورنہ یہی مضمون بالکل روکھے پھیکے ہو جاتے ان کے کلام میں واعظانہ مقدمات نہیں ملتے۔ ہاں حکمت و اخلاق کے

مسائل کو رمز و ایما کی زبان میں ادا کیا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کی شاعری خالص تصورات کی شاعری بن گئی ہے جس کو لطافت اور دل نشینی کی رنگ آمیزی نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

قبلہ مقصود بالذات نہیں بلکہ محض قبلہ نما ہے مقصود و منتہا کی طرف اس سے رہبری ہوتی ہے اور بس۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود　　قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

———•———

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم　　کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

———•———

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نا یافت　　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

———•———

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

حکیمانہ رموز و اسرار کا کس خوبی سے انکشاف کیا ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

———•———

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے

———•———

تنگی دل کا گلہ کیا کہ وہ کافر دل ہے　　کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

———•———

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

———•———

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

حد سے دلِ اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

چمن میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

مرزا غالب کے کلام کی اصلی خوبی ان کے طرزِ ادا کی جدت اور انوکھا پن ہے۔ انھیں معمولی بات بھی اگر کہنا ہے تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں جو بلا کی تاثیر اور خیال کی دلکشی میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش میں اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی علیحدہ راہ اختیار کی ہے اور ضرورت کے وقت لفظی اور معنوی تصرفات سے بھی کام لیا ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔ ان کے مضامین

اور استعاروں کا اچھوتا پن ان کی شاعرانہ بصیرت پر دال ہے۔ بعض جگہ قدما کے مضمون میں تعجب انگیز نزاکتیں پیدا کر دی ہیں۔ در اصل کوئی مضمون کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ جو اس کو دل نشیں انداز میں باندھ دے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب نے جب کبھی دوسرے استادوں کے مضمون مستعار لئے ہیں تو ان میں اپنے بیان کے پیرائے سے کوئی جدت ضرور پیدا کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں

سعدی کا شعر ہے۔

یا وفا خود نبود در عالم　　یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اسی مضمون کو مرزا نے اپنے حسن ادا سے اور بلند کر دیا۔

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

خسرو کا شعر ہے۔

جاناں اگر شبیت دہن بر دہن نہم　　خود را بخواب ساز و مگو کیں دہان کیست

غالب اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

خسرو کا دوسرا شعر ہے۔

زہے عمر دراز عاشقاں گر　　شب ہجراں حساب عمر گیرند

غالب کہتے ہیں۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس میں شبہ نہیں کہ خسرو کے شعر میں ایما و اجمال کی جو خوبی ہے وہ غالب کے شعر میں نہیں۔ اس نے غیر ضروری تفصیل اور توضیح سے کام لیا جو خسرو کے یہاں نہیں۔

خسرو کا ایک اور شعر ہے۔

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند   آں رو‌یہا کہ در تہہ گرد فنا شدند

میر تقی میرؔ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر قطعۂ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر   بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

غالبؔ نے اس مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خسروؔ کا شعر ہے۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی   ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالبؔ نے اسی خیال کو اور زیادہ شوخ کر دیا۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

حافظ دنیائے غزل کا سب سے بڑا امام ہے۔ اس کا تغزل بے مثل ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کو نہیں لایا جا سکتا۔ تاہم یہاں چند ہم مضمون شعر پیش کئے جاتے ہیں جنھیں پہلے حافظ نے باندھا اور اس کے بعد غالب نے ان پر طبع آزمائی کی۔ حافظ کی تنقیص مقصود نہیں۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ قدیم اساتذہ نے جو مضمون غزل میں باندھے ہیں ان میں بعض اوقات ذرا سی تبدیلی کر کے متقدمین نے اور لطف میں اضافہ کر دیا اور حسن ادا سے وہ مضمون گویا انھیں کا ہو گیا۔ اس طرح پرانے سے پرانے مضمون میں بھی اچھوتا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جدت ادا سے اس پر نئی چھاپ لگ جاتی ہے۔ اساتذۂ غزل کے چند شعروں کا غالب کے شعروں سے اسی نقطۂ نظر سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب   کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

غالبؔ نے تھوڑے سے تصرف سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بلاشبہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ دود پشماں کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ کر دیا ہے اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حافظ کا شعر ہے۔

من کہ ملول گشتمے از نفس فرشتگان   قال و مقال عالمے میکشم از برائے تو

غالب کا شعر حسن ادا اور تاثیر میں حافظ کے شعر سے کم نہیں۔ کہتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

عرفی کا شعر ہے

نالہ می کشم بمذ درد تو گاہے لیکن   تا بلب ی رسد از ضعف نفس می گردد

غالب نے اسی مضمون میں کیا خوب نزاکت پیدا کر دی۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

فیضی کا شعر ہے

نوشں دارو ئے محبت ایں اجزا کہ چیست
سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا   کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

میر تقی میر کا شعر ہے۔

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہ کہ گھر سب پھک گیا

میر صاحب کے شعر میں ذوق شعری کوئی کور کسر نہیں نکال سکتا۔ لیکن غالب نے اپنے اعجاز بیان اور حسن ادا سے مضمون کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ وہ اسی بات

کو یوں کہتا ہے۔

دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میر صاحب کا شعر ہے۔

آوے گی اک بلا ترے سر سن لے اے صبا ۔ زلفِ سیہ کا اس کے اگر تار جائیگا

غالب نے اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔

کہتے ہیں۔

ہم نکالیں گے سن اے موجِ صبا بل تیرا ۔ اسکی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

میر صاحب کا شعر ہے۔

اس نازکی سے گذرے کس کے خیال میں شب ۔ مرجھائے پھول سے ہو جو کچھ ملے وہ تم

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں ۔ دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

میر صاحب کا شعر ہے۔

سرا ہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم ۔ شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا

میر صاحب کے شعر میں رمزی کیفیت اتنی نمایاں نہیں ہوئی جتنی کہ نفس واقعہ کی نوعیت۔ اسی مضمون کو غالب نے تھوڑی سی تبدیلی سے زیادہ بلیغ اور پرلطف بنا دیا۔ شعر ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو ۔ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

میر صاحب جس بات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں غالب نے اجمال سے وہی کام بڑی خوبی سے نکال لیا اور استفہام کے ذریعہ رمزی کیفیت اجاگر کر دی۔

میر صاحب فرماتے ہیں۔

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر
میں اس کا خواہاں یاں تلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر

غالب کا شعر ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الہٰی یہ ماجرا کیا ہے؟

میر صاحب کا شعر ہے۔

جب درد دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں   کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں

غالب نے اس مضمون میں اپنی خوش ادائی سے اور نزاکت پیدا کردی

اس کا شعر ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیئے؟

لفظ کرشمہ کی ایمائی اثر آفرینی ملاحظہ طلب ہے۔ شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر بلا تکلف ہو سکتا ہے اور دونوں صورتوں میں معنی کی دلاویزی میں کسی طرح کمی نہیں آتی۔

میر صاحب کا شعر ہے۔

جی ہے جانے ہے میر جو اپنا دیر کی جانب کیا کریئے
یوں تو مزاج طرف کعبہ کے بہترا ہم لاتے ہیں

غالب نے اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

میر صاحب کا شعر ہے

بہر فردوس ہو آدم سو الم کا ہے کو   وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کا ہے کو

غالب نے فارسی میں اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ساقی بیار بادہ کہ از دودۂ جمم   زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

میر صاحب نے سیدھے سادے لفظوں میں ابتدائے محبت کا نقشہ کھینچا ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

غالب نے اسی مضمون کو اپنی رمز نگاری کی بدولت اور زیادہ بلند کردیا

ان دونوں شعروں میں میر اور مرزا کا اسلوب بیان اپنے اصلی اور نکھرے

ہوئے رنگ میں نظر آتا ہے۔

رگ و پئے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمایش ہے

تلخی کام و دہن کی آزمایش کے بعد زہر غم رگ و پئے میں اترتا ہے۔ اگر کوئی تلخی کام و دہن سے گھبرا اُٹھے تو وہ منزل عشق کے اس مسافر کے مثل ہوگا جو سفر کے شروع ہی میں تھک کر بیٹھ جائے اور اپنا حوصلہ پست لے۔

طرز ادا کے انوکھے پن کی ایسی مثالیں سوائے غالب کے اور کسی کے یاں نہیں ملتیں۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ لڑ ناصح سے ناداں کیا ہو اگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی ۔۔۔ وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی
وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

طرز ادا کی رمزی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لئے بعض اوقات غزل گو شاعر ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جن سے عدم تعین مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سا، سی، تو اور ہی کے لفظ۔ ان وصفی اور تزئینی کلمات کے استعمال سے رمزی اور ابہامی دونوں کیفیں بڑھ جاتی ہیں اور طلسمی اثر پیدا کرتے ہیں مدد ملتی ہے۔ میر صاحب کے دیوان میں خاصکر ان لفظوں کے استعمال کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اردو کے کسی دوسرے شاعر نے ان لفظوں کو اتنا استعمال نہیں کیا۔ یہاں چند ملاحظہ طلب ہیں۔

جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے رو سا
تب آنکھوں تلے میرے اترتا ہے لہو سا
تعبیر جسے کرتے ہیں ہنگامۂ محشر
وہ یار کے کوچہ کا ہے کچھ شور غلو سا

کعبہ کی یہ بزرگی شرف سب بجا ہے لیکن
دلکش جو پوچھئے تو کب اس آستاں سا ہے
(میر)

سمجھے تو ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا
(میر)

دل دفعتاً جنوں کا حبابا سا ہو گیا
دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا
(میر)

جلوہ تیرا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا
اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا
(میر)

لطف کہاں وہ بات کئے پر پھول سے جھڑنے لگ جاویں
سرخ کلی بھی گل کی اگرچہ یار کے لعل لب سی ہے
تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں
میر تو چپ تصویر سے تھے یہ بات انھوں سے عجب سی ہے

زندگی اپنی خواب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

مصحفی کے شعر ہیں۔

آج کچھ سینہ میں دل ہے خود بخود بیتاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گل تر کیا ہے اس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جبہ پیراہن گلے میں اس کے ہے اک آب سا

جرأت کے شعر ہیں۔

بدبخت خار اب اپنے قدم کی برکت سے — قدم قدم پہ بہاریں ہیں سو چمن کی سی
جتاؤں درد محبت تو کس ادا سے کہے — کرو کہ مجھ سے یہ باتیں دوانہ پن کی سی

دل ہے یا رب یہ خدا جانے کہ کیا آفت ہے — تلملاتا ہے پڑا پہلو میں جو سیماب سا

مومن خاں کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا — اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
بشوق یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت — دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس پر بھی — نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

ذکی دہلوی کا شعر ہے۔

وہ نونہال خوبی نازک ہے دلربا ہے — عالم ہے اس کی بو میں گل کی شمیم کا سا

داغ کے شعر ہیں۔

عرض وفا پہ دیکھنا اسکی ادائے دلفریب — دل میں کچھ اعتبار سا آنکھوں میں کچھ ملال سا
پوچھتے کیا ہو کون تھا ہو نہ ہو وہ ہی داغ تھا — در پہ تمہارے تھا مگر کوئی شکستہ حال سا

فانی کے اشعار ملاحظہ ہوں

نالے وہ اب نہیں لب پہ جو کھوئے ہوئے سے ہیں — آغوش اضطراب میں سوئے ہوئے سے ہیں
غم ہائے روزگار سے ممکن نہیں گریز — یہ بھی ترے ستم میں سموئے ہوئے سے ہیں

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی — دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردۂ دل سے — امید کی آواز ہے تھرائی ہوئی سی

جگر کے کلام میں بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ایک پوری غزل اسی انداز میں ہے۔

جان ہی بیقرار سی جسم ہے پائمال سا — اب نہ وہ دل نہ وہ جگر صرف ہے ایک خیال سا
حسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھئے — وصل کبھی ہے ہجر سا ہجر کبھی وصال سا
یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ — کچھ انہیں اجتناب سا کچھ مجھے احتمال سا

تو اور سہی کے لفظ بھی اسلوب بیان میں اسی طرح کا ابہام پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً

واماندگی نے مارا آشنا رہ میں ہم کو — معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو
افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں — سو جائیو نہ پیارے اس داستان تلک تو

(میر)

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

(غالب)

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

(غالب)

ساز خیال یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے — نغمۂ آرزو سنا نوحۂ یاس بھی سہی

(فانی)

سن تو لیا ہے حال دل دیکھیے سن کے کیا کہیں — پھر مرے منہ کی بات ہے کیسی ہی دلنشیں سہی

(فانی)

بعض اوقات شیوۂ نازک خیالی اور طرز ادا کی ندرت اور لطف کو دوبالا کرنے کے لئے شاعر دو تمثیلی تصورات کو ایک دوسرے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ مقصود ہے۔ کبھی تشبیہ و

استعارہ کی ندرت سے اور کبھی مراعات لفظی اور صفات کے استعمال سے بظاہر معانی کا تعین مقصود ہوتا ہے لیکن در اصل اس طرح ایمائی اثر آفرینی کی طرف ذہن کو منتقل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تلمیح و تشبیہ سے کیفیات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سوداؔ نے ان شعروں میں پہلے مجنوں اور کوہکن کا مقابلہ کیا ہے اور پھر ان دونوں کا خود اپنی ذات سے۔

سودا قمار عشق میں مجنوں سے کوہکن — بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

میر صاحب بھی اپنا مقابلہ قیس و فرہاد سے کرتے ہیں اور بڑی آن بان سے کرتے ہیں۔

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور — اب مرے عہد میں فسانے ہیں

اپنا مقابلہ مجنوں سے اس طرح کیا ہے۔

گزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں — کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے

سوداؔ نے بالکل یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے۔

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں — کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

میرؔ صاحب کے کلام میں مقابلے کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ کہیں جنت کا مقابلہ کوئے یار سے کیا ہے۔ کہیں مسجد کا دیر سے اور کہیں بجلی اور اپنے خاشاک آشیاں کی مٹ بھیڑ کرا دی ہے۔

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں مارے — اسکی گلی کا ساکن ہرگز ادھر نہ جھانکے

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر — مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

اپنی سیری [illegible] کا [illegible] کرتے ہیں [illegible] کو کس خوبی سے

خطاب کیا ہے۔ اس شعر میں مقابلہ اور نقل قول کے محاسن نے شعر کی تاثیر کو بڑھا دیا اور سادگی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

کس کی ہوا کہاں کا گل ہم تو قفس میں ہیں اسیر
"سیرِ چمن کی روز و شب تجھ کو مبارک اے صبا"

محبوب کی جلوہ گاہ اور بہشت کا مقابلہ غالب نے اس طرح کیا ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو
(غالب)

اپنا اور آدم کا مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہمیں محبوب کے کوچہ سے نکلنے میں جو رسوائی نصیب ہوئی وہ آدم کو بھی جنت سے نکلتے وقت نہ ہوئی ہوگی۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
(غالب)

غالب کے اور شعر ملاحظہ ہوں۔

وفا مقابل و دعوئے عشق بے بنیاد جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

ایک طرف محبوب کی وفاداری ہے اور دوسری طرف عشق و محبت کا جھوٹا دعویٰ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بناوٹی جنون اپنے اوپر طاری کرے۔ جس طرح بہار کا یہ اقتضا ہے کہ جنون سچا اور حقیقی ہو اسی طرح وفا کا یہ اقتضا ہے کہ عشق و شوق کا دعویٰ سچا اور بلا تصنع ہو۔

وفا اور عشق بے بنیاد اور جنون اور فصل گل کی لفظی رعایتوں اور معنوی مناسبتوں نے حسنِ ادا کے جوہر کو چمکا دیا شعر میں ہر لفظ اپنی جگہ پر نگینہ کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔

زلف کی درازی کا مضمون بہت پرانا اور پامال مضمون ہے۔ غالب نے اس میں عجیب و غریب ندرت پیدا کر دی۔ وہ محبوب کی زلف کا مقابلہ

اس کی سروقامتی سے کرتا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ اگر تیری زلف گرہ گیر کے بل کھل جائیں تو وہ تیرے قد سے بھی زیادہ دراز ہے۔ یہ جو تیری سروقامتی کی دھوم ہے اس کی حقیقت زلف کی درازی کے سامنے آشکارا ہو جائے گی۔ محبوب کے قد اور اس کی زلف کے مقابلے سے شعر کی بلاغت کو کس قدر بڑھا دیا۔ شعر ہے۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

زلف کی درازی کا مضمون مومنؔ نے بھی باندھا ہے۔ لیکن وہ غالبؔ کے شعر کی سی رمزی کیفیت نہ پیدا کر سکا جو زلف و قامت کے مقابلے کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ مومنؔ کے شعر کو سن کر نفس واقعہ کی طرف ذہن متوجہ ہوتا ہے جس کے باعث شعر کی دلآویزی اور بلاغت کم ہو گئی۔ شعر ہے۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

ایک جگہ غالبؔ نے آنکھوں اور کانوں کے باہمی رشک کا مقابلہ کیا ہے۔ اگر کبھی آنکھوں کو محبوب کا نظارہ نصیب ہو جاتا تو کانوں کو رشک ہوتا کہ ہم مژدۂ وصال سے محروم ہیں۔ یا اگر کبھی کانوں کو مژدۂ وصال ملتا تو آنکھیں رشک کرتیں کہ ہم دیدار کی ہوس پوری نہ کر سکیں۔ لیکن اب آنکھوں اور کانوں کا باہمی رشک باقی نہیں رہا اس لئے کہ مدت سے نہ تو نظارہ جمال ہی میسر ہوا اور نہ مژدۂ وصال۔ دونوں کی محرومی نے ان میں موافقت پیدا کر دی۔

سے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

غالبؔ نے ایک موقع پر رشک اور عقل کا تقابل اور شاعر کے کان میں دونوں کی سرگوشیاں بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہیں اور نقل قول کی بدولت شعر کی تازگی میں اضافہ کیا ہے۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف   عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یعنی رشک کا یہ شبہ کہ وہ اغیار کے ساتھ اخلاص برت رہا ہے بے بنیاد ہے اس لئے کہ عقل اس شبہ کے پیدا ہونے کے ساتھ چپکے سے کہہ دیتی ہے کہ بھلا وہ آج تک کس کا دوست ہوا ہے کہ اب کسی کا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عقل کی رائے کو رشک کے شبہ پر ترجیح دیتا ہے اور اس طرح اپنے لئے وجہ اطمینان پیدا کر لیتا ہے۔ اندرونی خلش کی یہ داستان کس خوبی سے ان دو مصرعوں میں آگئی ۔

قامت یار اور فتنۂ قیامت کا مقابلہ ملاحظہ ہو۔

ترے سرو قامت سے ایک قد آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کنایۃً مقصود ہے کہ تیری سرو قامتی کے آگے فتنۂ قیامت بھی ہیچ ہے اس کو غالب نے اپنے مخصوص طرز بیان میں ادا کیا کہ چونکہ قامت یار بھی فتنۂ قیامت سے بنا ہے اس لئے فتنۂ قیامت ایک قد آدم کی حد تک کم ہوگیا۔ جو حصہ کم ہوگیا اسی میں فتنہ کی ساری خاصیتیں جمع ہوگئیں ۔ محبوب کے قد و قامت کی یہ ایمائی تعبیر و توجیہ خاص لطف اور شعریت اپنے اندر رکھتی ہے ۔

شب فراق اور قیامت کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میں قیامت کا منکر نہیں ہوں لیکن شب ہجر کے مصائب کے آگے اس کی پریشانیاں ہیچ ہیں انکار اور ثبات نے شعر میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے ۔

(غالب)

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

اپنے گھر اور بیاباں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنون میں اگر گھر برباد ہوا تو کیا مضائقہ ہے۔ بیاباں کی وسعتیں تو ہاتھ آگئیں۔ اس طرح یہ سودا کسی طرح بھی گراں تو نہیں ۔ اس شعر میں اپنے گھر اور بیاباں کا صرف مقابلہ ہی نہیں بلکہ انتخاب بھی ہے۔ جس سے شعر کا لطف دوبالا ہوگیا۔

(غالب)

نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب   دو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں

دوسری جگہ کہا ہے کہ اگرچہ گھر کی ویرانی بھی صحرا کی ویرانی سے کسی طرح کم نہیں لیکن صحرا میں جو آسودگی نصیب ہے وہ گھر میں کہاں اوحشت کی وجہ سے دشت کی ویرانی وحشت کی پرورش کے لئے زیادہ سازگار ہے۔

(غالب)
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

کم و بیش یہی مضمون اس شعر میں بھی بیان کیا ہے۔

(غالب)
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب نے صرف اپنے گھر اور دشت کا ہی مقابلہ نہیں کیا بلکہ محبوب کے گھر اور بہشت کا بھی اپنے خاص انداز میں مقابلہ کیا ہے اور اس ضمن میں بھی ترجیح و انتخاب کا اظہار کیا ہے۔ شعر ہے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

دوسری جگہ اسی مضمون میں عجب ندرت پیدا کی ہے۔ عام طور پر ہمارے شاعر محبوب کے کوچے کو بہشت سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن غالب نے بہشت کو کوچۂ یار سے تشبیہ دی ہے۔ محبوب کا کوچہ بہشت سے اس واسطے قابل ترجیح ہے کہ یہاں عاشقوں کے جمگھٹے کی وجہ سے ہر وقت آبادی رہتی ہے برخلاف اس کے بہشت آباد نظر نہیں آتی۔ مقابلہ اور وجہ ترجیح نے شعر کی ایمائی تاثیر کو کس قدر بڑھا دیا۔ پھر طرز ادا کی طرفگی کی داد نہیں دی جا سکتی شعر ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

غالب کی ایک پوری غزل مقابلوں سے پر ہے جن سے معانی کی مناسبتیں بڑی خوبی سے واضح ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ رمزی اور ایمائی اثر کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ غزل کی ردیف آزمایش نے رکھی ہے۔ آزمائش میں ایک طرح کا معنوی مقابلہ تو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز یا شخص کی آزمائش کرتے ہیں تو کوئی معیار ضرور سامنے رہتا ہے جس سے مقابلہ مقصود ہوتا ہے۔

قیس اور فرہاد سے اپنا مقابلہ کس بلند آہنگی سے کیا ہے۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

قیس و کوہکن کو قد و گیسوئے یار سے واسطہ پڑا اور ہم جس محفل میں ہیں وہاں قد و گیسو کے امتیازات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہاں دار و رسن سے کم پر آزمائش ممکن نہیں۔ پھر خود فرہاد کے حوصلے اور اس کی نیروئے تن کا مقابلہ کیا ہے۔

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر ابھی اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

یعنی نیروئے تن کی آزمائش میں تو اس کی کامیابی غیر مشتبہ ہے اس لئے کہ اس نے جوئے شیر کھود ڈالی۔ لیکن حوصلے کے امتحان میں وہ پورا نہ اترا اور شیریں کے مرنے کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔

دوسری جگہ اور مرزا نے فرہاد پر چوٹ کی ہے کہ تیشہ مار کر مر جانا معمولی بات ہے۔ اس کو چاہئے تھا کہ عام رسم کے خلاف شیریں کے مر جانے کی خبر سن کر زندہ رہتا اور جب تک زندہ تھا اس وقت تک شیریں کے تصور کو اپنا سرمایۂ غم بناتا۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

پھر فرہاد کو طعنہ دیا ہے کہ اس نے رقیب کے لئے عشرت کدہ تعمیر کیا اور خود سر پھوڑ کر مر گیا۔ ہم اس کی نکونامی کے قائل نہیں۔

عشق و مزدوریٔ عشرت کدہ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکونامیٔ فرہاد نہیں

آزمائش والی غزل کے چند اور شعر ملاحظہ طلب ہیں۔

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

نسیم مصر اور یوسف کی بوئے پیرہن کا اس طور پر ذکر کیا ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے سے الگ آمنے سامنے موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نسیم مصر کو پیر کنعاں سے

بھلا ہمدردی کیوں ہونے لگی ہے۔ یہ تو محض ضمنی طور پر تھا کہ انھیں یوسف کی بوئے پیرہن پہنچ گئی۔ حقیقت میں نسیم مصر تو یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش کرنا چاہتی تھی کہ اس کے تصرفات کی حد کیا ہے۔

ایک طرف محبوب کی آمد ہے اور دوسری طرف اہل انجمن کے صبر و شکیب کی آزمائش۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا شاعر نے صبر و شکیب کو آزمائش اور مقابلے کی خاطر اشخاص کی صورت دیدی ہے کہ دیکھیں ان پر کیا گزرتی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

دل وابستہ کو محبوب کی زلف پرشکن سے اس طرح دست و گریباں کیا ہے۔

ڈرا اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تاب زلف پرشکن کی آزمائش ہے [1]

شاعر دل وابستہ کو خطاب کرتا ہے کہ تو خواہ مخواہ رہائی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے؛ اس کی زلف پرشکن کے پیچ و خم ایسے نہیں ہیں کہ تو ان سے رہائی پاسکے۔ تو پہلے بھی آزما چکا ہے اور کیا اب پھر اس کی آزمائش چاہتا ہے۔ تیری اس کوشش کا نتیجہ معلوم ہے۔ یعنی تو کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

مقطع میں ایک تو استفہام انکاری کی خوبی ہے اور دوسرے معشوق کی آمد اور چرخ کہن کے نئے فتنوں کا مقابلہ ہے۔

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے،

وہ آئیں گے یعنی ہرگز نہ آئیں گے وہ ایسے وعدے تو ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔

---

(۱) اسی مضمون کا مرزا کا دوسرا شعر بھی ہے

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دم مرگ
دفع پیکان قضا کس قدر آساں سمجھا

لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ محض ان کے وعدہ کی وجہ سے ہم پر اور کون کون سی نئی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک طرف ان کے آنے کا وعدہ ہے اور دوسری طرف چرخ کہن کے نت نئے فتنوں کی آزمایش۔ استفہام انکاری اور مقابلہ دونوں کے باعث شعر کی ندرت اور حسن ادا کی خوبی نمایاں ہو گئی۔

اس قسم کے مقابلوں کی غالب کے ہاں بیسیوں مثالیں موجود ہیں اور محاسن کلام میں داخل ہیں۔ ایک جگہ فارسی میں اس ضمن میں عجیب و غریب خیال ادا کیا ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ نہ فارسی میں اور نہ اردو میں۔ مضمون یہ باندھا ہے کہ دعویٰ گہ رضا میں ہر شخص اپنے مقصود و تمنا کی جانب رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ گویا کہ اس منزل میں رشک وفا کا منظر نظر آتا ہے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے قصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ باپ اور بیٹا راہ شوق میں مسابقت کے لئے کوشاں ہیں۔ اگر باپ آتش نمرود کی آزمائش میں اپنے کو ڈالتا ہے تو بیٹا بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ وہ باپ کی چھری کے تلے اپنا گلا رکھ دیتا ہے۔ شاعر دو شعروں میں رمز و ایما، بلاغت و ایجاز اور حسن ادا کا کمال دکھا دیتا ہے۔ شعر ہیں۔

رشک وفا نگر کہ بہ دعویٰ گہ رضا ہر کس چہ گونہ در پئے مقصود میرود
فرزند زیر تیغ پدر می نہد گلو گر خود پدر در آتش نمرود می رود

غالب کے فارسی کلام میں اس قسم کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں صرف ایک اور نقل کی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم کے آگ میں نہ جلنے کی تلمیح پیش کرتے ہوئے ان سے اپنا مقابلہ کیا ہے کہ ان کا تو یہ معجزہ تھا کہ وہ آگ میں نہ جلے لیکن میرا معجزہ یہ ہے کہ میں بغیر شعلہ و شرر کے جل رہا ہوں۔

شنیدہ ام کہ بہ آتش نسوخت ابراہیم بہ بین کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

شاعر نے یہ بات غیر مذکور رکھی ہے کہ آیا حضرت ابراہیم کا آگ میں نہ جلنا

بڑا معجزہ تھا یا میرا بغیر آگ کے جلنا۔ اس تقابل کے علاوہ "شنیدہ" اور "دیدن" کے لفظی تقابل نے بھی شعر میں لطف پیدا کر دیا۔

میر صاحب نے محبوب کے دہن سے غنچہ کا مقابلہ اس طرح کیا ہے۔

سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سا دہن غنچہ　　تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کرئے　　تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے وہاں سے

محبوب کا مقابلہ گل سے اس طرح کیا ہے۔

مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار　　گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کرے آوے

غالب نے اپنے اسی مضمون کے ایک فارسی شعر میں عجیب و غریب ندرت پیدا کی ہے۔

شعر ہے:-

گلت را نواز گست را تماشا　　تو داری بہارے کہ عالم ندارد

وہ محبوب کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ تیرا گل لطف گویائی رکھتا ہے اور تیری نرگس لذت دید سے آشنا ہے۔ تیری بہار ایسی پُر کیف ہے کہ فطرت کی بہار میں یہ طرفگی کہاں!

اُردو کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی تصورات کے مقابلے کی مثالیں ملتی ہیں جن سے حسنِ کلام کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

داغ نے محبوب کے چلنے اور ٹھہر جانے کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ آپ خود دونوں حالتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں اسلوب بیان کی بڑی لطافت پنہاں ہے کہ خود مقابلہ کرنے کے بجائے آپ کے ذوق پر اس کو چھوڑ دیا۔ شعر ہے۔

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف　　ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

دوسری جگہ محشر کا مقابلہ محبوب کی ٹھوکر کے فتنہ سے کیا ہے۔

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تیری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
(داغ)

روز جزا اور شب ہجراں کا مقابلہ ملاحظہ طلب ہے۔

آتا جو یہاں روز جزا اے شب ہجراں بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا
(داغ)

فانی نے محبوب کی رعنائی اور اپنی نگاہ کی شوخی کا مقابلہ کیا ہے۔

نگاہ شوق کی رعنائیوں کا کیا کہنا مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہیں
(فانی)

کبھی عاشق کے دل کا مقابلہ محبوب کے جلووں سے کیا جاتا ہے۔

ترے جلووں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اتصال موج و ساحل دیکھنے والے
(جگر)

ہمارے غزل گو شاعروں نے بعض اوقات اپنی گنہ گاری اور رحمت خداوندی کو ایک دوسرے کے مقابل کر دیا ہے اور اس طرح حسن ادا کا ایک خاص پہلو نکالا ہے۔ گویا کہ یہ دو تصورات ہیں جو گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی ضمن میں زہد کی برائی اور رندی اور شراب و میکدہ کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ سب موضوع ایسے ہیں جو غزل کی ساخت میں نہایت خوبی سے کھپتے ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ رمز و ایما کی تیکنک کو ان سے خاص مناسبت ہے اور دوسرے اس لئے کہ غزل گو شاعر کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے مملو ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہی عرفان شناسی مذہبی جذبہ بندگی سے بالاتر ہے۔ عارف کو ہر کہیں ذات بے ہمتا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ سب

کو اسی کی تلاش ہے اور سب اسی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ ممکن ہے رفتار میں فرق ہو اور راستے بظاہر الگ الگ ہوں۔ بقول حافظ۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر کا مزاج اور افتاد طبع ادعا پسندی کی کبھی حریف نہیں ہو سکتی۔ ادعا پسندی کا علمبردار زندگی کے پیچیدہ حقائق کو من مانے طور پر سادہ تصور کر کے صرف اپنے نقطۂ نظر سے انھیں سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے نقطۂ نظر کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے سوائے احتساب نفس کے۔ کٹرپن اور ادعا پسندی کے جلو میں تعصب اور تنگ نظری کا قافلہ چلتا ہے جو ہر اس تصور کو اپنے پاؤں تلے روندتا جاتا ہے جس میں رواداری اور انسانی محبت کی بو ہو۔ یہ ادعا پسندی ایک زمانے میں مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی اسی لئے ہمارے شاعروں نے زہد پر چوٹیں کیں اور اس کی دھجیاں ایک ایک کر کے دکھائیں اور تجریدی یا مذہبی اصول سے زیادہ محبت اور انسانیت کو اہمیت دی۔ انھوں نے ہمارے ادب میں کم و بیش وہی کام کیا جو مغربی ادب کی تاریخ میں ہیومن ازم کی تحریک نے انجام دیا تھا۔ اس تحریک نے رواداری، وسیع مشربی اور توازن خیال کی روایات قائم کیں جن سے اہل مغرب کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ ادعا پسندی اپنے رنگ ہر زمانے میں بدلتی رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس کا رنگ مذہبی تھا اور آج سیاسی ہے۔ غزل گو شاعر کے اشاروں کا دونوں پر اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

گناہ کے تصور کا تعلق جبر و اختیار کے اصول سے ہے جو نہ صرف اسلامی علم کلام کا معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے بلکہ قدیم اور جدید ادب عالیہ میں کسی نہ کسی شکل میں یہ مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہر ٹریجڈی میں جبر و اختیار اور خیر و شر کی کشمکش ضروری ہے۔ غزل گو شاعر کو اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا — کام آپڑا ہے رحمت پروردگار سے

(مائل)

کیا کرے زاہد بیچارہ اسے کیا معلوم — رحم کرتا ہے باندازہ عصیاں کوئی

(اصغر)

رحمت حق نے بہت دیکھ لی ایماں کی بہار
اب ذرا سامنے رعنائی عصیاں کردیں

(اصغر)

مری ہر معصیت ہی مطلع انوار صد رحمت — فضائے دل گناہوں سے منور ہوتی جاتی ہے

(فانی)

امید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے — شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

(فانی)

یہ کیا جانے زاہد کہ اے آب رحمت — مرے جام تیرے کرم کے دُھلے ہوئے ہیں

(حسرت)

نہ ہو اسکی خطاپوشی پہ کیوں ناز گنہ گاری — نشان شان رحمت بن گیا داغ سیہ کاری

(حسرت)

غرق رحمت ہو کے دیکھا جوش دریائے کرم — عفو نے دھبا نہ چھوڑا دامن تقصیر میں

(ثاقب لکھنوی)

مجھ سے گناہ گار پہ یہ بارش کرم — منہ دیکھتا ہوں رحمت پروردگار کا

(جگر)

عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے آہ — کیا منہ دکھاؤں رحمت پروردگار کو

(جگر)

مبارک ہو مبارک ساحل رحمت پہ دم لینا — قدم مارا تو ڈر کیا پیر جا دریائے عصیاں کو

(یگانہ)

بعض شاعروں نے لطف گناہ کو بڑھا چڑھا کر عینی یا شالی شکل میں پیش کیا ہے۔ کبھی گناہ کی یاد دل میں ایسی چٹکیاں لیتی ہے کہ سزا کے خوف کے بجائے شاعر حشر میں بھی اسے اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتا ہے۔

سب اہلِ حشر جب اپنے کئے کو پائیں گے بڑا مزہ ہو جو مجھ کو مرا گناہ ملے

جگر کا شعر ہے:۔

بھڑکا رہا ہوں آتشِ عصیاں ہر ایک سمت پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

غالب نے گناہ کے مضمون میں بھی اپنی شوخی کی الگ راہ نکالی ہے۔ وہ باری تعالیٰ سے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایک اور جگہ اسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

گناہ کرنے میں اپنے حوصلے کی وسعت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہتا ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی تنک آبی سے خشک ہو گیا لیکن میرا دامن کا سرا بھی تر نہ ہونے پایا۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
(غالب)

دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

ایک جگہ غالب ذات باری سے پوچھتا ہے کہ تیری رحمت کس پردہ میں بیٹھ کر آرائش میں مصروف ہے۔ ذرا وہ سامنے تو آئے۔ وہ خود ہماری مجبوریوں کی عذر خواہی کرے گی اس واسطے کہ اسی کے بھروسہ پر تو گناہ کرنے کی جرأت ہوئی۔

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ایک جگہ غالب نے عذرِ گناہ اس خوبی سے کیا ہے کہ گناہ کی ذمہ داری خود

اس پر نہیں بلکہ خالق حیات پر پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تماشائے گلشن کا یہ لازمی اقتضاء ہے کہ دل میں تمنائے چیدن پیدا ہو۔ اب اگر تمنائے چیدن گناہ ہے تو اے بہار کے پیدا کرنے والے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم گناہگار ہیں۔

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم
(نسخۂ حمیدیہ)

مسجد و میخانہ یا کعبہ و میکدہ کی رمزی علامات بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہیں کہ زہد و گناہ کے تصورات ان کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں ظاہر ہے کہ مسجد و میخانہ سے مسجد و میخانہ مراد نہیں اور نہ کعبہ و میکدہ سے کعبہ و میکدہ مراد ہیں۔ یہ لفظ رمزی اور ایمائی اغراض کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے غزل گو شاعروں نے اپنے قلب و نظر کی وسعت کے اظہار کے لئے ان لفظوں کو علامات کے طور پر برتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائیگی۔

میر صاحب کا شعر ہے۔

بس یہی جس کے حسن سے مسجد ہے اور دیر ایسا بتوں کے بیچ وہ اللہ کون ہے

غالب نے دیر و حرم کو واماندگی شوق کی منزلیں قرار دیا ہے۔

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں
(نسخۂ حمیدیہ)

دوسری جگہ اہل کنشت کو یقین دلایا ہے کہ اگر میں کعبہ میں جانے لگا ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنے پرانے رفیقوں یعنی اہل کنشت کے حق صحبت کو بھول گیا۔ استفہام انکاری سے شعر کی خوبی دو بالا ہو گئی۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو؟
(غالب)

داغ نے زاہد کو اس طرح طعنہ دیا ہے۔

چلا ہے کعبہ کو تو خاک چھاننے زاہد
فقط خدا ہی خدا ہے حرم میں خاک نہیں
(داغ)

کبھی کعبہ کی راہ اس لئے مجبوراً اختیار کی جاتی ہے کہ دیر کی راہ نہ مل سکی۔

دیر کی راہ نہ ملتی ہو تو کعبہ ہی سہی
کفر جب کفر نہ بنتا ہو تو ایمان کر دیں
(اصغر)

اگر تقویٰ کی طرف طبیعت مائل نہیں تو پھر رندی ہی سہی۔

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا
(غالب)

عشق اور تقویٰ بڑی مشکل سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں خصوصاً تقویٰ کا جو عمرانی پہلو ہے اس سے عشق کی اکثر ٹکر ہو جاتی ہے۔ سعدی کا شعر ہے۔

ہر کجا سلطانِ عشق آمد نماند
قوت بازوئے تقویٰ را محل

میر صاحب نے ایک موقع پر اہل مسجد کی غلط فہمی بڑے لطف سے رفع کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں دیدہ و دانستہ مسجد میں آیا ہوں بلکہ جا کہیں اور رہا تھا بہک کر مسجد میں پہونچ گیا۔ کہتے ہیں :

مستی میں لغزش ہو گئی معذور رکھا چاہئے
اے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا

چونکہ مے خانہ بند تھا، اس لئے بدرجۂ مجبوری مسجد میں رات گزاری جاتی ہے۔

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی
مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے
(مائل)

محفل وعظ اور میخانہ کی صحبت کا مقابلہ قابل ملاحظہ ہے۔

محفل وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں
(مائل)

بعض اوقات کعبہ سے اکتا کر بت خانہ کی طرف قدم اٹھنے لگتے ہیں۔ مومنؔ کا شعر ہے۔

کعبہ سے جانب بتخانہ پھر آیا مومنؔ کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

خواجہ میر دردؔ نے، جو اپنے زمانے کے بڑے صاحب باطن گذرے ہیں، طریق زہد کا پول اس طرح کھولا ہے۔

غیر از ملال زاہد! کیا ہے طریق زہد میں دل جو شگفتہ جس جگہ ہو جیے فروش ہے

غالبؔ نے بھی زہد پر چوٹیں کی ہیں۔ اس کو زاہد سے یہ شکایت ہے کہ وہ نیکی نیکی کی خاطر نہیں بلکہ صلہ کی توقع میں کرتا ہے۔ عبادات و اعمال کا محرک دنیا کی فلاح یا اُخروی نجات نہ ہونا چاہیئے بلکہ رضائے الٰہی۔ اجر کی طمع خلوص کے منافی ہے۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی پاداشِ عمل کی طمع خام بہت ہے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اور زیادہ شوخی سے ادا کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ایک موقع پر کہا ہے کہ زاہد جس باغ رضواں کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہے اسے ہم مدتوں سے بھلا بیٹھے ہیں اور اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ اس کا خیال بھی دل میں لائیں۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

چونکہ حور کی طمع زاہد کی عبادت کی محرک بنی ہے اس لئے کیا لطف ہو اگر وہ جنت میں نہ جانے پائے اور اس کے ارمان دل کے دل ہی میں رہیں۔

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے
سیر تو جب ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے (داغؔ)

کبھی غزل گو شاعر اپنی رندی کو زاہد اور واعظ کی ریاکاری کے مقابل لے آتا ہے

اس مقابلہ سے دونوں کیرکٹر بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ زاہد جو حسن و عشق کے مزے سے ناآشنا اور مشاہدۂ فطرت کے کیف سے یکسر بیگانہ ہے اپنے تئیں وہ ظاہر کرتا ہے جو وہ حقیقت میں نہیں ہے۔ سوز و ساز حیات سے محروم ہونے کے باعث وہ اپنے عمل میں کبھی حقیقی ہم آہنگی نہیں قائم کر سکتا۔ محض عبادت روحانی تسکین کے لئے کافی نہیں جب تک عقیدت اور سچے عمل کی تڑپ دل میں پیدا نہ ہو۔ زاہد کی روح نامکمل اور اس کی نظر نارسا رہتی ہے اور وہ اپنے نفس کی توسیع اور تہذیب پوری طرح نہیں کرنا چاہتا یہی وجہ ہے کہ وہ ریاکاری کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس کے دل میں چھپ چھپ کر چٹکیاں لیتی ہیں۔ وہ بھی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے لیکن وہ اس پر اپنے زہد و اتقا کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ سیرت کی اس ناہمواری کو حافظ نے یوں ظاہر کیا۔

واعظاں کیں جلوہ برمحراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایان چرا خود توبہ کم تر می کنند

اسی لئے اس نے زاہد کے قول و فعل سے پناہ مانگی ہے۔

از قول زاہد کردیم توبہ
وز فعل عابد استغفر اللہ

غالب نے ایک جگہ واعظ پر کیا خوب پھبتی کسی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں حسب عادت میخانے کے دروازے سے نکل رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت واعظ وہاں داخل ہو رہے ہیں۔ کسی کے کہنے پر یقین نہ آتا لیکن جب خود اپنی آنکھوں دیکھی بات ہو تو انکار کیسے کیا جائے۔ شعر ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

داغ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا۔

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں؟

ہمارے غزل گو شاعر صرف دوسروں ہی کی تنقید پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خود اپنا احتساب نفس کرتے ہیں اور ضرورت ہو تو اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اپنی بات در حدیث دیگراں بیان کرنے میں یقیناً بڑی بلاغت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر بلاغت اس میں ہے کہ آپ دوسروں کی بات اپنے اوپر ڈال کر کہیں شیفتہ نے اپنے اس شعر میں یہی انداز اختیار کیا ہے۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

میر صاحب ہوں یا غالب، مومن ہوں یا ذوق، حسرت ہوں یا جگر ان سبھوں میں تغزل کے بعض مشترک اجزا ملتے ہیں۔ وہ سب اپنے دل کے اندرونی تجربوں کو بیان کرتے ہیں۔ تجربے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ طویل ہو۔ ایک لمحہ کا تجربہ اس سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے جو کچھ زیادہ عرصے تک محسوس کیا گیا ہو اور غیبی جذب کا نتیجہ ہو۔ غزل کا ایک شعر ایک خاص تجربہ کا اظہار ہے۔ تغزل کے لئے زیادہ تر وہ تجربے قدر و قیمت رکھتے ہیں جو حسن و عشق کی طلسمی دنیا میں پیش آئیں کہ اس کے لئے یہی اہم اور ابدی حقایق ہیں۔ اندرونی تجربے کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کرنا چاہیئے چونکہ اثر آفرینی میں ابہام مقصود ہوتا ہے اس لئے تغزل میں رمز و ایما کا اسلوب برتا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مبہم کیفیت اندرونی تجربے پر مبنی ہوتی ہے اسواسطے اس کا اخلاص غیر مشتبہ ہے۔ بعض غزل گو شاعروں کے

ہاں دوسروں کے مقابلے میں خارجیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے جیسے مصحفی اور جرأت وغیرہ۔ ان دونوں کا تغزل اعلیٰ پایہ کا ہے۔ لیکن ان کو وہ رتبہ کبھی نہیں ملا جو میرؔ یا غالبؔ کو نصیب ہوا۔ خارجیت لازمی طور پر بیان کی صفائی اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے جو تغزل کے لئے سازگار نہیں جس کا خمیر رمز و ابہام سے بنا ہے۔

غزل گو شاعر کے دل کو رمز و ابہام اس لئے عزیز ہیں کہ وہ جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انھیں سے ممکن ہے۔ دن کی روشنی کے مقابلے میں رات کی چاندنی جذبات پرستوں کو کیوں پسند ہے؟ بقول فرانسیسی مفکر گویو اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبہ ابہام چاہتا ہے نہ کہ وضاحت خارجی عالم کی اشیا چھنکی ہوئی چاندنی میں عجیب و غریب پر اسرار کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کے قد و خال ہی بدل جاتے ہیں۔ وہ شخص جو مکان کی پیمایش کرنا چاہتا ہے یا درختوں کی نباتی خواص کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو چاہیئے کہ دن کی روشنی میں انھیں دیکھے۔ لیکن وہ شخص جس کو یہ مطلوب نہیں وہ چاندنی رات میں مکانوں اور درختوں کی مجموعی اثر آفرینی سے جتنا لذت اندوز ہوگا اتنا دن کی روشنی میں نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ حقیقت اور خیال کی دھوپ چھاؤں میں جھولا جھولنا پسند کرتا ہے۔ دھوپ چھاؤں ہو یا فطرت کی کوئی دوسری مبہم صورت جو دل کے تاروں کو چھیڑے اہل نظر کو محبوب ہوتی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے قبل اور غروب کے شفقی دھندلکے میں جب تاریکی اور روشنی ہم آغوش ہوتی ہیں دل کیوں پُر اسرار کیفیت محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے صبح اور شام کی مبہم کیفیت روحانی تزکیہ کے لئے موزوں خیال کی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں ان اوقات کے لئے عبادتیں رکھی گئی ہیں۔ فطرت کا پرفسوں ابہام جذبات میں تحیر کی آمیزش کرتا اور ان کی شدت کو بڑھاتا ہے۔ حسن و عشق کی رنگینیوں اور کیفیتوں

کی تکمیل کے لئے سوائے اس فضا کے کوئی اور دوسری سازگار نہیں ہو سکتی اور چونکہ جذبات میں دائمی طور پر مبہم سا تغیر ہوتا رہتا ہے اس لئے جذبات کی زبان کو بھی یہ زیب دیتا ہے کہ وہ مبہم ہی رہے۔ تعین جذبہ کی فطرت کو مجروح کرتا ہے۔ تغزل کے ایمائی ابہام کی بھی یہی توجیہ ہے۔ رمز و ابہام اس کا عیب نہیں ہنر ہے۔ چونکہ ذوق حسن اور لطافتِ جذبات کا اظہار کنایہ و ایماہی کے ذریعہ اثر آفریں ہو سکتا ہے اس لئے ہمارے غزل گو شاعروں نے جو فن کارانہ اسلوب اختیار کیا وہی اس صنعت سخن کے لئے موزوں تھا اور اس سے غنائی اور عشقیہ شاعری کی قدریں معین ہو گئی تھیں۔ لیکن ان قدروں کا معین ہو جانا کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر زمانے کی تنقید اپنی نئی بصیرتوں سے ان کی باز آفرینی کرتی رہے۔ اس باز آفرینی کی بدولت روح تغزل کبھی فرسودہ یا مردہ نہیں ہوگی اور اس کے سدا بہار پھول شامِ جاں کو ہمیشہ معطر کرتے رہیں گے۔

اِنتخابِ غزلیات

وَلی اورنگ آبادی

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہے تیری نین غزالاں سے کہوں گا
بے صبر نہ ہو اے وَلی اس درد سے ہرگاہ
جلدی سے ترے درد کے درماں سے کہوں گا

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا
ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا
مت آئینہ کوں دکھلا اپنا جمال روشن
تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا
مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مست جام خونین
تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا

آج تیری بھواں نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
منہ گل مسند شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ملا ہو گلبدن جس کو اوسے گلشن سوں کیا مطلب
جو پایا وصف یوسف اس کو پیراہن سوں کیا مطلب
وَلی جنت میں رہنا ہی نہیں درکار عاشق کوں
جو طالب لامکاں کا ہے اوسے مسکن سوں کیا مطلب

اے جدائی نہ کر خدا سوں ڈر
بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر
اے وَلی غیر آستانۂ یار
جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

زلف تیری کیوں نہ کھاوے پیچ و تاب   حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر
رحم کر اوس پر کہ آیا ہے ولی   درد دل کا تجھ کوں درماں بوجھ کر

دل کو ہوتی ہے سجن بے تابی   زلف کو ہاتھ لگایا نہ کرو

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

جسے عشق کا تیر کاری لگے   اوسے زندگی جگ میں بھاری لگے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو
کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل سے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لے جاوے

تا حشر سے بوئے گلاب اس کے عرق سے   جس برمنے یک بار وہ گل پیرہن آوے
ہرگز سخن تلخ کو لاوے نہ زبان پر   جس دہن میں یک بار وہ نازک بدن آوے

سراج اورنگ آبادی

مدت سے گم ہوا دل بیگانۂ سراج　　شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیان کروں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجیب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شاہ مبارک آبرو دہلوی

نین سیں نین جب ملائیے گا ۔ دل کے اندر مرے سمائیے گا
آبرو ہجر بیچ مرتا تھا ۔ مکھ دکھا کر اسے جلائیے گا

ٹک باغ میں شتاب چلو اے بہار حسن ۔ گل چشم ہو رہا ہے تمہارے نظارے کوں

سر سے لگا کے پاؤں تلک دل ہوا ہوں میں ۔ یاں تک تو فن عشق میں کامل ہوا ہوں میں

نہ دیوے لے کے دل وہ جعد مشکیں ۔ اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

افسوس ہے کہ مجھ کوں وہ یار بھول جاوے ۔ وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے
یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں ۔ جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے ۔ وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
تسبی کرے فراموش زنار بھول جاوے

مرزا جان جاناں مظہر دہلوی

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی — مجھے ناحق ستایا ہے یہ عشق بدگماں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر — کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا — لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بیکس افسوس — کیا ہوا اُس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا — صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھ سب — پھر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک — جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
شاخِ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں — ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

مت اختلاط کرے نوبہار تو ہم سے — چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

اوس گل کو بھیجتا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ — اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ساتھ

برگِ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا — شاید کہ جا لگے وہ کسی دلربا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کو اپنے تو — یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

الہٰی مت کسو کے پیش رخ انتظار آوے — ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

حنا تیرے کف پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں او دھوں کی نیند کیوں جاتی
الہٰی درد و غم کی سرزمین کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل — یہیں تک تھی ہماری زندگانی

شاہ حاتم

ہاتھ مت کھینچ جنوں تجھکو مرے سر کی قسم — ایک جیب تک بھی ہے تار گریباں کے بیچ

حسن اور عشق ترے فیض قدم کے صدقے — دونوں آباد ہیں ہم گلشن و ہم ویرانہ

کہتے ہیں سبھی مہر بتاں خوب نہیں ہے — سنتا ہی نہیں یہ دل گمراہ کسی کی

میر عبدالحی تاباں

میں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح　　یارب کبھو خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا
ہم بےکسی پہ اپنی نہ رو دیں تو کیا کریں　　دل سا رفیق ہائے ہمارا جدا ہوا

حرم کو چھوڑ نہ ہوں کیوں نہ بتکدہ میں شیخ　　کہ یاں ہر ایک کو ہے مرتبہ خدائی کا

اڑا لیے صبا خاک میری اگر تو　　تو کوچے میں اس بے وفا کے ہی لے جا

کس کس طرح کی دل میں گذرتی ہیں حسرتیں　　ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

کہتے ہیں اٹھ بے گا رونے میں یہ ہیں باتیں　　اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں

غم وصل میں ہے ہجر کا ہجراں میں وصل کا　　ہرگز کسی طرح مجھے آرام ہی نہیں

سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں　　کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں
کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے　　اب کس کے ساتھ پیارے وے دل ربائیاں ہیں

پھر بہار آتی ہے دیوانہ کی تدبیر کرو　　بے خبر کیا ہو شتابی اسے زنجیر کرو
ہوں مقر میں گنہ گار کہ چاہا تم کو　　خوبرویاں مجھے من مانتی تعذیر کرو

محفل کے بیچ سن کے مرے سوز دل کا حال　　بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

محمد امان نثار

ہے جو سینے میں جگر دیکھے ہے انگارا سا — دل جو پہلو میں ہے بیتاب ہے وہ پارا سا
آنکھ لگتی ہے کوئی پل تو ہمیں ہاں اس کا — عالم خواب میں ہو جائے ہے نظارا سا
دل کہیں دیدہ کہیں جی ہے کہیں جان کہیں — گردش چرخ میں ہر ایک ہے آوارا سا

امید شفا ہے لب جاں بخش سے اس کو — شرمندۂ عیسیٰ نہیں بیمار تمہارا
ہم عشق میں تم حسن میں مشہور ہیں دونوں — ہے ذکر ہمارا کہیں اذکار تمہارا

کھول کے بند قبا یوں نہ پھرا کیجے — گل کی ہنسی پر بھی ٹک دھیان کیا کیجے

تجھ بن چمن کی سیر سے کیا یاد لے گئے — جوں لالہ داغ سینے پہ دو چار لے گئے

میر محمدی بیدار دہلوی

طلب میں تیری اک تنہا نہ پائے جستجو ٹوٹا — کہ نایابی سے تیرے تار تار آرزو ٹوٹا
کیا ہنگامۂ گل نے مرا جوش جنوں تازہ — ادھر آئی بہار ایدھر گریباں کا رفو ٹوٹا

اے رشک گل کرے ہے عبث جستجوئے عطر — یک شمہ تجھ شمیم بدن سے ہے بوئے عطر
ہو جس دماغ میں مرے گل پیرہن کی بو — بیدار ہو نہ دیکھو کبھی میل بوئے عطر

کیوں نہ لے گلشن سے باج اس ارغواں سیما کا رنگ
گل سے ہے خوش رنگ تر اس کے حنائی پا کا رنگ

جونہی منہ پر سے اٹھا دی باغ میں آ کر نقاب ۔ اُڑ گیا رنگ چمن دیکھ اُس رخِ زیبا کا رنگ
آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا ۔ سرخ مے، کالی گھٹا اور سبز ہے مینا کا رنگ

بھاتی نہیں ہے باس کسی گل کی اے صبا ۔ کس کی ہوا ہے بُو ہے معطر دماغِ دل

اے بہارِ گلشنِ ناز و نزاکت ہر طرف ۔ تیرے آنے سے ہوئی ہے اور بھی بستاں میں دھوم!

جائیں مشتاقوں کی سب پر آئیاں ۔ بل بے ظالم تیری بے پروائیاں
جیب تو کیا ناصحا دامن کی بھی ۔ دھجیاں کر عشق نے دکھلائیاں
اس صنم اندام گل رخسار کی ۔ جا نفرا نکہت چرا کر لائیاں
سن کے یہ بادِ صبا نے باغ میں ۔ گٹھڑیاں غنچوں کی سب کھلوائیاں

کریں ہیں ناز گل و لالہ اپنی خوبی پہ ۔ ٹک ایک تو بھی تو یاں آ کے جلوہ فرما ہو

ابتک مرے احوال سے واں بے خبری ہے ۔ اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

میر تقی میر

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ۔ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک ۔ پلک تک گیا تو تلاطم کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ۔ دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند ۔ یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا
جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

بے ہوش مئے عشق ہوں کیا میرا بھروسا
آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا

سو بار بیاباں میں گیا محمل لیلیٰ
مجنوں کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا

اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میر کسو کام نہ آیا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا
سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں — دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا
دعوی کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں — سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

آگے جمال یار کے معذور ہو گیا — گل اک چمن میں دیدۂ بے نور ہو گیا
دیکھا جو میں نے یار تو وہ میر ہی نہیں — تیرے غم فراق میں رنجور ہو گیا

وہ مایۂ جاں تو کہیں پیدا نہیں جوں کیمیا — میں شوق کی افراط سے بیتاب ہوں سیماب سا
دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہم نشیں — اب عیش روز وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا
تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو — اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا
رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے — رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

بے کسانہ جی گرفتاری کے شیون میں رہا — ایک دل غم خوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا
پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو — گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا
ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل — اب یہ دعوی حشر تک شیخ و برہمن میں رہا
آہ کس انداز سے گزرا بیاباں سے کہ میر — جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا

گریہ رنگ آیا قید قفس سے شاید — خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا
دی آگ رنگ گل نے واں اے صبا چمن کو — یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشیاں کا
پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے — چہرہ اتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا

ہاتھ سے تیرے اگر میں نیم جاں مارا گیا — سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا
یک نگہ سے بیش کچھ نقصان آیا اس کے تئیں — اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہ عشق میں — دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ — آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے
نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مفت آبروئے زاہدِ علامہ لے گیا
اک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

آزار نہ دے اپنے کانوں کے تئیں اے گُل
آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا

ناکامیٔ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

خوبی کا اس کی بسکہ طلبگار ہو گیا
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا

ہے اس کی صرف زیرلبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا

کیا کہیے آہ عشق میں خوبی نصیب تھی
دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا

کب رو ہے اس سے بات کے کرنے کا مجھکو میر
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہو گیا

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا
اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بُھلایا نہ جائے گا

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

دم آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

تیرے بے خود جو ہیں وہ کیا چیتیں ایسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

گُل نے ہزار رنگ سخن سر کیا و لے دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں
جاویں گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے گر وہ پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی باریاں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا اس مشت خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے وہ جی کے زیان کو بھی ہم سود جانتے ہیں

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن مرض عشق کا علاج نہیں
شہر خوبی کو خوب دیکھا میر جنس دل کا کہیں رواج نہیں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا جو دیکھیں ہم نے یہی خود نمائیاں دیکھیں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں
شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں
ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں تو ہے

عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں
نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میرؔ ترک کر
کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوبِ گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
دوانہ ہو گیا تو میرؔ آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

بزم میں جو ترا ظہور نہیں
شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک
یاد رہتی ترے حضور نہیں
عام ہے یار کی تجلی میرؔ
خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

ہوئے سہتے سہتے جفا کاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر
یہی نالہ کرنا یہی زاریاں

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا
دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا
جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے اُن نے پردہ سا بنا رکھا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا
آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشان — مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا — اب جس جگہ ہے داغ یہاں پہلے درد تھا
عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے — دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

حیرت روئے گل سے مرغ چمن — چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کب ہے — میکدہ اک جہان ہے گویا
وہی شور مزاج شیب میں ہے — میر اب تک جوان ہے گویا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق کیا سو دین گیا ایمان گیا اسلام گیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
کس کس اپنی کل کو رووے ہجراں میں بے کل اس کا
خواب گئی ہے تاب گئی ہے چین گیا آرام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہیے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

ریشوں میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب — اب کیا کرے جنوں کی تدبیر میر صاحب
سر نہ کھنچتے تو وہ تیغ کھنچ نہ سکتی — اپنا گناہ اپنی تقصیر میر صاحب
کھنچتی نہیں کمان اب ہم سے ہوائے گل کی — باد سحر لگے ہے جوں تیر میر صاحب
تم نے خیال میں ہو تصویر سے جو چپ ہو — کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

گل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے بیچ
اس کی سی بو نہ آئی گل و یاسمن کے بیچ
ہے قہر وہ جو دیکھے نظر بھر کے جن نے میر
برہم کیا جہان مژہ برہم زدن کے بیچ

بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

کوئی خواہاں نہیں محبت کا
تو کہے جنس ناروا ہے عشق
میر جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک
رسوائیاں گئی ہیں عقیق یمن تلک
مارا گیا خرام بتاں پر سفر میں میر
اے کبک کہتا جائیو اس کے وطن تلک

گرچہ آوارہ چوں صبا ہیں ہم
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
لے بتاں اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا جنس ناروا ہیں ہم

بلبل کو موا پایا کل پھولوں کی دوکاں پر
اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چمن کا تھا
خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا
رہ میر غریبانہ جاتا تھا چلا روتا
ہر گام گلہ لب پر یاران وطن کا تھا

کل دل آزردہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا
گل لگے کہنے کہو منہ نہ ادھر ہم نے کیا
اس رخ و زلف کی تسبیح ہے ان اکثر میر
ورد اپنا ہی اب شام و سحر ہم نے کیا

دل دفعتہً جنون کا ہتیا سا ہو گیا
دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا

ٹک جوش سا اٹھا تھا مرے دل سے رات کو — دیکھا تو ایک پل ہی میں دریا سا ہو گیا
جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا — اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

اللہ رے غرور و ناز تیرا — مطلق نہیں ہم سے ساز تیرا
کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر — کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا

اندوہ و غم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا
اب کے بھی بہار سے آگے جنوں ہوا
میر اُن نے سرگذشت سنی ساری رات کو
افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا — کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا
جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ — ہائے رے چشم دلبراں کی ادا
بات کہتے میں گالیاں دے ہے — سنتے ہو میرے بد زباں کی ادا
دل چلے جائے ہے خرام کے ساتھ — دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا
خاک میں مل گئے میر ہم جیسے — بے ادائی تھی آسماں کی ادا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تھے برے مغبچوں کے تیور لیک — شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا
تاب کس کو جو حال میر سنے — حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

گل کو محبوب میں قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو باس کیا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن   شوق نے ہم کو بے حواس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی   کیا پتنگے نے التماس کیا
ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں   میرؔ کو تم عبث اداس کیا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا   جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پہ تھی اس کی منزل لیک   سر سے سودائے جستجو نہ گیا
سب گئے، ہوش و صبر و تاب و تواں   لیکن اے داغ! دل سے تو نہ گیا
دل میں کتنے مسودے تھے ولے   ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے   دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

دل خستہ جو لہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو دردِ غم سے فگار تھا
کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا   رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے   یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم   گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا   وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ نکلا   رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا
گلی میں اس کے گیا سو گیا نہ بولا پھر   میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار آیا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

اس چہرہ کی خوبی سے عبث گل کو جتایا
یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

ایسے بت بے مہر سے ملتا ہے کوئی بھی
دل میر کو بھاری تھا جو پتھر سے لگایا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

سرو شمشاد خاک میں مل گئے
تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا

سعی طوف حرم نہ کی ہرگز (قطعہ) آستان پر ترے مقام کیا

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے ہیں سے کعبہ کو سلام کیا

عشق خوباں کو میرؔ میں اپنا قبلہ و کعبہ و امام کیا

یار عجب طرح نگہ کر گیا دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا

تنگ قبائی کا سماں یار کی پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا

وصف خط و خال میں خوباں کے میرؔ نامۂ اعمال سیہ کر گیا

پہونچے ہے کوئی اس تن نازک کے لطف کو گل گو چمن میں جامے سے اپنے نکل پڑا

نظر میں طور رکھ اس کم نما کا بھروسا کیا ہے عمر بے وفا کا

گلوں کے پیرہن ہیں چاک سارے کھلا تھا کیا کہیں بند اُس قبا کا

پرستش اب اسی بت کی ہے ہر سو رہا ہو گا کوئی بندہ خدا کا

کہیں اُس زلف سے کیا لگ چلی ہے پڑے ہے پاؤں بے ڈھب کچھ صبا کا

نہ جانو میرؔ کو ایسا ہی چپکا نمونہ ہے یہ آشوب بلا کا

کہیں ہیں اب کی بہت رنگ اڑچلا گل کا ہزار حیف کہ میں بال و پر نہیں رکھتا

جدا جدا پھرے ہے میرؔ سب سے کس خاطر خیال ملنے کا اُس کے اگر نہیں رکھتا

تا بمقدور انتظار کیا دل نے اب زور بے قرار کیا

دشمنی ہم سے کی زمانے نے کہ جفا کار تجھ سا یار کیا

صد رگ جاں کو تاب دے باہم تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کی! آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ   مذہبِ عشق اختیار کیا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا   اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
گل میں اس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا   ہم کو بن دوش ہوا باغ سے لایا نہ گیا
گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اس بن   جی جو اُچٹا تو کسو طرح لگایا نہ گیا
زر نشینِ رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں   رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

بیکسانہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا   ایک دل غمخوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا
پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو   گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا
آہ کس انداز سے گزرا بیاباں سے کہ میرؔ   جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پرپیچ و تاب   شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانا گیا
گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم   مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

یک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تیں   اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں سی جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی   دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ   آخر آخر میرؔ سر بر آستاں ملا گیا

کب تلک یہ ستم اٹھائیے گا   ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا
شکل تصویرِ بے خودی کب تک؟   کسو دن آپ میں بھی آئیے گا
کہیئے گا اس سے قصۂ مجنوں   یعنی پردے میں غم سنائیے گا
شرکت و شیخ و برہمن سے میرؔ (قطعہ)   کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد   کسی ویرانہ میں بنائیے گا

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہی گھر ہمارا | ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہیے | کیا جانئے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا
یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا | دامن سے باندھ دامن نے ابر تر ہمارا

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانے پر

دامن میں آج میر کے داغ شراب ہے | تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

پچھتائیے نہ کیونکر جی اس طرح سے دے کر | یہ گوہر گرامی ہم مفت کھو چکے ہیں

ہوئے سہتے سہتے جفا کاریاں | کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا | مری آہ نے برچھیاں ماریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز | ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں
تری آشنائی سے ہی حد ہوئی | بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں | کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں | تم تو کرو ہو صاحبی بندہ میں کچھ رہا نہیں
بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم | لیک بہ قدر یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں
نالے کیا نہ کر سنا، نوحے مرے پہ عندلیب | بات میں بات عیب ہے، میں نے تجھے کہا نہیں
آب و ہوائے ملک عشق تجربہ کی ہے میں بہت | کرکے دوائے درد دل کوئی بھی پھر جیا نہیں
ناز بتاں اٹھا چکا دیر کو میر ترک کر | کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

یہ جو چشمِ پُر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

ہے تکلف نقاب وے رخسار
کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم
گھر تھے دو، سو خراب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

کیا میں نے رو کر فشار گریباں
رگ ابر تھا تار تار گریباں

نشاں اشک خونیں کے اڑتے چلے ہیں
خزاں ہو چلی ہے بہار گریباں

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے
نہ رکھا مرے سر پہ بار گریباں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر تجھے بھی یہ خوب جانتے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

بنی نہ اپنی تو اس جنگ جو سے ہرگز میر
لڑائیں جب سے ہم آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

کی راہبری میری صحرائے محبت میں
یاں حضرت خضر آ بھی مدت سے بھٹکتے ہیں

تو طرۂ جاناں سے چاہے ہے ابھی مقصد — برسوں سے پڑے ہم تو لے تیر لٹکتے ہیں

گرمی نہیں ہے ہم سے وہ اے رشک آفتاب — اب آگیا ہے فرق بہت اس تپاک میں
اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

زندگان میں جہاں کے ہم بھی ہیں — ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
جس چمن زار کا ہے تو گل تر — بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے — دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں
بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میر — کاٹیں تھیں کوہکن نے بہت راتیں جاریاں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ — دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں
ناز و انداز و ادا عشوہ و اغماض و حیا — آب و گل میں ترے سب کچھ ہے ہی پیار نہیں
دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح — تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں — میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں
گل کام آوے ہے ترے منہ کے نثار کے — صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا — ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں

دل کھلتا ہے واں صحبت رندانہ جہاں ہو — میں خوش ہوں اسی شہر سے میخانہ جہاں ہو
کچھ حال کہیں اپنا نہیں بیخودی مجھ کو — غش آتا ہے لوگوں کو یہ افسانہ جہاں ہو

وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر　　اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

اُس آفتاب سے تو فیض سب کو پہونچے ہے　　یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو
مغاں سے راہ تو ہو جائے رفتہ رفتہ شیخ　　ترا بھی قصد اگر ترک پارسائی ہو

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے　　یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری رفتہ　　جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے ہے　　ظالم معاف رکھیو میرا کہا سنا تو
آتی بخود نہیں ہے باد بہار اب تک　　دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو
کہہ سانجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک　　جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

بکھری رہے ہیں منہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیونکہ چھپے ہے خواری شب جب ایسے رات کے ماتے ہو
سرو تو دبالا ہوتا ہے، درہم برہم شاخ گل
ناز سے قد کش ہو کے چمن میں ایک بلا تم لاتے ہو
چشم تو ہے اک دید کی جا، پر کب تکلیف کے لائق ہے
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

سایہ میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت　　اس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی گل گئے پر مر کر چمن سے نکلی　　اس مرغ شوق کش کی ٹک تم وفا تو دیکھو

حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق　　کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک ترے ڈھب کو
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر　　کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے　　اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
گو شگفتہ چمن چمن تھے گل　　غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار　　عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بود آدم نمود شبنم ہے　　ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
دیکھ بے دم لگا مجھے کہنے　　ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ
میر کو کیوں نہ مغتنم جانے　　اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ　　ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ
ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا　　کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ
وصل اس کا خدا نصیب کرے　　میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی　　دھوم ہے پھر بہار آنے کی
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور　　ہے یہ تقریب جی کے جانے کی
تیز یوں ہی نہ تھی شب آتش شوق　　تھی خبر گرم اُس کے آنے کی
جو ہے سو پائمال غم ہے میر　　چال بے ڈول ہے زمانے کی

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　یہ نمایش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز　　اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار — قطعہ — کہیو جو کبھی میر بلاکش ادھر آوے
مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو — ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے
کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے — جان ہے تو جہان ہے پیارے

تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے — میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے
بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا — ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

آرزو اس بلند بالا کی — کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب — یعنی ایک بات سی بنائی ہے
بے ستون کیا ہے کوہکن کیسا؟ — عشق کی زور آزمائی ہے
مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر — کیا دوانے نے موت پائی ہے

پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے
کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے
سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سا دہن غنچہ
تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنالی ہے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی ... میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا ... تم نے پوچھا تو مہربانی کی
جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل ... ابتدا پھر وہی کہانی کی

نہیں وسواس جی گنوانے کے ... ہائے رے ذوق دل لگانے کے
میرے تغیر حال پر مت جا ... اتفاقات ہیں زمانے کے
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا ... اور بھی وقت تھے بہانے کے
اب گریباں کہاں کہ اے ناصح ... چڑھ گیا ہاتھ اس دوانے کے
دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے ... آگے آگے تمہارے آنے کے

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی ... بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں ... تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح ... اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ... میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے ... ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ ... سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی ... حق بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے ... نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

زلفیں اس کی ہوا کریں برہم ... ہم کو بھی پیچ و تاب ہے سو ہے

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں ... کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

عمر بھر ہم رہے شرابی سے   دل پر خون کی اک گلابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے   اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میر   ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

بکھرے میں جاں بلب تھے ہم دوری بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب خدا کے ہاں سے
جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے
کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریے
تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے وہاں سے
اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا   ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے   نکہت گل سے آشنا نہ ہوئے
کیا کیا قفس سے ہے سروکارا   موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے

خدا کرے مرے دل کو ٹک اک قرار آوے   کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آوے
ہمیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے   خدا ہی جانے کہ اب کی کب بہار آوے
نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر   کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے

اس گلبدن میں ہر جا دلکش ہے یوں و لیکن — یا سطح رخ جگہ ہے یا کنج لب جگہ ہے
دروازے سے لگے ہم تصویر سے کھڑے ہیں — وارفتگاں کو اس کی مجلس میں کب جگہ ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں — اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے — دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا — آج کسو کی خواہش شاید دل سے ہمارے رخصت ہے

وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اس کے روکے تئیں — بلبل سے آج باغ میں جھگڑے بڑے رہے

واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر — آؤ مے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے — پر اس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی
کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا — عشق نے زور آزمائی کی
اک نگہ میں ہزار دل مارے — ساحری کی کہ دلربائی کی
نسبت اس آستاں سے کچھ نہ ہوئی — برسوں تک ہم نے جبہ سائی کی

دل جا دے ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے
اب ہم تو چلے یاں سے تو رہ جو رہا چاہے
رنگ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی / دیوانگی کسو کی بھی زنجیرِ پا نہ تھی
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے / ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
دیکھے دیارِ حسن کے میں کارواں بہت / لیکن کسو کے پاس متاعِ وفا نہ تھی

آتا نہیں خیال میں خوش رو کوئی کبھو / تو عارِ زاہدو نہ مجھے اس گمان سے
دل میں سودے تھے بہت پر حضورِ یار / نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا تو لیکن / اے شمع کچھ تو تو کہہ تیرے بھی تو زباں ہے

یہ چشم آئینہ دارِ رو تھی کسو کی / نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی
سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی / کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی
جلایا شب اک شعلۂ دل نے ہم کو / کہ اس تند سرکش میں خو تھی کسو کی
نہ تھے تجھ سے نازک میانانِ گلشن / بہت تو کمر جیسے مو تھی کسو کی
دمِ مرگ دشوار دی جان ان نے / مگر میر کو آرزو تھی کسو کی

مرزا محمد رفیع سودا

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل / پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا / لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ دیں کو / خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے — کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روز ہجر کو — پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار — لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ — کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

سودا کہے تھا یار سے ایک مو نہیں غرض — اودھر کھلی جو زلف ادھر دل بکھر گیا

سودا یہ کیا کرے گا نت اس قدر کا رونا — عالم کو اس دوانے مت تا نہ لے ڈبونا

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا — بلاکشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر — مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا
پہنچ چکا ہے سر زخم دل تلک یارو — کوئی سیو کوئی مرہم کرو ہوا سو ہوا
کہے ہے سن کے مری سرگذشت وہ بے رحم — یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا
یہ کون حال ہے احوال دل پہ اے آنکھو — نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا
دیا اسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا — پھر آگے دیکھیے جو ہو سو ہو ہوا سو ہوا

یاں پھر اس شرم سے عیسیٰ نے گذارا نہ کیا   چشم خوباں کے جو بیمار کا چارا نہ کیا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ   یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا   جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

جو ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے   تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں ہے کہ نہیں
پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل   ورنہ یاں کون سا انداز فغاں ہے کہ نہیں

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں   یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا   ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں   تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں
کیوں کر نہ چاک چاک گریبان دل کروں   دیکھوں جو تیری زلف کو میں دست شانہ میں
ہم سا تجھے تو ایک نہیں تجھ سے ہیں کئی   جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانہ میں
سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر   اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

ساقی ہے یک تبسم گل موسم بہار   ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

خوباں میں دلدہی کی روش کم بہت ہے یاں   خواہان جاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یاں

چشم ہوس اُٹھائے تماشے سے جوں حباب — نادیدنی کا دید بس ایک دم بہت ہے یاں
دیکھا جو باغ دہر تو مانند صبح و گل — کم فرصتی طلب کی باہم بہت ہے یاں
سودا کہہ اُس سے دل کی تسلی کے واسطے — گوشہ سے چشم کے نگہ کم بہت ہے یاں

بل بے ساقی تیری بے پروائیاں — جانیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں — اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

یوں پاس بٹھا تو جس کو چاہے — پر جاگہ نہ دیجیو یار جی میں

یار آزردہ ہوا رات جو مے نوشی میں — کیا ہوا ہم سے خدا جانیے بے ہوشی میں

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں — اے الفت چمن ترا خانہ خراب ہو

ترغیب نہ کر سیر چمن کی ہمیں سودا — ہر چند ہوا خوب ہے واں لیک ہوس کو

مے کشاں! روح ہماری بھی کبھی شاد کرو — ٹوٹے گر بزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اس کو ناصحا — ہونی جو کچھ تھی قبلۂ حاجات ہو گئی
مستی سے اُس نگاہ کی لے محتسب خبر — دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی
یارو وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا — نظروں میں سو طرح کی حکایات ہو گئی

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ — کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں گئی رات — آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

نسیم بھی ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہے — ہماری خاک سے کچھ دیکھیو رہا بھی ہے
ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم — ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں — کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

بے وفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی — تیری نسبت تو میاں بلبل سے گل نے خوب کی

اے ہم صفیر فائدہ ناحق کے شور کا — ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو گئے

پاس اب ہمارے تہمت گل کو نہ لا نسیم — دل سے ہوس چمن کی اسیروں نے دور کی

الفت میں کچھ اپنی بھی اثر چاہیئے سودا — ہر چند وفا شیوۂ محبوب نہیں ہے

خواری کا نہ کر اپنی دلا یار سے شکوا — رسوا جو ہوا عشق میں کامل تو وہی ہے

خواجہ میر دردؔ

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

نالہ، فریاد و آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی
دردؔ کو قصہ مختصر دیکھا

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

کون سا دل ہے جس میں خانہ خراب
خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے دردؔ
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر
لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا

ہم جانتے نہیں ہیں اے دردؔ کیا ہے کعبہ
جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

حجاب رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلہ کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
پہونچا اس جا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانے
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب نے پا گیا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنستے ہی رو دیا ہوگا

اس نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

دیکھیے غم سے اب کے جی میرا
نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

حال مجھ غم زدہ کا جس تس نے
جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

قتل سے میرے وہ جو باز رہا
کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

بسان کاغذ آتش زدہ مرے گل رو
ترے جلے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر / مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلوگیری / یہ ایک جیب ہے، سو تار تار رکھتے ہیں
بتوں کے جور اُٹھائے ہزار ہا ہم نے / جو اس پہ بھی دلمیں اختیار رکھتے ہیں
ہر ایک سنگ میں ہے شوخیٔ بتاں پنہاں / خنک یہ سب ہیں پہ دل میں شرار رکھتے ہیں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا / اگرچہ درد اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار / کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو / دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہر چند تجھے صبر نہیں درد و لیکن / اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا / میں بے صبر اتنا ہوں وہ تندخو ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا / تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں / مجھے اپنے رونے ہی سے آبرو ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر / جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے / کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے / ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا / ایک دم آئے اِدھر اُودھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس / تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں / چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے / شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے — وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے
جوں شرارِ ہستیٔ بے بود یاں — بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے — تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
درد تو جو کرے ہے جی کا زیاں — فائدہ اس زیان میں کچھ ہے

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے — معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے — یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے
کہہ بیٹھیو نہ درد کہ اہلِ وفا ہوں میں — اس بے وفا کے آگے جو ذکرِ وفا چلے

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجے کیونکر — ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

یہی پیغام درد کا کہنا — گر صبا کوئے یار میں گزرے
کونسی رات آن ملیے گا — دن بہت انتظار میں گزرے

روندے ہے مثلِ نقشِ قدم خلق یاں مجھے — اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

خبر اپنی لے اے گلستان خوبی — کرے ہے تبسم تیرا گل فروشی

دشوار ہوتی ظالم تجھ کو بھی نیند آنی — لیکن سنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی

میرے غبار کا کچھ پایا نشاں نہ ہرگز — صحرا میں جا صبا نے ہر چند خاک چھانی

مت جا ترو تازگی پہ اس کی — عالم تو خیال کا چمن ہے

سید محمد میر سوز

ہوا دل کہ میں کہتا کہتا دوانا — پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا
کوئی دم تو بیٹھے رہو پاس میرے — میاں! میں بھی چلتا ہوں ٹک رہ کے جانا
مجھے تو تمہاری خوشی چاہیے ہے — تمہیں گو ہے منظور میرا کڑھانا
کہاں ڈھونڈوں جی کو کدھر جاؤں یارب — کہیں جاں کا پاتا نہیں میں ٹھکانا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کہاں اتنا تو پیدا کر — کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

قتل سے یہ بے گنہ راضی ہے اپنے اس لیے — ہاتھ میں ایک روز تو دامان قاتل ہووے گا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا — جو تم سے بتو ہوگا سو اللہ کرے گا

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ — دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب ۔ لے ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند ۔ جو گنہ کیجئے صواب ہے آج

پھیلا دے عشق تیری شوکت و شان ۔ بھائی میرے تو اڑ گئے اوسان
بس غم یار ایک دن دو دن ۔ اس سے زیادہ نہ ہو جیو مہمان
نہ کہ بیٹھے ہو پاؤں پھیلا کر ۔ اپنے گھر جاؤ خانہ آبادان

وے صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں ۔ اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

مرا جان جاتا ہے یارو بچالو ۔ کلیجہ میں کانٹا گڑا ہے نکالو
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی ۔ مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو
خدا کے لیے میرے اے ہم نشینوں ۔ وہ بانکا جو جاتا ہے اسکو بلالو
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے ۔ تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو
نہ آوے اگر وہ تمہارے کہے سے ۔ تو منت کرو گھیرے گھیرے منالو
کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے ۔ اسے جان کندن سے چل کر بچالو
جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے ۔ تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

او مار سیاہ زلف سچ کہہ ۔ بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے ۔ کاٹا نہ ہمیں ترا برا ہو

دل کے ہاتھوں بہت خراب ہوا ۔ جل گیا بل گیا کباب ہوا
اشک آنکھوں سے پل نہیں تھمتا ۔ کیا بلا دل ہی دل میں آب ہوا

یار اغیار ہوگیا ہیہات کیا زمانے کا انقلاب ہوا

منہ دیکھو آئینہ کا تری تاب لا سکے خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

غم ہے یا انتظار ہے کیا ہے دل جو اب بے قرار ہے کیا ہے

شیخ قیام الدین قائم

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون پیا بھر کے ہیں ساتھ آپ جاتا تھا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

مجھ سا جہاں میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلف یار بھی پر اسقدر نہیں

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ
ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھی کی سو چلے
بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ

داماں گل تئیں ہے کہاں دسترس مجھے
تکلیف سیر باغ نہ کرائے ہوس مجھے

دو چیز ہیں یادگار دوراں   تیرا ستم اپنی جاں فشانی

عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے   اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیئے

دل ڈھونڈھتا سینہ میں مری الجھی ہے   اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

انعام اللہ خاں یقین

فصل گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقین
اب کی چلتا ہے جنوں پہ جی ہمارا بے طرح

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقین کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
کیا خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

خواجہ احسن اللہ بیانؔ

مصلحت ترک عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کہتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہونچ
کانوں تلک تو اس کے تو اے نارسا پہونچ

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثل خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

کیا ہوا عرش پہ گیا نالہ
دل میں اُس شوخ کے تو راہ نہ کی

رسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشم تر مجھے
آنا ہے اوس کی بزم میں بار دگر مجھے

سیّد محمد میر اثر

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ ۔ پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر ۔ مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
یوں خدا کی خدائی برحق ہے ۔ پر ہمیں تو اثر کی آس نہیں

مر تو چلے کہاں تلک اب درگذر کریں ۔ یا ہم نہیں اس آہ میں یا آسماں نہیں

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں ۔ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

یاں تغافل میں اپنا کام ہوا ۔ تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

مانا اثر کہ وعدۂ فردا غلط نہیں ۔ لیکن کٹے نہ آج یہ شب انتظار کی

غرض آئینہ داری دل ہے ۔ تیرا جلوہ مجھے دکھاتا ہے

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے ۔ اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

ہر چند جی پہ ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آئیں ۔ آخر نہ رہ سکے ہم بے اختیار آئے

دل نے مجھ سے آخر کیا سو کیا — کیا کہوں مہربان اپنا ہے

دل ہر ایک سے لڑاتے پھرتے ہو — آنکھ تو ہم سے بھی لڑائیے گا
آخر اتنا تو التماس کروں — ہر کسو کی دعا نہ کھائیے گا

فرصت زندگی بہت کم ہے — مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

چل بھی جا جرس غنچہ کی صدا پر نسیم — کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا — ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم — حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

نہ دشت محبت کو سرسبز دیکھا — کئی بار خضر اس بیاباں سے گذرا
ہوئے فرش گل اس کے ہر ہر قدم پر — جو دامن کشاں وہ گلستاں سے گذرا

عشق مجھے اہل بصر کر گیا — اشک کے قطرے کو گہر کر گیا
رہ گئے ہم سوتے ہی افسوس ہے — قافلۂ صبح سفر کر گیا

کہتے ہیں کہ پھر فصل گل آئی ہے چمن میں — کیوں وحشت جنوں دھوم مچانے نہیں دیتا

اس چشم کی گردش تو مجھے لے ہی گئی تھی — پر مصحفی اپنے تئیں میں زور سنبھالا

کیا دید میں عالم کی کروں جلوہ گری کا — یاں عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا
تربت پہ مری برگ گل تازہ چڑھا لے — احسان ہے مجھ پر یہ نسیم سحری کا

میں ادا اس کی کہوں کیا میرے مے نوش نے رات
سر پہ ساقی کے کس انداز سے ساغر مارا
مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا

اک طرفہ مے کدہ میں یہ صحبت ہوئی کہ رات — زاہد کے سر سے بچہ دستار لے گیا
ہرگز بکی نہ جنس وفا گرچہ مصحفی — سو بار اس کو میں سر بازار لے گیا

شوخی تو دیکھو تیر کو سینے سے کھینچ کر — کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے — یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

درد و غم کو بھی ہے نصیب سے شرط — یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

قفس میں ایسے مجھکو تو اسیر کیجو صیاد کہ گھڑی گھڑی وہ ہوئے دم اضطراب اپنا
میرے دم لٹنے کی جو خبر اسکو دی کسی نے دہیں تیر رہ سے قاصد یہ چند لسطر اب اپنا
میں عجیب یہ رسم دیکھی مجھے روز عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اپنا

ایک تیر میں جب اس نے نشانا اڑا دیا اس وقت چٹکیوں میں زمانا اڑا دیا
دست جنوں سے جب کہ لگیں اڑنے دھجیاں ہم نے بھی اپنا جیب سلانا اڑا دیا

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
تجھے کس نے روک رکھا ترے جی میں کیا یہ آئی کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا

بے گانگی ہے اسکی ملاقات میں ہنوز واحسرتا کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز

اے مصحفی اس کوچہ میں دل بسکہ لگا ہے جاتے نہیں ہر چند کرتے ہیں ہم عزم سفر روز

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی تو عشق بولا کہ یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں ہر گل کی اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ

اس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

برق و سیماب نے کہاں پایا — اس دل بیقرار کا عالم
نکلے ہے اس کی زلف پرخم سے — سنبل تابدار کا عالم

آنے دو اُسے جس کے لئے چاک کیا ہے — ناصح ہے گریباں کو سلانے کے ہیں ہم

اور سب تم سے ورے بیٹھے ہیں — ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں
پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے — ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
شیشۂ مے کی طرح اے ساقی — چھیڑ مت ہم کہ بھرے بیٹھے ہیں
مصحفی یار کے گھر کے آگے — ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

رہنے دو مرے سینے میں پیکاں کو نہ چھیڑو — از بہر خدا ناوک جاناں کو نہ چھیڑو
للہ رحم کرو چاک گریبان پہ میرے — یارو کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو
اس دھوم سے آئی ہے بہار ابکی کہ ہر سو — قدغن ہے کہ رگ گل و ریحاں کو نہ چھیڑو
پردہ نہیں ناسور کہ ہو بند کسی سے — بہنے دو میرے دیدۂ گریاں کو نہ چھیڑو
اے ناصحو کچھ فکر کرو چاک جگر کا — بیہودہ مرے چاک گریباں کو نہ چھیڑو
زنہار تری زاہد سے الجھتی ہیں تو آنکھیں — کہتی ہیں کہ اس مرد مسلماں کو نہ چھیڑو
رہنے دو پڑا مصحفی خاک بسر کو — اس غمزدۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو

ہوا ہے عشق کا اظہار دیکھئے کیا ہو — کھنچی ہے اس نے بھی تلوار دیکھئے کیا ہو
تغافلوں نے تری ہم سے روز محشر پر — رکھا ہے وعدۂ دیدار دیکھئے کیا ہو

واں چشم فسوں ساز نے باتوں میں لگایا — دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

لب زخم جگر سیئے ہی بنے ۔ خون دل ہم کو اب پیئے ہی بنے
دل گرا ہی پڑے ہے سینے سے ۔ اب یہ دل ہاتھ میں لئے ہی بنے
یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل ۔ ایک شب اور بھی جیئے ہی بنے

کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفیؔ اسیر ۔ فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

مرغانِ تیز بال سے شکوہ ہے یہ کہ ہائے ۔ ہم کو اسیر چنگل صیاد کر گئے

حسرت پہ اس مسافر بیکس کی روئیے ۔ جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

برق رخسار یار پھر چمکی ۔ اس چمن کی بہار پھر چمکی
میرے گریہ سے آب و تاب آیا ۔ صورت روزگار پھر چمکی

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
ذرا جواب تو دے اٹھ کے اپنے سائل کو
یہ بے نصیب ترے آستاں سے کیا پھر جائے

کون اس باغ سے لے باد صبا جاتا ہے ۔ رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے
دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منت دست ۔ پرزے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا ہے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی ۔ کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

اے وحشتِ جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی
ایک جھٹکے میں لگتا ہے گریباں ٹھکانے
اے مصحفی اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا
لیکن نہ لگا اک یہ پریشاں ٹھکانے

دن جنوں کے ہیں نہ یہ تکلیف کر ناصح ہمیں
ان دنوں چاک گریباں کا سلانا منع ہے

ملنے کو جو تم چاہو تو ہے بات ذرا سی
ایک آن میں ہوتی ہے ملاقات ذرا سی
نرگس تری آنکھوں کو بہت دیکھ رہی ہے
ہو جاوے نگاہوں میں مکافات ذرا سی

او دامن اٹھا کے جانے والے
ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھا لے

تو دیکھے تو اک نظر بہت ہے
الفت تری اس قدر بہت ہے

مجھ کو پامال کر گیا ہے یہی
یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

گل کو نسبت ہے اسی واسطے با اہلِ جنوں
وضع میں اس کی جو اک جامہ دری نکلے ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا
واللہ تری نرگسِ فتاں میں کچھ ہے
خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیرِ چمن سے
داماں میں کچھ ہے نہ گریباں میں کچھ ہے

بلبل کے مشت پر بھی اڑاؤ تو سیر ہے
غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اڑا چلے
نالے تو ہم نے وادیِ غربت میں سر کیے
پر خفتگانِ خاک کو ناحق جگا چلے

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں قفس　　پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے　　کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے　　ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

شاد ہو تو اے شب ہجر　　جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

آیا ہے جب چمن میں نازک نہال میرا
ہر شاخ گل نے اپنے سر کو جھکا دیا ہے

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

اے اسیران کنج قفس آئی ہے بہار　　ایسے میں تم بھی دھوم مچاؤ تو خوب ہے

خار صحرائے جنوں! دست درازی ہے گی　　چاک جاتے ہیں گریباں کو مرے داماں کے

دیدہ! ترشح گریہ ہے ابر بہار سے　　اتنا تو کیجیو کہ مری آبرو رہے

ہلک اب تو گریباں سے اے دست جنوں　　چاک اک جھٹکے میں تا دامن محشر پہنچے

جو کچھ شکستہ قفس کی بھی تیلیاں ملتیں　　تو ہم انھیں کو خس و خار آشیاں کرتے
دی فلک نے ہمیں فرصت اس قدر ورنہ　　کسی طرح تو ترے دل کو مہرباں کرتے

خواجہ میر حسن، حسن

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسن اس نے احساں دوبارا کیا

اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد
ظاہر کا یہ پردا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

امنڈ کے آنکھوں سے یک بار بہ چلے آنسو
ہنسی ہنسی میں جو ذکر وداع یار ہوا

دامن صحرا سے اٹھنے کو حسن کا جی نہیں
پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھکر

انکی جب بزم سے ہم ہو کے بہ تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

اترائیو مت حسن پہ ناداں بہت کچھ
دیکھا ہے ان آنکھوں نے مری جان بہت کچھ

اس بت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسن
یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بری لگے

شب فراق میں رو رو کے مر گئے آخر
یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی

کیا جانئے کہ شمع سے کیا صبح کہہ گئی
اک آہ کھینچ کر جو وہ خاموش ہو گئی

شبنم کی طرح سیر چمن بھی ضرور ہے	رو دھو کے ایک رات یہاں بھی گذاریئے

ہے بڑا کفر ترک عشق بتاں	اپنا ایمان ہم نہ چھوڑیں گے
دل نہ چھوڑے گا تیرا دامن اور	دل کا دامان ہم نہ چھوڑیں گے

جعفر علی حسرت

دل پر نہیں اختیار اپنا	افسوس گیا قرار اپنا
جون لالہ بہار کر رہا ہے	یہ سینۂ داغدار اپنا
کی دل نے بھی آہ بے وفائی	کوئی نہیں غمگسار اپنا

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا	مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط

کرنگ تو اثر کہ اپنے جی سے	اے نالۂ بے اثر گئے ہم
شبنم کی مثال اس چمن میں	شب آئے تھے ہم سحر گئے ہم

شیخ قلندر بخش جرأت

جو راہ ملاقات تھی سو جان گئے ہم	اے خضر تصور ترے قربان گئے ہم
جمعیت حسن آپکی سب پہ ہوئی ظاہر	جس بزم میں باحال پریشان گئے ہم

ایک واقف کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات — جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر — جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

حال اپنا اس کو محفل میں جتا سکتے نہیں — دل پڑا تڑپے و لے ہم تلملا سکتے نہیں
دور بیٹھے ان سے آنکھوں میں یہی کہتے ہیں ہم — تم بلا سکتے نہیں ہم آپ آ سکتے نہیں

درد دل بھی بہت کہا لیکن — اس نے باتیں نہ کچھ سنیں نہ کہیں
روئیے ہے بات بات پر جرأت — ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

مل جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلو — بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ جی — یوں اور کیا جہاں میں کوئی حسیں نہیں

دیکھ لے عیار تو ٹک میری بھی عیاریاں — کرتے ہیں تیرے لئے کس کس کی خاطرداریاں
خواب میں بھی وہ نظر آتا نہیں مدت ہوئی — جاگتے ہی جاگتے کٹتی ہیں راتیں ساریاں

کب بیٹھتے ہیں چین سے ایذا اٹھائے بن — لگتا نہیں ہے جی کہیں لپکا لگائے بن
جب تک نہ بیقرار ہوں پڑتا نہیں قرار — آتا نہیں ہے چین ہمیں تلملائے بن
دیوانہ گر نہوں تو پری رو نہ دیکھیں سیر — بگڑے ہے بات حال پریشاں بنائے بن

اللہ اس شوخ ستمگر کی ادھر ہو کہ نہ ہو — گذرے ہم جی ہی سے اب اس کا گذر ہو کہ نہ ہو
ہر دم اسکی جو ملاقات میں ہو فرق تو آہ — حال ہر لحظہ مرا نوع دگر ہو کہ نہ ہو

ہے یہ مذہب یا دہنی کا نہ جو اس سے کوئی
بگڑے کیسا ہی پہ اس کو وہ منا لیتا ہے
میں ہی رہ جاتا ہوں اس پاس جو غصّے میں تو وہ
بس کسی کے تئیں جلدی سے بلا لیتا ہے

کیا بچارے سرنگوں بیٹھے ہیں اس کی بزم میں
فرقۂ عشاق بھی فرقہ گنہگاروں کا ہے
جس جگہ رہتے ہیں جرأت ہم مریض چشم یار
وہ محلہ شہر میں مشہور بیماروں کا ہے

جو خواہش اس سے آنکھوں میں کروں نظریں ملانے کی
تو کہتے ہیں بنائی تو نے کیوں صورت دوانے کی
گئے ہو جب سے تم یاں سے نہیں سدھ بدھ ہمیں یارو
نہ جینے کی نہ مرنے کی نہ آنے کی نہ جانے کی
دل وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی
دوانا ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

جی کے لگ جانے کا کچھ پایا یاد لا تو نے مزا
ہم نہ کہتے تھے بری ہوتی ہے دیوانے لگی
سوزش پروانہ ہوتی اس طرح کس سے بیاں
جو خموشی میں زبان شمع بتلانے لگی

ہجر میں مضطرب سے ہو ہو کے
چار سو دیکھتا ہوں رو رو کے
ناصحا اس کو چھوڑ دیں کیونکر
جس کو پایا ہو جان کھو کھو کے
گو بلاوے نہ ہم کو وہ جرأت
جاتے ہیں بے قرار ہو ہو کے

قشقہ جو وہ کھینچے تو کھنچی جائے ادھر جان
اور چھوڑ دے زلفوں کو تو بس مار ہی ڈالے
بیہوش سا محفل میں مجھے دیکھ وہ کیا کیا
ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کچھ منہ سے نکالے

دیکھوں جرأت اس کو تو کہتا ہے یہ منہ پھیر کے
کن بری آنکھوں سے دیکھے ہے یہ سودائی مجھے

صحبت اب یار میں اور مجھ میں ہے جوں شعلہ و خس
جوں جوں میں اس کو بڑھاؤں وہ گھٹاتا ہے مجھے

اس کے آنے تک اے دلِ بیمار — جس طرح ہو سکے جئے ہی بنے
تو وہ آرام جاں ہے اے کافر — کہ گلے سے لگا لئے ہی بنے
رہوں جس جا کہیں یہ ہمسائے — اس کو یاں سے اٹھا دئے ہی بنے

تو گیا اور ہم تری صورت کو تکتے رہ گئے — غمزدے روتے تڑپتے سر پٹکتے رہ گئے
عاشقوں کے دلِ بلاق یار کے موتی کی طرح — بوسہ کی خواہش میں اس لب پہ لٹکتے رہ گئے
کارواں جاتا رہا اب اور ہم گم کردہ راہ — گرد کے مانند صحرا میں بھٹکتے رہ گئے
ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ — اور ہم جرأت پلک اپنی جھپکتے رہ گئے

جرأت بلند مرتبۂ عشق ہے بہت — ہم پست ہمتی سے ابھی ہیں ورے ورے

غم مجھے ناتوان رکھتا ہے — عشق بھی اک نشان رکھتا ہے
شوق سننے کا ہے تو بن آکر — دردِ دل کا بیان رکھتا ہے

ہے یہ ہوس کہ رخصت پرواز ایک بار — صحن چمن میں مجھ کو بھی اے باغباں ملے
یہ بھی نہ ہو سکے تو بھلا مجھ اسیر کو — ایک دم قفس میں رخصت آہ و فغاں ملے
اے راہرو خبر وہیں جرأت کی لیجیو — حسرت زدوں کا تم کو جہاں کارواں ملے

محروم ہیں اگرچہ دیدار سے یہ آنکھیں — پر حسن کا کرشمہ دل میں سما گیا ہے

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی — بھری سہاگ کی تس پر یہ بو دلھن کی سی
یہ دشت خار اب اپنے قدم کی برکت سے — قدم قدم پہ بہاریں ہیں سو چمن کی سی
جتاؤں دردِ محبت تو کس ادا سے کہے — کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی

وہ ایک تو ہے بھبھوکا سا تس پہ اے جرأت اگر تحرّی بھی قیامت ہے بانک پن کی سی

اجل گر اپنی خیال جمال یار میں آئے تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
بیک کرشمہ جو بے اختیار کر ڈالے وہ غشوہ ساز کسی کے کب اختیار میں آئے
پس از فنا جو ترے دل جلے کی خاک اڑے تو مضطرب سا دھواں اک نظر غبار میں آئے
اٹھے جہاں سے نہ جرأت اٹھا کے درد فراق الٰہی موت بھی آئے تو وصل یار میں آئے

دور چھوڑا ہمیں گلشن سے یہ رونے کی ہے جا کہ سزاوار اسیری بھی نہ ہم ہائے ہوئے
دم رخصت کہے جرأت کوئی اس کافر سے اک مسلمان کو کیوں جاتے ہو تڑپائے ہوئے

لطف بے یار ہمیں سیر گلستان کب دے دیکھئے دیدۂ گریاں گل خنداں کب دے
آنکھ جس سے ہو لگی وہ ہی نہ ہو پاس تو پھر رنگ آنکھوں میں فضائے چمنستاں کب دے
جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے

ازل سے گرفتار پیدا ہوا ہے یہ دل کیا مزے دار پیدا ہوا ہے
کرو منع ناصح کو ہم سے نہ بولے کہاں کا یہ غمخوار پیدا ہوا ہے
کہے گر کوئی اس سے ملئے کہ جرأت تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
تو کہتا ہے وہ از رہ طعن ہاں جی الٰہی تو خریدار پیدا ہوا ہے

قصد محفل سے وہ اٹھنے کا کرے ہے جس وقت دل بیتاب وہیں مجھ کو جتا دیتا ہے
ہم نشیں مت ہو خفا گر نہ سنوں بات تری اک تصور ہے کہ وہ دھیان بٹا دیتا ہے

ازبسکہ دل سے جرأت بندے ہیں حسن کے ہم — سجدہ کریں اسی میں مسجد جو ہے پری کی

بھاری تھے قافلے سب فریاد سے ہماری — بے تابیوں کے مارے ہم کارواں سے نکلے
شب بزم یار میں ہم بیٹھے تو تھے پر اسکی — چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یاں سے نکلے
اس انجمن میں جرأت سب کامیاب آئے — حسرت بھرے پُر ارمان اک ہم وہاں سے نکلے

مجھ سے پوچھے ہے بگڑ کر وہ حقیقت میری — کچھ تو اے بے خبری بات بنانے دے مجھے
انگلیاں پاؤں کی اب اپنی وہ دبوائے ہے — کچھ تو اے پاس ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے
تو بھی پھر پوچھیو جرأت سبب حیرانی — پہلے آئینہ ذرا اسکو دکھانے دے مجھے

مت خفا ہو اک دم یاں بیٹھنے سے اسقدر — ٹک نہیں بس دیکھ کر اے مہرباں اٹھ جائیں گے
ہم بھی اس باغ جہاں میں شب کی شب مہماں ہیں — مثل شبنم صبح کو گریہ کناں اٹھ جائیں گے
تب متاع عشق کا سودا ہے جرأت کہ جب — وسوسے سود و زیاں کے سب یہاں اٹھ جائیں گے

مجھ کو ڈر ہے کہ کرے خسرو زیبا یہ کہیں — زیر پا اس دل مضطر کو دبائے رکھئے
بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرت شوق — آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھئے
جب وہ بگڑے ہے تو کہتے ہیں یہی ناز و غرور — منہ بنائے ہوئے تیوری کو چڑھائے رکھئے
ہوئے محفل میں جو وہ تو یہی جی چاہے ہے — روز و شب بس یونہی صحبت کو جمائے رکھئے
کچھ لگاوٹ کا سبب اور نہیں پر جرأت — یہ وہ چاہے ہے کہ اس کو بھی لگائے رکھئے

زنجیر خوب اُس در پہ جو درباں نے لگائی — کیا آہوں کی دھونی دل نالاں نے لگائی
جامہ ترے وحشی کو کسی نے جو پہنایا — قینچی وہیں گردن میں گریباں نے لگائی
اک آن پلک سے نہیں لگتی پلک اے وائے — بے تابی یہ مجھکو تری مژگاں نے لگائی

ہم کلام اتنے نہ جرأت سے ہو تم رک رک کر — بات اس بات سے کچھ اور میاں کھلتی ہے

جی جلا کر دل میں ہے صدقے تمہارے جائیے — اس میں گو رسوائی ہو یا جی سے مارے جائیے
دیکھ مضطر بزم میں مجھکو یہ آنکھوں میں کہا — پھر بھی آنا ہے تو یاں سے اک کنارے جائیے
گو بہر صورت میاں جرأت بگاڑے تم نے، — آپ ہر صحبت کے نقشے کو سنوارے جائیے

بھری جو حسرت و یاس اپنی گفتگو میں ہے — خدا ہی جانے کہ بندہ کس آرزو میں ہے
یہ حال ہے ترے وحشی کے جیب و دامن کا — کہ چاک چاک میں ہے اور رفو رفو میں ہے
سنگھا بدن کو کہا کس مزے سے چتون میں — ربودگی یہ کبھی عطر کی بھی بو میں ہے
حجاب چشم کو جرأت نے دی بصارت تو — کسی جو پردہ نشیں کی یہ آرزو میں ہے

پھرتے ہیں دن کو کو بکو گذرے ہے شب کراہتے — سہتے یہ کیوں خرابیاں گر نہ کسی کو چاہتے

یاد کس گل کی تھی یارب مرے تن میں لگی — آگ سی دل میں جو سیر گل و گلشن سے لگی
رنگ یہ لائی کہ حسرت سے بسا جائے ہے دل — اس کے قدموں سے حنا ہائے عجب فن سے لگی
تھوڑی تھوڑی ہوئی جاتی تھی وہ کیا ہے جرأت — شمع شرمانے جو شب اس مہ روشن سے لگی

ٹک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو اب مجھے — جوں بوئے گل کرے ہے زخود رفتہ بو مری
یارب یہ کس کے گھر سے میں نکلا کہ خلق میں — ہے داستان دربدر و کو بکو مری

ہے شوخ کا مار زلف کالا کالا کافر — حلقہ مارے ہے تس پہ بالا کافر
اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا — "جادو بر حق ہے کرنے والا کافر"

شب ہجراں نہیں بلا ہے یہ
صبح ہوتی نہیں ہے کیا ہے یہ

ناصح میں اور ہم میں ہیں طرز سمجھتیں
ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جاتے ہے

جوش گل چاک چمن سے دم بدم دیکھا کیے
سب لٹے بوٹی بن بنا رہیں اور ہم دیکھا کیے

میر انشاء اللہ خاں انشاؔ

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شئے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مئے لا

نکل کے وادی وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ لیا عذاب الٹا

یہ عجب مزا ہے یارو کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

گر یار مئے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

چند مدت کو فراق صنم و دیر تو ہے
چلو پھر کعبہ ہی ہو آئیں بھلا سیر تو ہے

جھڑکی سہی ادا سہی چین جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی،
گر نازنیں کے کہنے سے مانا برا ہو کچھ
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

غنچۂ گل کی صبا گود بھری جاتی ہے
اک پری آتی ہے اور ایک پری جاتی ہے

شیخ ابراہیم ذوق

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
ہے حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا
بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا
ہے قطع رہ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

وہ ہوں میں وہ تو رد شوق میرے ساتھ جاتا ہے
بہ رنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا!

آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

دیوے ساقی جسے اک جام وہ دعوے سے کہے　　آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس
زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو　　پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاس انفاس

نگہ نہیں حرف دل نشیں تھا، دہن کی تنگی سے تنگ ہوکر
جو نکلا آنکھوں کے راستے سے تو دل میں بیٹھا خدنگ ہوکر

ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں　　ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں
خوبیاں یوں تو ہیں اس عالم تصویر میں سب　　اک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں
یہ نہیں شیشۂ مئے ہے کسی میخوار کا دل　　محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی　　باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا　　کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
نازک کلائیاں مری توڑیں عدو کا دل　　میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

پھر اس مژہ کو یاد کرے دل تو دل ہی ذوق　　نشتر چبھو کے میں ہر نشتر کو توڑ دوں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں　　واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں　　وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

ہے ان کی سادگی بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ　　سیدھی سی بات بھی ہے تو ایک بانکپن کے ساتھ
ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں　　ٹکڑے اڑا دے جسم کے تو پیرہن کے ساتھ

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے　　مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے　　اف ری بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے　　اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے
ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے　　فلک کو ہم کسی کافر کی چشم سرمہ سا سمجھے
حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا　　حساب دوستاں در دل اگر وہ دل ربا سمجھے

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی　　رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی
کرتی ہے زیر برقع فانوس تاک جھانک　　پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

خوب روکا شکایتوں سے مجھے　　تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
واجب القتل اس نے ٹھہرایا　　آیتوں سے روایتوں سے مجھے
لے گئی عشق کی ہدایت ذوق　　اس سرے سب نہایتوں سے مجھے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے　　مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے　　تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
سراغ عمر گزشتہ کا کیجیے گر ذوق　　تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق　　اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے　　ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات　　ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے　　اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل
سو بار آبلے اُسے آنکھیں دکھا چکے

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اس کے شور بای ذنب قتلتنی ہے
ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاکدامنی ہے

صبا جو آئے حسن نہ خار گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینے میں کیا چشم خوں فشاں کیلئے
بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

اسد اللہ خاں غالب

تھا خواب میں خیال کا تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگئ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

شوخئ رنگ حنا خون وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن، تو بھی پشیماں نکلا

تھی نو آموز فنا، ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ ترے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

رنگ شکستہ، صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھکو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا
بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک — ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قتل اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے، میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدان نگہ کا خون بہا کیا

سن اے غارت گر جنس وفا سن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائے گا

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگئ دل کا گلہ کیا کہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی　　پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی　　کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا　　آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا　　اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　　ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے　　عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ　　سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یا رب　　آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے　　بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں   انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو   دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے   بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
موج غم سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے   آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل   جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال   ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچے کی ہوس   کیوں ہے گرد رہ جولان صبا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب   چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے   رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

یک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب   خون جگر ودیعت مژگان یار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب   دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل   کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

لب خشک در تشنگی مردگاں کا ❊ زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
غریب بدرجستہ باز گشتن ❊ سخن ہوں سخن بر لب آوردگاں کا
سراپا یک آئینہ دار شکستن ❊ ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا
ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی ❊ میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا
بصورت تکلف، بمعنی تاسف ❊ اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

(نسخۂ حمیدیہ)

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ❊ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ❊ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالبؔ ❊ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

لو ہم مریض عشق کے تیماردار ہیں ❊ اچھا اگر نہو تو مسیحا کا کیا علاج

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا ❊ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ❊ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ❊ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ❊ جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر ❊ دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا ❊ یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی ❊ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور ❊ کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائش خم کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لاف تمکین فریب سادہ دلی — ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتار الفت صیاد — ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ — دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

از آنجا کہ حسرت کش یار ہیں ہم — رقیب تمنائے دیدار ہیں ہم
رسیدن گل باغ واماندگی ہے — عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم
نفس ہو نہ معزول شعلہ درودن — کہ ضبط تپش سے شرر کار ہیں ہم
تماشائے گلشن تمنائے چیدن — بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوق گریباں، نہ پروائے داماں — نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسد شکوہ کفر و دعا ناسپاسی — ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

(نسخہ حمیدیہ)

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں
رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجر بید نہیں
ہے تجلی تری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں
راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکر وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے اسقدر آباد نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب — یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر — برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشد گل — مست کب بند قبا باندھتے ہیں
اہل تدبیر کی واماندگیاں — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پرکار ہیں خوباں غالب — ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار　　جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں
جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش　　شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ　　سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں ستائے کیوں
جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردہ میں منہ چھپائے کیوں
حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارہ میں نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

* * *

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

* * *

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

* * *

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

* * *

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں

* * *

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

* * *

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تم ہی کہو کہ گذارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

بہ یاد قامت اگر ہو بلند آتش غم
ہر ایک داغ جگر آفتاب محشر ہو

ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقئ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی خاک میں ملجائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب، کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اُس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بے قراری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشک بو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پئے ہوتے
قہر ہو، یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے
مری قسمت میں غم اگر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دئے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پہ غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

تب چاک گریباں کا مزہ ہے دلِ نادان
جب اک نفس الجھا ہو ہر تار میں آوے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

چاہنے کو ترے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہئے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

ہمیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردہ میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

جب تک وہاں زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی
چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوئے وادی مجنوں گذر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا — افسون انتظار تمنا کہیں جسے
ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں — شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

پرِ طاؤس تماشا نظر آیا ہے مجھے — ایک دل تھا کہ بصد چشم دکھایا ہے مجھے
لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاق بہار — ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے
جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے
(نسخۂ حمیدیہ)

بہادر شاہ ظفر

نہ ہوس سیر چمن کی نہ گل تر کی ہوا — سر عاشق میں ہے اس سرو سمن بر کی ہوا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
کئی روز میں آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اسے پاس و حجاب ذرا نہ رہا

تو کہیں ہو دل دیوانہ وہاں پہونچے ہی گا — شمع ہووے گی جہاں پروانہ وہاں پہونچے ہی گا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال تھا
وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

ہے عشق کی منزل میں یہ حال اپنا کہ جیسے ۔ لٹ جائے کہیں راہ میں سامان کسی کا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر وہاں تک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا

صبر مشکل ہے نہ کر صبر کا دعویٰ ہرگز عشق میں تجھ سے ظفر یہ کبھی ہونے کا نہیں

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

جس وقت اسکی زلف گرہ گیر کھل پڑی سودائیوں کے پاؤں کی زنجیر کھل پڑی

میر مہدی مجروح

کچھ عرض تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا
انجام ہوا اپنا آغاز محبت میں اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

ہم بھی امید وصل سے خوش ہیں ہے زمانہ کو انقلاب بہت

دیکھ کر دل کو یار کہتا ہے چیز اچھی تھی گر نہ لگتا داغ

گریباں چاک ہے گل بوستاں میں اثر کرتا ہے بلبل کی فغاں میں
قفس صیاد کا خالی پڑا ہے نہ ہوں بے چین کیونکر آشیاں میں
سنے گر طالع خفتہ کا قصہ تو نیند آجائے چشم پاسباں میں
سنا حال دل مجروح شب کو کوئی حسرت سی حسرت تھی بیاں میں

کیا چمن میں ہے گئی بوئے گریباں اس کی آج غنچہ کوئی کھلتا جو گلستاں میں نہیں

شوق سے شوق ہے کچھ منزل کا راہبر سے بھی بڑھے جاتے ہیں
دور ہے منزل مقصود اے خضر آپ کیوں پیچھے رہے جاتے ہیں

آنکھ نرگس کی خواب ہے لیکن ہائے وہ چشم نیم خواب کہاں
کج ادائی یہ سب ہمیں تک تھی اب زمانے کو انقلاب کہاں

ملتی ہے اس کی وضع زلف خوئے یار میں آئے نہ کیوں مزا ستم روزگار میں
کب دیکھیں چاک جیب سے فرصت ملے ہمیں دست جنوں کا دھیان ہے ایک ایک تار میں
ہر ایک جانتا ہے کہ مجھ پر نظر پڑی کیا خوش خیال ہیں اس نگہ سحر کار میں

دل کی بے چینیاں گئیں نہ کہیں ایک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
پھر کیا چیز ہے وفا کیسی؟ یہ تو باتیں ہیں اب رہیں نہ کہیں

خالی جائے یہ وہ بسناؤ نہیں — آج جائیں گے وہ کہیں نہ کہیں

کسی کی کاکل مشکیں کی نکہت خوش نے — گل شگفتہ میں چھوڑا نہ رنگ و بو باقی
اگرچہ آپ کو کھویا تلاش میں اس کی — مگر ہے دل میں وہی شوق جستجو باقی

پھر کس سے یہ شکوے شب ہجراں میں ہیں گے — کام اپنا نہیں آہ فلک سوز نہ کر جائے
تشبیہ مرے حال پریشاں سے نہ دینا — ایسا نہ ہو وہ طرۂ شب رنگ بکھر جائے
دل خوگر شادی ہو یہ ممکن ہے پہ یارو — فرماؤ کہ یہ حسرت جاوید کدھر جائے
ظاہر ہے کہ باطن کی لگاوٹ ہے وگرنہ — کیوں غیر کی جانب تری دزدیدہ نظر جائے
آنکھوں میں کسی کی جو جگہ پاؤں تو کیونکر — میں خواب پریشاں ہوں جو دیکھے وہی ڈر جائے
اچھا ہے جو مجروح کو رو کے کوئی اٹھ کر — یہ جینے سے بیزار ہے کیا جانے کدھر جائے

مفتی صدرالدین آزردہ

اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر — کہیں پرسش داد خواہاں نہیں
یہ ہاتھ اس کے دامن تلک پہونچے کب — رسائی جسے تا گریباں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے ہی طور — کہ اپنے کئے سے پشیماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا در پیر مغاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شب فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب جو — سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

—————— • ——————

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی — کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

—————— • ——————

مومن خاں مومنؔ

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

—————— • ——————

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے — مومنؔ بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

—————— • ——————

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا — اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
یہ جوش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت — دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر — نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

—————— • ——————

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
مر گئے اُس کے لب جاں بخش پر — ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا
جائے تھی تیری مرے دل میں سو ہے — غیر سے کیوں شکوۂ بے جا کیا

—————— • ——————

شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا — دم رُکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا — تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا
بات شب کو اُس سے سن بیقراری پر بڑھی — ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

کوئی دن تو اس پہ کیا تصویر کا عالم رہا | ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بن جائے تھا
ناز شوخی دیکھنا وقت تکلم دمبدم | مجھ سے وہ عذر جفا کرتا تھا اور جھنجھلائے تھا
ہو گئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی | مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

چھوٹنا دام شکستہ سے بھی آسان نہیں | میں گرفتار خم گیسوئے صیاد رہا
گو غم حور ہے مجھے عشق بتاں اے مومن | میں سدا سوختۂ حسن خداداد رہا

محشر میں پاس کیوں دم فریاد آ گیا | رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آ گیا
الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں | لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا
جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقت وصال | دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا
ذکر شراب و حور کلام خدا میں دیکھ | مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آ گیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی | آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
دل ربائی زلف جاناں کی نہیں | پیچ و تاب طرۂ شمشاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس | آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
بتکدہ جنت ہے چلئے بے ہراس | لب پہ مومن ہرچہ بادا باد کیا

اگر گردش یہی ہے مغبچوں کی چشم میگوں کی | کف ساقی میں جام بادۂ گلگوں نہ ٹھہرے گا
طواف کعبہ کا خوگر ہے دیکھو صدقے ہونے دو | بتو سمجھو ذرا مومن ہے مومن کہیں نہ ٹھہرے گا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا | میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
خدنگ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے | یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

ناصح ہے طعنہ زن مری ناکامیوں پہ کیا — دلجوئیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا
ہوں کیوں نہ محو حیرت نیرنگہائے شوق — جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا

بزم مے میں بس ایک میں محروم — آپ کے اجتناب نے مارا
یاد ایام وصل یار افسوس — دہر کے انقلاب نے مارا
جبہ سائی کا بھی نہیں مقدور — ان کی عالی جناب نے مارا
مومن از بس ہیں بے شمار گناہ — غم روز حساب نے مارا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں — اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا
کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح — کرنا سمجھ کے دعوئ اعجاز دیکھنا
ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے — مومن غم مآل کا آغاز دیکھنا

تلخ کامی پر مجھے تجھ کو لب شیریں پہ ناز — آ مرے جادو سے اعجاز مسیحائی ملا
چھوڑ بت خانہ کو مومن سجدہ کعبے میں نہ کر — خاک میں ظالم نہ یوں قدر جبیں سائی ملا

دھو دیا اشک ندامت نے گناہوں کو مرے — تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا
مومن دیندار نے کی بت پرستی اختیار — ایک شیخ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

بے بخت رنگ خوبی کس کام کا کہ میں تو — تھا گل ولے کسی کی دستار تک نہ پہونچا
مفت اول سخن میں عاشق نے جان دے دی — قاصد ترا بیاں تو اقرار تک نہ پہونچا

پوچھنا حال یار ہے منظور
میں نے ناصح کا مدعا جانا

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

بیکاری امید سے فرصت ہے رات دن
وہ کاروبار حسرت و حرماں نہیں رہا

نیند آگئی فسانۂ گیسو و زلف سے
وہم و گمان خواب پریشاں نہیں رہا

مومن یہ لاف الفت تقویٰ ہے کیوں مگر
دلی میں کوئی دشمن ایماں نہیں رہا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

ذکر اغیار سے ہوا معلوم
حرف ناصح برا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دست عاشق رسا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا
مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اُسکے
کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا

جنت کی ہوس واعظ بیجا ہے کہ عاشق کو
ہاں سیر میں جی لگتا گر دل نہ لگا ہوتا

دیوانے کے ہاتھ آیا کب بند قبا اس کا
ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقدہ یہ وا ہوتا

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اُسے بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

پڑا ہے مرنا بس اب تو ہم کو جو اس نے خط پڑھ کے نامہ بر سے
کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر اتنا رقم نہ ہوتا
یہ بے تکلف پھرا رہی ہے کشش دل عاشقاں کی اس کو
وگرنہ ایسی نزاکتوں پر خرام نازک قدم نہ ہوتا
ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درس واعظ کو سن کے مومن
بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذاب ہجر صنم نہ ہوتا

ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملے وہ — دل ہی میں رہی رنجش جاناں کی شکایت
صد شکر وہ الجھی ہوئی تقریر نہ سمجھا — تھی برہمی زلف پریشاں کی شکایت
اے شور جنوں ڈر ہے زباں بند نہ ہو جائے — گر آئے لبوں پر مرے زنداں کی شکایت

ہر غنچہ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط — اس مبحث صحیح کی تکرار ہے غلط
کرتے ہیں مجھ سے دعوی الفت وہ کیا کریں — کیونکر کہیں مقولہ اغیار ہے غلط
کرتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح — گویا کہ قول محرم اسرار ہے غلط
سچ تو یہ ہے کہ اس بت کافر کے دور میں — لاف و گزاف مومن دیندار ہے غلط

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
اس کوے میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق — آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا — لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصل گل تو دور — اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

الجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم — کرتے ہیں اس پہ ناز ادا دانیوں میں ہم
سرگرم رقص تازہ ہیں قربانیوں میں ہم — سرخی سے کس کی آئے ہیں جولانیوں میں ہم

ثابت ہو جرم شکوہ نہ ظاہر گناہ رشک
مارے خوشی کے مر گئے صبح شب فراق

حیران ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
کہتے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
ترجمان التماس شوق ہے تغیر رنگ
دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہونچا دیا
ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بے قرار

لب نہیں کہتے ہیں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
جوں زبان شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں
بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

رکھتا پڑا مجھے پئے الزام پند گو
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق

وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
تقدیر بھی بری مری تدبیر بھی بری
تھے ہم سجود پائے صنم پر دم وداع

سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بگڑے وہ پرسش سبب اجتناب میں
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

اٹھے وہ شکوے کرتے ہیں کس کس ادا کے ساتھ
اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر

بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

نہ جانے کیوں دل مرغ چمن کو سیکھ گئی
پھر اب کے ٹالتے قربان جاؤں جذبۂ دل
خیال زلف میں خود رفتگی نے تنگ کیا
کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے

بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی
اجل بھی رہ گئی ظالم نہ سنا کے آنے کی

حسن روز افزوں پہ غرّا کس لیے اے ماہ رُو
یوں ہی گھٹتا جائے ہے جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایمان عقل و ہوش
ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

آج ہم بزم میں طوفان اٹھا کے اٹھے
یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رلا کے اٹھے

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

اُف رے گرمیِ محبت کہ ترے سوختہ دل
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سایہ سے مرے وحشت [illegible]

لے پھرتی ہے نکہت کو گلہائے شبینہ کی
اب تم سے بھی چل نکلی [illegible]

یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا [illegible]
گر تو ہی ذرا تاکے [illegible]

سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر
[illegible]

تب وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم — کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
مومن ایمان قبول دل سے مجھے — وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

کچھ نہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں — اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ — اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی — ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
مومن اس ذہن بے خطا پر حیف — فکرِ آمرزشِ گناہ نہ کی

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں — بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

بندھا خیالِ جناں بعد ترکِ یار مجھے — کیا ہے یاس نے کیا کیا امیدوار مجھے
نہ رند خمکدہ کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں — تنگ آ کے حریفانِ بادہ خوار مجھے
ہر آن آنِ دگر کا ہوا ہیں عاشق زار — وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے
ثوابِ ترکِ صنم سچ سہی و لے مومن — یہ کیا سبب کہ ستاتے ہو بار بار مجھے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی
ہوئے آغازِ الفت میں ہم افسوس — اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال — کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی
مجھے اے دل تری جلدی نے مارا — نہیں تقصیر اس دیر آشنا کی
کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

•

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

•

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

•

نسیم دہلوی

پھر غلغلہ ہے آمد فصل بہار کا — بگڑا مزاج میرے دل بے قرار کا
وحشت میں بھی نہ ترک محبت ہوا نسیم — منہ آبلوں نے چوم لیا نوک خار کا

•

اللہ رے درازی آغاز مدعا — نکلا جو حرف منہ سے مرے داستاں بنا
لیل و نہار گیسو و رخسار یار میں — جی چاہتا ہے بیٹھ رہیں اک جہاں بنا

•

گلے میں بخت کے ان کا بھی کچھ قصہ نکل آیا — ہوئی تھی صلح کس شکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

•

افشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک — آنکھوں میں نہاں تھا کوئی دامن میں چھپا تھا

•

نام میرا سنتے ہی شرما گئے — تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

•

ہجوم جوش وحشت سے ہوئے ہیں بے ادب ایسے
گریباں سے اُلجھ کر ہاتھ آجاتے ہیں دامن تک
خوش قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پردے
نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوارِ گلشن تک

دیکھو تو قاتل بسر کرتے ہیں کس مشکل سے ہم — چارہ گر ہے درد نالاں درد ہے دل دل سے ہم
ہم نے کیا بے خود کیا ہے غفلت امید نے — حال دل کہتے ہیں اپنا پھر اُسی قاتل سے ہم
خالی از احساں نہیں یہ بھی کہ وقت اضطراب — خوش تو ہو جاتے ہیں تیرے وعدۂ باطل سے ہم

لطف تکلیف قفس کچھ ہم سے پوچھا چاہیے — مدتیں آخر ہوئی ہیں خدمت صیاد میں
برق نے اک طرز بے تابی مرا سکھا تو گیا — سینکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں
بلبل بستان وحدت ہے یہاں سے چل نسیم — عمر کو ضائع نہ کر اس گلشن ایجاد میں

لے جائیے اسے بھی سبک دوش ہو جائیے — رکھئے مری امید بھی اپنی حیا کے ساتھ
گھبرا گئے تم ایک ہی عرض بیان پہ آج — سو حسرتیں ہیں اور مری التجا کے ساتھ

اب وہ گلی جائے خطر ہو گئی — حال سے لوگوں کو خبر ہو گئی
دیکھیں گے اے ضبط یہ دعوے ترے — رات جدائی کی اگر ہو گئی

کیا جانئے آتے ہیں کہاں سے مرے شکوے — کم ہوتے ہیں ہر چند جگر کم نہیں ہوتے
بے فائدہ ہے فکر مری چارہ گردوں کو — سب زخم جگر قابل مرہم نہیں ہوتے

مرنے بھی نہ دیگی مجھے محرومی تقدیر — کچھ آنکھ چراتا ہے وہ قاتل کئی دن سے

سنئے ڈھب کا کچھ جوش سودا ہوا ہے — خدا جانے اب کی مجھے کیا ہوا ہے
تعلق ان آنکھوں سے پیدا ہوا ہے — بہت دن کا یہ خواب دیکھا ہوا ہے
ذرا دم تو لینے دے اے چشم جادو — بڑی مدتوں میں دل اچھا ہوا ہے

آتش

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
صیاد اسیر دام رگ گل ہے عندلیب — دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا
چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر — دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

سمجھتے تھے نہ ہم اتنا دراز انداز اے جنوں تجھکو — گریباں سے تعلق ہو گیا ہو تو فدامن کا

کوئی عشق میں مجھ سے افزوں نہ نکلا — کبھی سامنے ہو کے مجنوں نہ نکلا
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

خار دامن سے الجھتے ہیں بہار آئی ہے — چاک کرنے کو کیا گل نے گریباں پیدا
موجب اس کی ہے سیہ روزی ہماری آتش — ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شب ہجراں پیدا

تار اس زلف معنبر کا نہ توڑے شانے — سلسلہ ہے یہ مرے دل کی گرفتاری کا

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا　　خدا کی یاد بھلا شیخ تب سے برہمن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب　　زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

کیونکر وہ نازنیں نہ کرے بے نیازیاں　　انداز سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا
ہو جائے حسن معنی بے صورت آشکار　　روئے حقیقت اٹھے جو پردہ مجاز کا

حال ہے مجھ ناتواں کا مرغ بسمل کی تڑپ　　ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

ہجر کی شب ہو چکی روز قیامت سے دراز　　دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست
اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے　　دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

فصل گل ہے لوٹئے کیفیت میخانہ آج　　دولت ساقی سے مالا مال ہے پیمانہ آج

نہ پاک ہوگا کبھی حسن و عشق کا جھگڑا　　یہ قصہ وہ ہے کہ جس کا کوئی گواہ نہیں

باغ میں آئے ہو ساتھ انکے بھی پھر لو دو گام
کبک و طاؤس کا جھگڑا ہے چکاتے نہ چلو

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی　　ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی
نہ روز حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے　　جفائے یار کے آڑے مری وفا آئی

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے　　موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

نقش پائے رفتگاں سے آرہی ہے یہ صدا　　"دو قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہیے"

دکھلائے حسن یار کا جلوہ ہمیں جو عشق — کس کس طرح سے لطف تماشا اُٹھائیے
اب کی بہار میں جو ہمیں لے چلے جنوں — چن چن کے داغ لالۂ صحرا اٹھائیے
فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب — بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے

—•—

گدا نواز کوئی شہسوار راہ میں ہے — بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے
سمند عمر کو اللہ رے شوق آسائش — عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

—•—

حیائے یار نے بدلا جو کیف مے میں رنگ — یقین ہوا یہ ہمیں پارسائی مشکل ہے

—•—

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر — ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

—•—

لگی ہے دیر بہت نامہ بر کے آنے میں — وہ خود ہی آتے ہیں قاصد جواب کے بدلے

—•—

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا — دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ مڑ کر سکے بے درد قاتل نے دیکھا — تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں — گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں — مریدان پیر مغاں کیسے کیسے

—•—

صورت شمع ہوں ہر چند فروغ محفل — بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

—•—

دیکھئے کرتا ہے کیونکر یار سے گستاخیاں — شوق کے بھی حوصلے کو آزمایا چاہیئے
حال دل کچھ کچھ کہا میں نے تو بولا سن کے یار — بس عبارت ہو چکی مطلب پہ آیا چاہیئے

—•—

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

تیغ ابرو سے کیا قتل مجھے قاتل نے — وہ سزا دی جو محبت کے گنہ گار کی تھی
راہ صحرا میں جنوں کیوں نہ رہے سرگشتہ — جستجو آبلہ پایوں کو ترے خار کی تھی

گئے جس بزم میں روشن چراغ حسن کر دی — بہار تازہ آئی تم اگر گلزار میں آئے

عاشق کے سر کے ساتھ ہی سودا گئے کوئے یار — مومن نہ تھا وہ جس کو ہوائے جناں نہ تھی

چمن میں کھیلتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل سے
مگر باد صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی — لے چلے خار سے ہم گوشۂ داماں خالی

سودا زدہ زلفوں کا نہ تھا اپنے سوا ایک — آزاد دو عالم تھا گرفتار ہمیں تھے

صبا کی طرح ہر اک غیرت گل سے ہیں لگ چلتے — محبت ہے سرشت اپنی ہمیں یارانہ آتا ہے

شیخ امام بخش ناسخ

ساقی بغیر شب جو پیا آب آتشیں — شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا
اس رشک گل کے جاتے ہی بس آ گئی خزاں — ہر گل بھی ساتھ بو کے چمن سے نکل گیا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

قدح لئے ہوئے گل مثلِ بادہ خوار آیا
خزاں چمن سے گئی موسمِ بہار آیا
تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

لبریز اس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا
ہنستا ہے عکسِ رخ سے کٹورا گلاب کا

آج مجھ کو دشت وحشت میں وطن یاد آگیا
بوئے گل کو بعد بربادی چمن یاد آگیا

اشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تمنا ہے ساقی کبھی بزمِ مے میں
وہ سرشار ہو اور ہشیار میں ہوں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

جان ہم تجھ پہ دیا کرتے ہیں
نام تیرا ہی لیا کرتے ہیں
زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

تو نے مجبور کر دیا ہم کو
سخت رنجور کر دیا ہم کو
دل بنا عاشقی میں خود مختار
اور مجبور کر دیا ہم کو

گلوں کی پردہ دری کیا تمہیں ہوئی منظور
جو آج سیرِ گلستاں کو بے نقاب چلے

شوق مے نے کر دیا اس درجہ مجھکو بدحواس　　محتسب سے راہ پوچھی خانۂ خمار کی

کس کو ہمارے یار کے نظارے کی ہے تاب　　خورشید جس کو کہتے ہیں اسکی نقاب ہے

چلنے سے عمر رواں اپنی ٹھہر جاتی ہے　　جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے

ڈر تھا اثر کا اس کو سو وہ بھی نکل گیا　　نادم ہوا ہوں منہ سے میں نالہ نکال کے

فرقت قبول رشک کے صدمے نہیں قبول　　کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

برق لکھنوی

کیا جو وعدۂ فردا سمجھ گئے عاشق　　کہ اس سوال کا اب حشر پر جواب رہا

دیکھنا تیز دستیٔ ساقی　　جام کو رشک آفتاب کیا
حسن نے اس کو چن لیا اے برق　　عشق نے ہم کو انتخاب کیا

اتنا تو جذب عشق نے بارے اثر کیا　　اس کو بھی اب ملال ہے میرے ملال کا

اذاں دی کعبے میں ناقوس دیر میں پھونکا　　کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو　　دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

تم کو ہم سے خدا جدا نہ کرے — ہم جدا تم سے ہوں خدا نہ کرے
شب فرقت بھی کاٹ دیتے ہیں — کیا کریں عمر اگر وفا نہ کرے

کھویا غم فراق کو جوش خیال نے — آنکھوں سے لاکھ دور ہے دل سے قریب ہے

جلالؔ لکھنوی

باغباں لاکھ چھپایا کئے لیکن نہ چھپا — خون مرغان چمن رنگ ہوا بو نہ ہوا

بتوں کو شوق ہوا عالم آشنائی کا — انھیں بھی رنگ پسند آ گیا خدائی کا
بہت ڈرے ہوئے ملتے ہیں شیخ و زاہد سے — اُٹھا چکے ہیں ہم الزام پارسائی کا
بڑی امید ہے منزل میں ناتوانی سے — یہی تو ساتھ نبا ہے گی نارسائی کا

شوخیوں نے تری کچھ کام نکلنے نہ دیا — رنگ حیرت نے زمانے کو بدلنے نہ دیا
کبھی نالے نے دکھائی نہ بہار تاثیر — ثمر اے عشق دیا پھولنے پھلنے نہ دیا
آہ تک کر نہ سکے محفل جاناں میں فلک — یہ بھی حسرت تھی کوئی جس کو نکلنے نہ دیا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلف یار کی بو — پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا
چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں — شب فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا
جلالؔ باغ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم — چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

میں شوق دید میں کیا جانے کتنی دور آیا — کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریب طور آیا
تڑپ بھی پہلے نہ تھی تجھ میں اے دل بیتاب — کسی کو رحم ترے حال پر ضرور آیا

بے پردہ ترے دیکھنے کا حوصلہ کر کے — دل آپ مری آنکھ سے محجوب ہے میرا

شوق مجنوں نے وہ لگاوٹ کی — اُٹھ گیا آپ پردہ محمل کا

کہہ کے وہ اُٹھ گئے کہ مشکل ہے — سہل کرنا تمہاری مشکل کا
نام اس بے وفا کا تو نہ جلالؔ — ذکر اب کیا گئے ہوئے دل کا

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے حجاب — حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خوب تھا
پھر ان کو ہجر و وصل میں ہونے لگی تمیز — بے خود ترے نہ آپ میں آتے تو خوب تھا

حسرت بھی دید کی جو تری جلوہ گاہ میں — کچھ دل میں ہم وہ لے کے چلے کچھ نکال دیا

منزل میں لے کے بیٹھ گیا ہے ہجوم یاس — تھکتے نہ ہم تھکائے ہوئے کاروان کے ہیں
نقش قدم پکارتے ہیں راہ عشق میں — مٹ جائے حوصلے جسے نام و نشان کے ہیں

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغ چمن — شگوفے دیکھیں انہیں کیا نہال کرتے ہیں

اندازہ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا — کم حوصلہ یہیں ہیں وہاں کچھ کمی نہیں

خاک اپنی اُڑ کے شوق تباہی میں بٹ گئی — کم بخت پڑ کے دیدۂ راہی میں رہ گئی
تھی اک شکایت اس شہ خوباں سے وہ بھی حیف — شکر گدا نوازی شاہی میں رہ گئی
حسرت نہ نکلی وصل میں بھی دست شوق کی — اندیشہ ہائے نا تمنا ہی میں رہ گئی

ساغر کدھر کدھر نہ جھکا چشم یار کا
دل سب کے بزم بادہ پرستاں میں رکھ لئے

کچھ اشک دل سے آ کے کھٹکتے جو اے جلال
ذوق خلش نے دیدۂ گریاں میں رکھ لئے

زاہد کو رند اُبھار کے لائے ہیں راہ پر
کچھ کچھ مگر کرامت پیر مغاں بھی ہے

کہتا ہوں داغ جس کو وہ حسرت ہے وصل کی
میرے جگر کی پھانس محبت کا راز ہے

گم جب سے کئے ہوش تری جلوہ گری نے
کیا کیا نہ خبردار کیا بے خبری نے

اُٹھتی ہی نہیں شرم سے اپنی نگہ شوق
محجوب کیا ہے یہ تری پردہ دری نے

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق کو
فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے

خوبرویوں کے بگڑنے میں بھی ہیں لاکھ بناؤ
کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

اس سے کچھ ذکر مرا بھی دل ناشاد رہے
وقت پہ بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے

صبا لکھنوی

جوش الفت میں او ضبط لے دل
جبر پر اختیار کیا رکھتا

آبرو دل کی کدورت نے نہ چاہی ورنہ ۔۔۔ یہ وہ قطرہ ہے جو بڑھ جاتا تو دریا ہوتا

پھر سیر لالہ زار کو ہم لے صبا چلے ۔۔۔ آئی بہار داغ جنوں پھر اُبھر گیا

مری نجات کچھ ان واعظوں کے ہاتھ نہیں
بڑا کریم ہے جس کا گنہگار ہوں میں

نیرنگئ تعصب ہے غم کے بیان میں ۔۔۔ سو رنگ کے طلسم ہیں اک داستان میں

یوں ہی اڑا کریں گی گریباں کی دھجیاں ۔۔۔ جب تک کہ ہاتھ دامن جاناں سے دور ہے
فصل جنوں ہے جامہ دری کی بہار ہے ۔۔۔ ٹوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں سے دور ہے

پھر چلے دامن صحرا کی طرف آئی بہار ۔۔۔ پھر ہوا جوش جنوں دست و گریباں ہم سے

مر گئے عاشق نالاں تو کہا اس بت نے ۔۔۔ سو گئے فتنۂ محشر کے جگانے والے
کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے ۔۔۔ خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

ماہ لکھنوی

اس گلشن ایجاد میں رنگ رخ ہر گل ۔۔۔ خون جگر بلبل شیدا سے نکالا
وہ درد طلب ہوں کہ تری راہ میں میں نے ۔۔۔ کانٹا نہ کبھی آبلۂ پا سے نکالا

اس مسیحا سے علاج دل شیدا نہ ہوا ۔۔۔ یہ بھی اچھا ہوا بیمار جو اچھا نہ ہوا

جوش جنوں میں ہم نے گریباں کو پھاڑ کر — اے دشت تیرے واسطے دامن بنا دیا

ہمارے نالۂ دل کی بھی کچھ سنی تاثیر — جو پہونچے کان تک ان کے تو کچھ اثر بھی ہو

کیا زور تھا کیا شور تھا اک قطرۂ خوں کا — اے حضرت دل دیکھیں کرامات تمہاری

تسلیم لکھنوی

فریاد و فغاں بلبل ناشاد کیے جا — مہمان قفس خاطر صیاد کیے جا
اے دل خم ابروئے صنم میں سحر و شام — کچھ بندگی حسن خداداد کیے جا
گلگشت عدم خوب سفر ہے مگر اے دل — سیر چمن گلشن ایجاد کیے جا

ہائے جب کہتا ہوں ان سے سوز دل کہتے ہیں وہ — چپ رہو راز محبت داستاں ہو جائیگا

اللہ رے اضطراب تمنائے دید یار — اک فرصت نگاہ میں سو بار دیکھنا
تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے — اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دشت جنوں
اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

نالہ کھنچا ہے دل سے خفا شوق ہے اداس — تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

وہ دیکھ کر مجھے بے پردہ کیوں ہوئے اے دل — نگاہ شوق نے سمجھا دیا نقاب میں کیا

ہمیشہ یاس کسے تک کے دیکھ جاتی ہے
کوئی امید ہے باقی دلِ خراب میں کیا

بزم ساقی آ گئی ہے یاد کس مے نوش کو
جام چھلکا شیشۂ مے ہچکیاں لینے لگا

چاہئے مینائے مے کو سجدۂ شکرانہ آج
سر کے بل آتا ہے زاہد جانب مے خانہ آج
کل نگاہ منتظر ڈوبی ہوئی تھی جام میں
پھرتی ہے آنکھوں میں تیری گردش پیمانہ آج

پرواز اولین میں اسیری ہوئی نصیب
گویا قفس میں تھے جو اڑے آشیاں سے ہم

حسن دل افروز کا دیوانہ ہوں
شمع رو کوئی ہو میں پروانہ ہوں
مر کے بھی چھوٹے نہ ساقی کے قدم
آج تک خاک در میخانہ ہوں

مانا کہ حسن یار سے لبریز ہے جہاں
لیکن وہ حوصلہ وہ شکیب نظر کہاں
ہر وقت یار تھا رگ جاں سے قریب تر
تسلیم تو خراب پھرا عمر بھر کہاں

بسبب شرم التجا ہوں میں
لب خاموش مدعا ہوں میں
بے حقیقت نہ جان اے تسلیم
مظہر قدرت خدا ہوں میں

رہ نہ جائے آرزوئے چارہ گر
لذت تکلیف درماں دیکھ لیں
الفقات جوشش وحشت پھر کہاں
ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں
گر انھیں ہے خوف عرض آرزو
دور سے حال پریشاں دیکھ لیں

ہنستے ہیں گل بھی دیکھ کے اپنی خبر نہیں
گویا چمن میں چاک گریباں ہمیں تو ہیں

ناصح خطا معاف سنیں کیا بہار میں
ہم اختیار میں ہیں نہ دل اختیار میں

کیا کیا خیال حسرت دیدار قیس تھا
چھپ چھپ گیا ہے ناقۂ لیلیٰ غبار میں

شکستہ پا ہوں کہیں ساتھ سے نہ رہ جاؤں
مجھے بھی ہاتھ ذرا دوستو لگائے چلو

عدم میں ترسو گے دردِ جگر کو اے تسلیم
جو ہو سکے کوئی سینے پہ تیر کھائے چلو

کیا عجب حشر پہ موقوف ہو ملنا اس کا
ناامیدی نہ کرا تنا ابھی بیدل مجھ کو

فرصت دید نہیں ہے شرر شمع کی طرح
پھر کے دیتی ہے تری گرمئ محفل مجھ کو

گر یہی ہے پاس آداب سکوت
کس طرح فریاد لب تک آئے گی

یہ تو مانا دیکھ آئیں کوئے یار
پھر تمنا اور کچھ فرمائے گی

جانے دو صبر و قرار و ہوش کو
تو کہاں اے بے قراری جائے گی

اللہ رے ضبط راز محبت کہ آج تک
جو حرف مدعا ہے مرا ناشنیدہ ہے

تکلیف التماس سے ہے پاک مدعا
غماز عاشقی مرا رنگ پریدہ ہے

اے دلِ دیوانہ امید رہائی کس لئے
پیچ و خم کاہے کو زلف پرشکن کے جائیں گے

کیا کہہ کے عندلیب چمن سے نکل گئی
کیا سُن لیا گلوں نے کہ رنگت بدل گئی

افسانہ گو نے اور بھی بے خواب کر دیا
ظالم سنا رہا ہے مری داستاں مجھے

وہ گم شدہ ہوں سو گئے عالم اضطراب میں
دوڑی گئی ہے ڈھونڈھنے عمرِ رواں مجھے

شمیم یار نہ جب تک چمن میں چھو آئے　　نہ رنگ آئے کسی پھول میں نہ بو آئے
دماغ دے جو خدا گلشن محبت میں　　ہر ایک گل سے ترے پیرہن کی بو آئے

اس عشق کا برا ہو کہ اپنے قفس سے ہم　　کیا کیا پلٹ کے روئے ہیں جب دم رہا ہوئے

صفیر بلگرامی

جوشش شوق شب وصل میں دشمن ٹھہری　　تنگ آئی ہے مری آرزوئے دل کیا کیا
جستجو میں تری تھک تھک گئے چلنے والے　　پاؤں پھیلائے پڑے ہیں سر منزل کیا کیا

ہر دم صدا یہی ہے ترے دادخواہ کی　　مارا نظر نے رہ گئی حسرت نگاہ کی

تو نے گلگشت جو موقوف کیا اے گل تر　　پھول مرجائے چلے آتے ہیں گلزاروں سے

مرزا رحیم الدین حیا

بتوں کو چاہ کے ہم تو عذاب ہی میں رہے　　کہ شب فراق کٹی روز انتظار آیا
کھلی نہ آنکھ ترے کشتۂ تغافل کی　　ہزار شور قیامت اسے پکار آیا

خدا ہی ہے کہ رہے توبہ کعبہ جانے تک　　قدم قدم پہ تصور شراب خانے کا

قبا کے ٹکڑے کئے ہیں جیب بھی کر چاک　　گھڑی گھڑی کی جنوں زور آزمائی کیا
دیتی نہیں ہے دود دل جوش عشق چین　　تہمت نکہت ہے موج نسیم بہار پر

خواجہ محمد وزیر، وزیر

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر
اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی

ضیای بیگم ضیائی

تمہارا ہم سے ہمارا تم سے نہ اٹھ سکے گا عتاب ہرگز
اٹھے تو کیونکر اٹھے بتاؤ کہ تم ہو نازک میں ناتواں ہوں

نیر شکوہ آبادی

غم سہتے ہیں پر غمزۂ بے جا نہیں اٹھتا — مرتے ہیں مگر ناز مسیحا نہیں اٹھتا

دشت جنوں سے نقش کف پا الجھ پڑا — شکر خدا کہ پاؤں مرا درمیاں نہ تھا
بجلی تھی مہربان، کبھی آتش بہار — صد شکر بے چراغ مرا آشیاں نہ تھا

اُن کے جاتے ہی نہ ٹھہرے گی بہار بزمِ عیش
ساتھ اپنے ایک گُل سارا چمن لے جائیگا

شاید نگہ یار ہی اس کوچے میں ٹھہرے — اب تک رگِ جاں میں کوئی نشتر تو نہ ٹھہرا

کیا ہاتھ مرے پہنچیں گے دامانِ تباں تک — اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

دامن تک اُس کے ہائے نہ پہونچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا
مشاطہ کا قصور سہی سب بناؤ میں
اس نے ہی کیا نگہ کو بھی پُرفن بنا دیا
اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

کیا میکدوں میں ہے کہ مدارس میں وہ نہیں — البتہ ایک ڈال دل بے مدعا نہ تھا
ساقی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو — مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

وصل کے لطف اٹھاؤں کیونکر — تاب اس جلوے کی لاؤں کیونکر
یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ — اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

جو بات میکدے میں ہے اک اک زبان پر — افسوس مدرسے میں ہے بالکل نہاں ہنوز

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی — کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں — کچھ آگ بھری ہوئی ہے مے میں
کچھ زہر اگل رہی ہے بلبل — کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں
بدمست جہان ہو رہا ہے — ہے یار کی بو ہر ایک شے میں
ہے مستیٔ نیم خام کا ڈر — اصرار ہے جام پے بہ پے میں
میخانہ نشیں قدم نہ رکھیں — بزم جم و بارگاہ کے میں
کچھ شیفتہ یہ غزل ہے آفت — کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں

محفل میں اک نگاہ اگر وہ ادھر کریں — سو سو اشارے غیر سے پھر رات بھر کریں
طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ — دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

رات ساقی نے کہا جس کے یہ سب جلوے ہیں — وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں
رند فارغ بھی ہوئے جام سحرگاہی سے — اور زاہد ابھی آہنگ طہارت میں نہیں
دل کے بدلے میں طلبگار نہیں کچھ تم سے — شیفتہ زمرۂ اصحاب تجارت میں نہیں

ہے امتزاج مشک مئے لعل فام میں — آتی ہے بوئے غیر ہمارے مشام میں
آئی جو آج کام میں صہبائے تند و تلخ — ساقی نے خوب راز کہے بار عام میں

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں — جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں
لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ — ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

ہر خار و خس ہے وجد میں ہر سنگ و خشت مست — کیا میکشوں نے آکے کہا خانقاہ میں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ — طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

گریہ ہی ہے ہجوم ابر سیاہ — گر کوئی مے پئے بعید نہیں
ذکر میرا سنو نہ مجنوں کا — لطف بے قصہ جدید نہیں

ناصح تری زبان ترے بس میں جب نہ ہو — انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے
افسوس اس نے کچھ نہ کہا سن کے حال دل — ہم قصہ خواں کی طرح فسانہ سنا چلے

نیرنگ عشق دیکھ کہ منظور ہے انھیں — گلگونہ میں چکیدۂ مژگان تر ملے
محفل طرازیوں کے مزے سب دکھاؤنگا — وہ اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے
وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی — میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اتنی بھی بری ہے بے قراری — اب آپ سے اُنس کم کریں گے

ہزار شکر کہ اسکی گلی میں چھوڑ گئی — نسیم جان کے ایک ناتواں غبار مجھے
جو شورشیں نہ مچاتا اسیر کیوں ہوتا — خراب تو نے کیا جلوۂ بہار مجھے
ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے
بڑے فساد اٹھیں شیفتہ خدا نہ کرے — کہ ان کی بزم میں ہو دخل و اختیار مجھے

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر — یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

مائل دہلوی

حشر میں شیخ و برہمن کے یہ جھگڑے پہلے
کوئی پرساں نہ ہوا ہم سے گنہ گاروں کا

محروم پھر آیا در میخانہ سے واعظ
رندان قدح خوار کی ہمت کو ہوا کیا

جھپکی تھی ذرا آنکھ کہ وہ خواب میں آئے
اس رات کو اب میں شب غم کہہ نہیں سکتا

ملیں کسی سے تو بدنام ہوں زمانے میں
ابھی گئے ہیں وہ مجھ کو سنا کے پردے میں
نہ مانگ زاہد ناداں ذرا سمجھ تو سہی
شکایتیں ہیں یہ کس کی دعا کے پردے میں

کیا کہتی ہے یہ چشم فسوں گر اُسے دیکھو
لو ہم نہ کہیں گے ستم ایجاد کسی کو

ہم تو اس فکر میں رہتے ہیں کہاں کا انصاف
دیکھئے داور محشر بھی کدھر ہوتا ہے

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا
کام آپڑا ہے رحمت پروردگار سے

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی
مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے

زکی دہلوی

رسوا کن جہاں نگہ ناز ہی نہیں
پنہاں رہے یہ عشق کا انداز ہی نہیں

کچھ ایسے تنگ ہیں غم دل سے کہ جی میں ہے　　کہتے ہیں دل کو دے کے غم روزگار لیں
پہلو وہ کون ہے تجھے جس سے آئے چین　　کروٹ ہم اب کدھر کو دل بیقرار لیں

•

نفس نفس ہے نسیم وفا محرک شوق　　یہ وہ مزہ ہے جسے ذوق جاوداں کہیے
وہاں یہ فکر کہ راز دل آشکار نہ ہو　　یہاں یہ شوق کہ کچھ حسرت نہاں کہیے
وہ سادگی سے تغافل کو ناز کہتے ہیں　　مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کہیے

•

دل کو یہ شوق کہ وعدہ کی وفا یاد رہے　　وہ مے حسن سے مخمور نہیں کیا یاد رہے

•

وہ میرا غم ہی سنیں پوری داستان نہ سہی　　حکایت دل بے تاب درمیاں سہی
خموش بیٹھے ہو محفل میں کوئی بات کہو　　زبان دی ہے خدا نے تمہیں دہاں نہ سہی
نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور　　ہمیں تو خاک اڑانی ہے کارواں نہ سہی

•

ان کا جس راہ میں نقش کف پا ہوتا ہے　　ہر قدم سجدۂ ارباب وفا ہوتا ہے

•

میر حسین تسکین

زلف پر پیچ کو کھولا ہے کسی نے یارب　　کہ مرے پاؤں کی زنجیر کسے دیتے ہیں

•

اے چشم سرمگیں تری گردش نے کیا کیا　　راحت پذیر تھے ستم آسماں سے ہم

•

سیّد ظہیر الدّین ظہیر

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا
دل خوں گشتۂ حسرت نے کیا کچھ گل کھلائے ہیں
بہار آگئی ہے کچھ اب کی برس فصل خزاں کیا کیا
تصور میں وصال یار کے ساماں ہوتے ہیں
ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوق سجود آستاں کیا کیا

بہت ظہیر کو ہم یاد کر کے واں روئے　　کہیں جو ذکر حریفاں بادہ خوار آیا

اعجاز دلفریبیٔ انداز دیکھنا　　ہر ہر ادا پہ مجھکو گماں نظر رہا

بات کیا اُن سے کروں ان کو اٹھا دوں کیونکر　　مدعی بیچ میں دیوار بنے بیٹھے ہیں
وہیں اور غیر ہیں اور عیش کے ساماں ظہیر　　ہم الگ سب سے گنہگار بنے بیٹھے ہیں

کہئے تو کہوں انجمن غیر کی روداد　　کیا اب بھی اسے آپ کرامت نہ کہیں گے

یہ شوخی ہے کہ تمکیں ہے الٰہی کیا قیامت ہے　　الجھتے ہیں دم رفتار سو سو بار دامن سے
الجھ کر خار دامن سے مرے کیا کیا پشیماں ہیں　　کہ اب دامن چھڑانا ہو گیا دشوار دامن سے

عبد العلیم آسی

رشکِ خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو
کوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

اسی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا

خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

ہوا کے رخ تو ذرا آکے بیٹھ جا اے قیس
نسیم صبح نے چھیڑا ہے زلف لیلیٰ کو

خیر الدین یاس شاگرد مومن

ربط غیروں سے بڑھا مجھ سے وفا چاہتے ہو
دل میں سمجھو کہ یہ کیا کرتے ہو کیا چاہتے ہو

عشوہ و ناز و ادا طعن سے کہتے ہیں مجھے
ایک دل رکھتے ہو کس کس کو دیا چاہتے ہو

غلام علی خاں وحشت شاگرد مومن

منفعل ضعف جنوں سے ہوئے ایسے کہ نہ پوچھ
طوق آہن جسے سمجھے تھے گریباں نکلا

نظام شاہ نظام رامپوری

کون پرساں ہے حال بسمل کا　　خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

خدا جانے مجھکو دکھائے گا کیا　　یہ چھپ چھپ کے اپنا ادھر دیکھنا

منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں　　اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں ہوتا

یوں تو روٹھے ہیں مگر لوگوں سے　　پوچھتے حال ہیں اکثر میرا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام　　منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

محمد یوسف علیخان ناظم رامپوری

میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط　　کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

مجھے اٹھاتے ہو کہہ کر کہ ہے یہ خلوت خاص　　وہ لوگ کون چلے آتے ہیں ادھر دیکھو

نہیں ہے اشک یہ ہے نور دیدۂ ہجراں　　نہیں ہے داغ یہ ہے شمع دود مان فراق
غبار دشت ہے افزائش جمال جنوں　　متاع درد ہے آرائش دوکان فراق

پردہ نہ رکھا تیرے لب روح فزا نے　　ہم جانتے تھے آب بقا اور ہی کچھ ہے

گستاخ رامپوری

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

امانت لکھنوی

رکھنا قدم اے دل رہِ وحشت میں سمجھ کر
زنجیر کا ہے سامنا منزل یہ کڑی ہے

رند لکھنوی

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا　　سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا
دیدِ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور　　میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

نسیمِ صبح چمن تک مجھے تو ہی پہونچا　　بھٹک رہا ہوں میں گم کردہ آشیاں کب کا

قصور کیا ترا ساقی، فلک نہ دیکھ سکا　　گرا یا ہاتھ سے لب تک جو میرے جام آیا

اے رند شوق جامہ دری پھر چمک گیا　　پھر ہاتھ رفتہ رفتہ گریباں تلک گیا

کبھی نظارۂ چمن نہ کیا — اپنے داغوں سے باغ باغ رہا

نہ رہا ہوش، بے خودی ہی تو ہے — ساقیا! شغل مے کشی ہی تو ہے
دلِ ہمارا اداس ہے بلبل! — نہیں لگتا چمن میں جی ہی تو ہے

چمن میں جو کل جا کے دیکھا گلوں کو — نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

سنتا ہی نہیں وہ بتِ گمراہ کسی کی — ایسا نہ ہو سن لے کہیں اللہ کسی کی

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی بادِ بہاری — کیا اب کی برس چاک گریباں نہ کریں گے

رشکی دہلوی

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

بیم ہجراں ہے کبھی اور کبھی امید وصال — کون کہتا ہے مزہ سستیٔ پیماں میں نہیں
اہل دل سے نہ کبھی آپ سنیں گے نالہ — چاک دل میں ہے مگر چاکِ گریباں میں نہیں

مسجد میں آکے اور ہی عالم دکھایئے — بت خانہ کو تو عالم تصویر کر چکے

ہزار رنگ بدلتا ہے دم میں تو اے دل — مگر کسی کے یہ انداز میں اڑائے ہوئے

داغ دہلوی

بتانِ ماہ وش اُجڑی ہوئی بستی میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں

خدا رکھے محبت نے کیے آباد دونوں گھر
میں اُن کے دل میں رہتا ہوں وہ میرے دل میں رہتے ہیں

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

مرادیں مان رہا ہوں قضا کے آنے کی
بُری گھڑی تھی دلِ مبتلا کے آنے کی

ابھی تو کھیل ہیں اے داغ شوخیاں اُن کی
پھر آرزوئیں کرو گے حیا کے آنے کی

پیامی کامیاب آئے نہ آئے
خدا جانے جواب آئے نہ آئے

ترے غمزوں کو اپنے کام سے کام
کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے

تم آؤ جب سوار توسنِ ناز
قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے
پر تمہیں شرمسار کون کرے

آفتِ روزگار جب تم ہو
شکوۂ روزگار کون کرے

وعدہ کرتے نہیں یہ کہتے ہیں
تجھ کو امیدوار کون کرے

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا
میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا

رندانِ بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب
زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہو گیا

اس مجمع میں سمائی ہے وحشت بہ رنگِ نو
دل کتنی تنگیوں پہ بیابان ہو گیا

لو اے بتو سنو کہ وہ داغ صنم پرست
مسجد میں جا کے آج مسلمان ہو گیا

دل لے کے اسکی بزم میں جایا نہ جائے گا
یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا

اے حشر امتیاز کہ ہم ہیں شہید ناز
مردوں کی طرح ہم کو اٹھایا نہ جائے گا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقین
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

کی ترک مے تو مائل پندار ہو گیا
میں توبہ کر کے اور گنہگار ہو گیا

وہ فتنہ جس کا حشر پہ اٹھنا ہے منحصر
ہر بار تیری چال سے بیدار ہو گیا

اک حرف آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

لئے تو چلتے ہیں حضرت دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

مدار ہے ناصحو تمہیں پر تمام اب اسکی منصفی کا
ذرا تو کہنا خدا لگی بھی فقط سخن پروری نہ کرنا

زندہ عیسیٰ کا نام کرنا تھا
اس طرف بھی خرام کرنا تھا

تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

اے اہل بزم چشم مروت کو کیا ہوا
کیوں دیکھتے نہیں مری صورت کو کیا ہوا

ہے جستجو ملے گا نہ اک دل سا نغز دوست
تو کچھ تو قصد کر تری ہمت کو کیا ہوا

ٹھنڈا پڑا ہے داغ دل داغدار عشق
اس آفتاب حشر کی حدت کو کیا ہوا

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا — مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا
تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا — یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا
بھلا بھلا کے جتایا ہے ان کو راز نہاں — چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا
ہم ایسے محو نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا — مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا
وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے — ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا

عرض وفا پہ دیکھتا اسکی ادائے دلفریب — دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا
فتنۂ حشر کب اٹھا اس کے خرام ناز سے — وہ بھی پڑا ہے میری طرح راہ میں پائمال سا
پوچھتے کیا ہو کون تھا ہو نہ ہو وہ ہی داغ تھا — در پہ تمہارے تھا مگر کوئی شکستہ حال سا

مرے سوال کے معنی وہ مجھ سے کہہ دیتے — مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
نگاہ شوق پہ الزام بے قراری کا — تمہارے برق تجلی کو اضطراب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف — ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

بے عشق کے جیتا مجھے دم بھر بھی نہ ہوتا — سودا جو نہ ہوتا تو مرا سر بھی نہ ہوتا
ہے واسطے ہر کام کے اک روز مقرر — ہوتا جو نہ انصاف تو محشر بھی نہ ہوتا
آتا جو یہاں روز جزا اے شب ہجراں — بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا
ظالم جو کہا اس کو یہ ہے حسن کی خوبی — بہتر تو یہی تھا کہ وہ بہتر بھی نہ ہوتا
غارت گر ایماں تو ہے اے داغ یہ کافر — گر عشق نہ ہوتا کوئی کافر بھی نہ ہوتا

جب تک مرے گریہ سے طوفاں نہ ہوا تھا — الفت میں کوئی کار نمایاں نہ ہوا تھا
شامت مری جو میں نے مسیحا انھیں جانا — آتی تھی اجل درد کا درماں نہ ہوا تھا
اس وعدہ فراموش کا اللہ رے تغافل — گویا نہ کیا تھا کبھی پیماں نہ ہوا تھا

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا   کیا کلیجا ہے تماشائی کا
آئی شوخی میں کہاں سے تمکین   پڑ گیا صبر تمنائی کا
ضعف نے دل کو تڑپنے نہ دیا   ہو گیا نام شکیبائی کا

انداز کچھ ملانے لگا جور یار کا   اب لطف دیکھنا ستم روزگار کا
رہتی تھی اسکی یاد وہ راتیں کدھر گئیں   اب مجھ کو انتظار ہے اُس انتظار کا
اے چشم یار دیکھ تغافل سے باز آ   دل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا

یاں امتحان برق تجلی ضرور تھا   کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا
ہم بوسہ لے کے ان سے عجب چال کر گئے   یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا
اے داغ صدمہ غم ہجراں بجا درست   یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا

ہمیں زمانے میں بدنام تیری خو نے کیا   دل فریفتہ جو کچھ کیا سو تو نے کیا
غرور کیوں نہ ہو جب دل سی چیز ہاتھ لگے   بڑا دماغ تری زلف مشک بو نے کیا
کھلا میں ان سے تو وہ اور داغ مجھ سے گڑ   خفا تو ان کو مری شرح آرزو نے کیا

شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج   یہ برق بلا دیکھئے گرتی ہے کدھر آج
وہ جانتے ہیں آتی ہے قیامت کی سحر آج   روتا ہے گلے مل کے دعاؤں سے اثر آج

پکارتی ہے خموشی مری فغاں کی طرح   نگاہیں کہتی ہیں سب رازِ دل زباں کی طرح
کبھی تو صلح بھی ہو جائے زہد و مستی میں   الٰہی شیخ بھی مے خوار ہو مغاں کی طرح
جلا کے داغ محبت نے دل کو خاک کیا   بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح
حیا نے روک لیا جذب دل نے کھینچ کیا   چلے وہ تیر کی صورت کھنچے کماں کی طرح

جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ
گری ہی پڑتی ہے بیمار ناتواں کی طرح

یہ سد راہ ہوا کس کا پاس رسوائی
رکے ہوئے ہیں مرے اشک کارواں کی طرح

ادائے مطلب دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انھیں سنا ہی دیا حال داستاں کی طرح

کچھ ان سے کہنے کو بیٹھے تھے ہم کہ خلوت میں
رقیب آ ہی گیا مرگ ناگہاں کی طرح

زبان خار ہوئی تر ہماری وحشت سے
کہ چھالے پھوٹ گئے چشم خوں فشاں کی طرح

خدا قبول کرے داغ تم جو سوئے عدم
چلے ہو عشق بتاں لے کے ارمغاں کی طرح

وہی تو ہے شعلۂ تجلی کہ دشت ایمن سے تنگ ہو کر
جب اس نے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر

وہ ہم ہیں مجنون دشت پیما جنوں کو ہوتا ہے ہم سے سودا
کہ چشم آہو میں بھی وحشت ہماری وحشت سے تنگ ہو کر

جھکی ذرا چشم جنگ جو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اس ملاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

آئے وہ بے وفا یہاں اسکی بلا کو کیا غرض
جائے در قبول تک میری دعا کو کیا غرض

اسکی گلی سے آئے کیوں نکہت زلف لائے کیوں
مجھکو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض

یہ تو مرا ہی کام ہے سجدے کروں تو میں کروں
کیوں ترے پاؤں پر گرے زلف رسا کو کیا غرض

ہے چارہ ساز گلچیں گلہائے داغ دل کا
شامت بہار کی ہے آئی جو اس چمن میں

یہ شوق خود نمائی کیا پہ کچھ جنوں سے کم ہے
بے تاب تجھ کو لایا خلوت سے انجمن میں

یہ کیا کہ دل میں آؤ تو خاک میں ملاؤ
رونق ہو انجمن کی بیٹھو حسیں انجمن میں

آغاز شوق میں نہیں انجام کی خبر
اس مبتدا کی دیکھئے نکلے خبر کہاں

مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ "حضرت اِدھر کہاں"

دل میں گھر یار کے پیکان کیے بیٹھے ہیں
مجھ پہ قبضہ مرے مہمان کیے بیٹھے ہیں
ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاج بہار
پہلے ہی چاک گریبان کیے بیٹھے ہیں

میکشو مژدہ کہ گھنگور گھٹائیں آئیں
تم پہ رحمت ہوئیں توبہ پہ بلائیں آئیں
کس کی زلفیں مجھے یاد آئیں شب ہجراں میں
کہ بلائیں مری لینے کو بلائیں آئیں
ناز ہے ان کو کرم پر کہ نہیں جس کا حساب
کس خطاوار کی گنتی میں خطائیں آئیں

ہم تری بزم سے اے یار چلے جاتے ہیں
لے چلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں
گرچہ سوسو ہیں تغافل کہ نہ جانے کوئی
اُن نگاہوں کے مگر وار چلے جاتے ہیں
بھول کر راہ چلے آئے ہیں للہ بخشو
ہم خطاوار گنہگار چلے جاتے ہیں

دل میں سما گئیں ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
اس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں
تاثیر کے سنگ حوادث سے آئے کیا
میری دعا بھی ٹھوکریں کھاتی ہے راہ میں

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
ان کو بے تاب کیا کچھ نہ کیا نالۂ دل
یہ تو کچھ بھی نہ ہوا یہ تو اثر کچھ بھی نہیں
اک جفا تیری جو کچھ بھی نہیں تو سب کچھ ہے
اک وفا میری کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

حشر میں دست جنوں سے نہ خجل ہوں اے داغ
کہ مرے پاس بجز دامن تر کچھ بھی نہیں

دست وحشت کے لئے تار رگ جاں میں نہیں
ہاتھ اس تار میں الجھا جو گریباں میں نہیں

تیرے اقرار میں انکار تری ہاں میں نہیں
عہد میں عہد یہ پیماں کسی پیماں میں نہیں

مجھ کو حیرت کا گماں دل میں تمنا کا یقیں
نالہ کہتا ہے کچھ اس خانۂ ویراں میں نہیں

جلوۂ ہوش ربا دیکھ لیا اے موسیٰ
ہاں تحیر میں وہ لذت ہے جو عرفاں میں نہیں

دیکھئے راہ میں ٹھوکر سے نہ کھل جائے گرہ
ایک فتنہ ہے یہ دل گوشۂ داماں میں نہیں

اف رے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے
بل بے پردہ کہ وہ ہے اور دل حیراں میں نہیں

رنگِ گل، نغمۂ بلبل، اثرِ بادِ بہار
جب سے ہم قید ہوئے کوئی گلستاں میں نہیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

جس دن سے کچھ شریک ہوی میری مشت خاک
اس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں

بات میری کبھی سنی ہی نہیں
جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

دل لگی دل لگی نہیں ناصح
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں

داغ کیوں تم کو بے وفا کہتا
وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہوں
مگر انھیں تو کسی بات پر قیام نہیں

چاک ہو پردۂ وحشت مجھے منظور نہیں — ورنہ یہ ہاتھ گریباں سے کچھ دور نہیں
دل کو ہوتی ہے خبر آپ کہیں یا نہ کہیں — ہم کو معلوم ہے وہ بات جو مشہور نہیں
لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا — "دیکھ پچھتائے گا خاموش، یہ دستور نہیں"

کتنا باوضع ہے خیال اس کا — بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے
ناامیدی مٹائے جاتی ہے — شوق نقشہ جمائے جاتا ہے
ہمت لے خاک، ہاں مدد اے ضعف — کوئی دامن بچائے جاتا ہے
اس کا آنا تو در کنار اے داغ — دل ہی قابو سے ہائے جاتا ہے

اس انجمن سے بہت بے قرار ہو کے چلے — سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے
تری نگاہ بہت مست ہے، سنبھل کے ذرا — سمند ناز وا اگر سوار ہو کے چلے
کسی کی آنکھ میں وہ انتظار ہو کے رہے — کسی کے دل سے شکیب و قرار ہو کے چلے

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی — چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی
رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں — یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی
رہے گا ترا جلوہ مد نظر — جہاں تک ہماری نظر جائے گی
صبا اس گلی سے مری خاک کو — جب آئے گی برباد کر جائے گی
دیا دل تو اے داغ اندیشہ کیا — گذرنی جو ہو گی گذر جائے گی

ابھی نزاکت رفتار یار باقی ہے — ابھی زمانہ ناپائدار باقی ہے
خزاں ہے دیکھ کے وحشت سی چھا گئی دل پر — ابھی نظارۂ فصل بہار باقی ہے
وہ چشم زار کا سنتے ہی ماجرا گھبرائے — ابھی تو شرح دل بے قرار باقی ہے
جو یہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں علاج باقی — جو عشق ہے تو غم بے شمار باقی ہے

طلب ہے چاہنے والوں سے امتحانوں کی
بری بنی ہے خدا خیر کرے جانوں کی
خدا کرے ابھی اے باغباں گرے بجلی
ترے چمن کو لگے آگ آشیانوں کی
قدم قدم ہے تری چال کا نیا انداز
دگر نہ ایک روش ہے سب آسمانوں کی

منصفی دنیا سے ساری اُٹھ گئی
اے بتو ایمانداری اُٹھ گئی
بے طرح پھیلا ہے اُن زلفوں کا جال
اب امید رستگاری اُٹھ گئی
دور ہیں اس چشم مست ناز کے
لذت پرہیزگاری اُٹھ گئی
کس سے رکھئے داغ چشم دوستی
اُٹھ گئی یار دل سے یاری اُٹھ گئی

لگ چلی باد صبا کیا کسی مستانے سے
جھومتی آج چلی آتی ہے مے خانہ سے
روح کس مست کی پیاسی گئی مے خانے سے
مے اُڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے
وہی وحشت ہے وہی خار وہی ویرانہ
دشت کس بات میں اچھا مرے کاشانے سے
ایک چلو میں بہت داغ بہک اُٹھے تھے
آج سنتے ہیں نکالے گئے مے خانہ سے

شوخی میں انکی چھیڑ ہے کچھ اضطراب کی
گھر کر گئی وفا کسی خانہ خراب کی
اس روئے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب
نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی
تم اور آرزو مرے ملنے کی روز حشر
میں اور گفتگو ستم بے حساب کی
اے اشک ڈوب مر تری تاثیر دیکھ لی
الٹی ہنسی اُڑی مری چشم پر آب کی
در پردہ جوش حسن نے بے پردہ کر دیا
ٹوٹی گرہ تڑاق سے بند نقاب کی
اے دل کمی کرے نہ کہیں طول مدعا
لینی ہے کل خبر مجھے روز حساب کی

کہ شوق بے اثر نہ ہوئی
تم کو پردہ میں کیا نظر نہ ہوئی
حال وہ کیا جو حشر میں نہ کہا
بات وہ کیا جو وقت پر نہ ہوئی

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے ۔ نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے
تم نے اپنے داغ محبت سے کیا ہے اُنکا ۔ یہ سخن یاد رہے یاد رہے یاد رہے

شوق میں ایک فتنہ قامت کے ۔ ہم گلے مل گئے قیامت کے
آئی تیشہ سے یہ صدا پیہم ۔ کوہکن کام ہیں یہ فرصت کے
وہ نزاکت سے تھم گئے چل کر ۔ دو قدم گز گئے قیامت کے

کیا تھا جرم وفا لذت سزا کے لئے ۔ ستم کے لطف اٹھائے مزے جفا کے لئے
بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ ۔ وہ منتوں سے کہیں چپ ہو خدا کے لئے
ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی ۔ عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لئے

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری ۔ غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری
کیا جدائی کا اثر ہے کہ شب تنہائی ۔ میری تصویر سے ملتی نہیں صورت میری
وہ دبے پاؤں چلیں حشر کے ڈر سے توبہ ۔ فکر ہے چال اڑا لے نہ قیامت میری
کون سا لب ہے کہ جس پر نہیں شکوہ تیرا ۔ کون سا دل ہے کہ جس میں نہیں حسرت میری

آشفتگی کسی کی اثر کچھ تو کر گئی ۔ بن بن کے رخ پہ زلف تمہارے بکھر گئی
وقت نظارہ کی کشش حسن نے کی ۔ آنکھوں کو لے کے ساتھ نہ میری نظر گئی

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے ۔ بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے
ترا وہ حسن ہے اے شعلہ رو جو تو چاہے ۔ بغیر شمع کے پروانہ انجمن میں رہے
زبان دے نہ عدو کو کہیں تو وہ شے ہے ۔ ترے دہن میں رہے یا مرے دہن میں رہے

اب وہ یہ کہہ رہے ہیں مری مان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے
مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

دل جو ناکام ہوا جاتا ہے
شوق کا کام ہوا جاتا ہے
آجکل کثرت عشاق سے عشق
شیوۂ عام ہوا جاتا ہے

میر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی

رونق گلشن جو وہ رند شرابی ہو گیا
پھول ساغر بن گیا غنچہ گلابی ہو گیا

نکہت گل سے چمکتا ہے سوا رنگ جنوں
کوئی مجھ سا بھی نہ آمادۂ سودا ہوگا

مسجد سے نکل کر میں رہ بتکدہ بھولا
تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا

گرا جو ہاتھ سے جام اختیار کیا ساقی
تجھے ملال مجھے انفعال ہونا تھا
دعا وصال صنم کی ضرور کی اے دل
خدا سے طالب امر محال ہونا تھا

اس رخ کی نازکی ہے گل تازہ بہار
ہر تار زلف رشتۂ شیرازۂ بہار

ہر داغ سینہ نالۂ گلزار فیض ہے　　پاتے ہیں چاک جیب میں اندازۂ بہار

•

زمانے کی ہے یہ طاقت کہ کوئی دم ٹھہرے　　پھرا رہی ہے یہ تیری نگاہ کی گردش

•

جب سے بلند نالۂ سوزاں مرا ہوا　　کرتی ہے برق اپنے گریباں کی احتیاط

•

پہنچی ہے تری زلف رسا بڑھ کے قدم تک　　ہیں خاک نشیں ہم بھی ضرور آئیگی ہم تک
داغ دل سوزاں سے ہوں میں شمع شبستاں　　ہے گرمئ ہنگامہ محفل مرے دم تک

•

نبض بیمار جو لے رشک مسیحا دیکھی　　آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی
خندۂ گل ہے کہیں نالۂ بلبل ہے کہیں　　سیر اس گلشن ایجاد میں کیا کیا دیکھی

•

آج ساقی میں نہیں گو کہ مروت باقی　　خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی
رات صیاد کو کیا کیا نہ سنائے قصے　　نہ رہی کوئی گلستاں کی حکایت باقی

•

غنچہ ساں سامنے اس گل کے رہے ہم خاموش　　سو زبانیں تھیں مگر طاقت گفتار نہ تھی

•

دخل اغیار نہیں بزم گل و بلبل میں　　پاؤں کچھ سوچ کے اے باد بہاری رکھنا

•

شیشہ ہاتھ آیا نہ ہم نے کوئی ساغر پایا　　ساقیا اے تری محفل سے چلے بھر پایا

•

باغ میں پھول کھلے موسم سودا آیا　　گرم بازار ہوا وقت تماشا آیا
سارباں ناقۂ لیلیٰ کو نہ دوڑا آتا　　پاؤں مجنوں کے تھکے ہاتھ ترے کیا آیا

گلشن دہر میں پھر فصل بہار آئی ہے — غنچے شاد ہیں سب میکدے آباد ہیں سب
قابل صحبت خوباں تو نہیں ہوں لیکن — ربط کے جتنے ہیں انداز مجھے یاد ہیں سب

ہوا جو خاک بدن ساغر شراب بنا — ہزار شکر کہ ذرہ سے آفتاب بنا

خفا وہ ملتے ہیں اتنا کوئی نہیں کہتا — کہ خون عاشق شیدا حضور ہوتا ہے

رونے سے مرے اس گل خوبی کو خبر ہے — صد شکر کہ اشکوں میں ابھی رنگ اثر ہے

شمیم گل میں جو ملبوس یار کی ہوتی — ہوا کچھ اور نسیم بہار کی ہوتی

منشی امیر احمد امیر مینائی

مرغان باغ تم کو مبارک ہو سیر گل — کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

بہار آئی ہے اے دست جنوں یا عید آئی ہے — گریباں سے گلے ملنے چلا ہے چاک دامن کا

گردش بخت کہاں سے ہمیں لائی ہے کہاں — منزلوں وادی غربت سے وطن دور رہا
جلوہ برق تجلی نظر آیا نہ کبھی — مدتوں جا کے میں زیر شجر طور رہا
ہم بھی موجود تھے کل محفل جاناں میں امیر — رات کو دیر تلک آپ کا مذکور رہا

پکارتا ہے یہ ناز اس کی کبریائی کا — کہ لے اڑا ہے مجھے شوق خود نمائی کا

عزیز کیوں نہ ہو داغ اسکی بے وفائی کا — کہ ہے صلہ یہی مدت کی آشنائی کا
مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں سے — رہے خیال ہماری بھی نارسائی کا
شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو — کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا
اٹھو امیر نہیں ماننے کی وحشت دل — یہ عذر لنگ تمہاری شکستہ پائی کا

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت — گرا جو آنکھ سے آنسو دُر یگانہ ہوا

انصاف جور یار خدا سے طلب کیا — تم نے بھی اے امیر بڑا ہی غضب کیا

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہ گاروں میں — اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہ گار نہ تھا

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

جو آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھا سحر کو سنسان سب سرا تھی
ہوا نہ ہمراہیوں سے اتنا کہ ساتھ لیتے مجھے جگا کر
ہو بزم جاناں میں حشر برپا تڑپ کا دل کے تھا یہ تقاضا
مگر بڑی مشکلوں سے روکا ادب نے زانو دبا دبا کر

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ — وگرنہ ربط کی اس سے ہزار راہیں تھیں
فلک کے دور سے دنیا بدل گئی ورنہ — جہاں بنے ہیں یہ میخانے خانقاہیں تھیں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسن بتاں کے ہیں — پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

گھبرا کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل　　آئی صدا یہی تو مقام امتحاں کے ہیں
وہ اور وعدۂ وصل کا قاصد نہیں نہیں　　یہ سچ ہے بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

پردے میں چاہتا ہے کہ ہنگامہ ہو بپا　　اے آفتاب حشر نمودار بھی تو ہو
زاہد امید رحمت حق اور ہجو مے　　پہلے شراب پی کے گنہ گار بھی تو ہو

کھاتے ہو قسم نہیں ہیں عاشق　　صورت تو امیرؔ اپنی دیکھو

ہمارے دل سے مٹے گا نہ داغ شوق سجود　　جبیں رہے نہ رہے آستاں رہے نہ رہے
امیرؔ جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے　　پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

پھولوں میں اگر ہے بو تمہاری　　کانٹوں میں بھی ہو گی خو تمہاری
اس دل پہ ہزار جان صدقے　　جس دل میں ہے آرزو تمہاری

ہم اور معرکۂ امتحاں سے ٹل جاتے　　جواب پاؤں جو دیتے تو سر کے بل جاتے

تیغ قاتل پہ ادا لوٹ گئی　　رقص بسمل پہ قضا لوٹ گئی
پس گیا چشم سیہ پر سرما　　پائے رنگیں پہ حنا لوٹ گئی
اس روش سے وہ چلے گلشن میں　　بچھ گئے پھول صبا لوٹ گئی

دم اخیر ہے لازم نظارہ کر لینا　　خدا سے کام پڑا ہے بتو خبر لینا
امیرؔ جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو　　پڑے گا راہ میں کعبہ سلام کر لینا

غیروں سے کبھی ہے کبھی مجھ سے ہے لگاوٹ — بہکی ہوئی پھرتی ہے محبت کی نظر آج
کس لطف سے جھنجھلا کے وہ کہتے ہیں شب وصل — ظالم تری آنکھوں سے گئی نیند کدھر آج
مانگی ہے دعا کس نے الٰہی کہ کھلا ہے — آغوش تمنا کی طرح باب اثر آج

بڑی گردش پہ بہت ہی تجھے اے چرخ گھمنڈ — جب میں جانوں کہ شب غم کی سحر پیدا کر

اسے دیکھا تصدق کر دیا دل — کسی کو کیا مری آنکھیں مرا دل
امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا — نگاہیں بول اٹھیں وہ لے لیا دل

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں — مشعل دکھائی برق تجلی نے راہ میں
اندھیر کر رہی ہے یہ چشم سیاہ میں — شوخی کو قید کیجیے نیچی نگاہ میں
وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں — میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں
پھر اسکی شان کریمی کے حوصلے دیکھے — گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں
جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے — پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں
وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری — قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں — فتنوں نے قدم چوم لئے لغزش پا میں
مشکل ہے مسیحا کو بھی اب جان بچانا — نکلی ہے قضا چھپ کے حسینوں کی ادا میں

خالق ہی جب نہ دے تو گلہ آسماں سے کیا — ساقی نہ منہ لگائے تو ساغر سے کیا کہیں

کیا قدر ہے فسانۂ الفت کی یاں امیرؔ — کہتے ہیں ہم سنیں نہ سنیں تم کہا کرو

داغ افسردہ ہو چلے دل کے — جھلملاتے چراغ محفل کے
دل میں آ کر نہ دل سے پھر نکلے — تم تو ارمان بن گئے دل کے
اسکی رحمت سے لو لگا کہ امیرؔ — آڑے آئے گی وقت مشکل کے

کہہ ہی دی حسرت میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی — ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی
وصل کی شب واہ ری بے تابیٔ شوقِ وصال — شرم بھی نیچی نگاہوں سے تماشائی ہوئی

بال کھولے جو یار آتا ہے — گھر کے ابر بہار آتا ہے
درد دل میں مری تسلی کو — گریۂ بے اختیار آتا ہے
تم کو آتا ہے پیار پر غصہ — مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے — لوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی — بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے
وصل کا دن اور اتنا مختصر — دن گنے جاتے ہیں اس دن کے لئے

آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے — چلئے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے
انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں — جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

عشق نے زور دکھایا تھا امیرؔ — کوہکن کوہ کنی کیا کرتا

ہے آج جو سرگزشت اپنی — کل اس کی کہانیاں بنیں گی

چھپتا ہے دل کا رنگ کہیں ضبط آہ سے — حسرت ٹپک رہی ہے ہماری نگاہ سے

ہاتھ رکھ کر مرے سینے پہ جگر تھام لیا — تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

پوچھو نہ اس زمانے میں الفت کا حال کچھ — اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

چھوڑے کہیں نہ گیسوئے پرخم نے اس کے پیچ — کچھ رہ گئے تو پیچ مقدر میں رہ گئے

تم دکھاتے تو ہو امید کا دل — اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

خانقاہوں میں جو یہ پھرتی ہے بہکی بہکی — توبہ بھی پی کے مگر نکلی ہے میخانے سے

نہ مست ہے نہ کوئی ہوشیار باقی ہے — حجاب کس سے اب اے چشم یار باقی ہے

صبا ان منہ بندھی کلیوں نے شب کو کس کی چوری کی
کہ تو نے صبح کو ایک ایک کی یعنی شہرت دی ہے

عجب رسائی قسمت ہے اے خدا تیری — چمن جو چھوٹ گیا دست نازنیں میں رہا

خواجہ الطاف حسین حالی

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں — تم جاننا کہ بزم میں ایک خستہ جاں نہ تھا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا — سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط — الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ — ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل — اگر تیر اس کا خطا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور — مرا شکر اسی کا گلہ ہو گیا
وہ امید کیا جس کی ہو انتہا — وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت — وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال — کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں — ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
ہر سمت گردِ ناقۂ لیلیٰ بلند ہے — پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
ہے غم روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل — ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار — اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غم ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوق تلاش فکر وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوش پنہاں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دل وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ تری کاکل پیچاں میں نہیں

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلماں میں نہیں

کچھ پتا منزل مقصود کا پایا ہم نے — جب یہ جانا کہ ہمیں طاقت رفتار نہیں
بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی — سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہل وعظ — یا آپ بھی ملازم پیر مغاں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے
خوش ہے امید خلد پر حالی — کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حق وفا کا جو ہم جتانے لگے — آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
نہ ملا کوئی غارت ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی

سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی

جفائے یار کا دل کو ملال آ ہی گیا — ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا
ذرا سی ٹھیس بھی شیشہ کو تھی بہت ساقی — ہزار تو نے بچایا تھا بال آ ہی گیا

پیر مغاں کے معجزے دیکھ چکے ہو واعظو — تم نہ پیو جو مے تو خیر حکم تو دو جواز کا

آئے اگر عروس بیا ہرِ مبول کے میکدے میں اب کہہ دو یہ صومعہ نہیں زاہد پاک باز کا

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا
کوئی خفا ہو تو ہو امر حق مگر یوں ہے بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تار نفس بھی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا
نازک تھا بہت کچھ دل میرا اے شاد تحمل ہو نہ سکا
اک ٹھیس لگی تھی یوں ہی سی کیا جلد یہ شیشہ ٹوٹ گیا

آکے زنجیر کو آنکھوں سے لگاتا ہے کون کس کے دل میں ہے ادب آپ کے دیوانے کا
خود چلا اس کوچے میں جانا ہے جو اے پائے طلب کوئی واں ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جانے کا

نرگس پُر خمار یار کرتی ہے کام زہر کا بادۂ خوشگوار میں گھول دیا کسی نے سم

ڈھونڈھو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
اے شوق پتہ کچھ تو ہی بتا اب تک یہ کرشمہ کچھ نہ کھلا
ہم میں ہے دلِ بے تاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

حسن و عشق ایک ہیں ظاہر ہیں فقط ہیں دو نام
یہ اگر صحیح ہے تو کیا اُن کے برابر ہم ہیں
عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

ہوں گی زیادہ اس سے بھی عشق میں جگ ہنسائیاں
دل نے تو آپ مول لیں اپنے لئے برائیاں
فصل خزاں ہے پر بلا اس سے خدا پناہ دے
منہ پہ صبا کے بھی گلو پھٹنے لگی ہوائیاں
حشر میں رند تھے خموش صحبت مئے سے چھوٹ کر
پیر مغاں کو دیکھ کر دینے لگے دہائیاں

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی
یہی جو ساماں ہیں یہ نہ ہوں گے تو پھر محبت کہاں رہے گی
بتا چلا ڈھیر راکھ کا تو بجھا چلا اپنے دل کی تسکین
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی
بہت سے تنکے چنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیاد تو خفا ہو
قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیاں رہے گی
ہزار کھینچ کر جدا ہو مجھ سے ہزار دوری ہو میرے تیرے
جو اک کشش حسن و عشق میں ہے مرے ترے درمیاں رہے گی
ہزار نقش قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی
بہت سے بھول لیں گے غنچہ و گل یہی تو اس باغ کی روش ہے

چڑھائے جائیں گے آگ پر جو انھیں کی خوشبو عیاں ہوگی

تصور اس کا رکھ دل میں جو ہے دیدار کا جویا   لگائے منہ جو آئینے کو آئینہ اسی کا ہے
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی   جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

نگہباں ہیں کچھ ایسے ادا فہماں کے   کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکبازاں کے
تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے   اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز ان کے
نظر اٹھانے میں ہوتا ہے بازپرس کا ڈر   جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفرازاں کے

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا
لاریب خموشی نے تیری تاثیر دکھائی مستوں کو
بے باک جو میکش تھا ساقی اس بزم سے وہ محجوب گیا

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں   کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ   ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
نہیں اٹھتے قدم کیوں جانب دیر   کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم   میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی
وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

نہ سحر چشم جاناں ہے نہ لطف غمزۂ ساقی
تو پھر صحن چمن میں دیدۂ نرگس سے کیا حاصل

غیر کے ذکر میں کرتے نہیں میرا وہ لحاظ
تذکرے آتے ہیں اور نام بنام آتے ہیں

کم بخت دل کو کیوں ہے لگاوٹ انھیں کے ساتھ
ان کو تو شوق ناز و ادا سب کے ساتھ ہے

دل کو آماجگہ تیر قضا کرتی ہے
حسن کا حق وہ نظر خوب ادا کرتی ہے

محمد ہادی عزیز لکھنوی

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگار حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

آئینہ چھوڑ کے دیکھا کئے صورت میری
دل مضطر نے مرے ان کو سنورنے نہ دیا
اٹھ گیا انجمن ناز سے گھبرا کے کوئی
درد دل اپنا مجھے ختم بھی کرنے نہ دیا
تہ میں دریائے محبت کے تھی کیا چیز عزیز
جو کوئی ڈوب گیا اس کو ابھرنے نہ دیا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں
مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا
دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھے
تیرے ہر انداز کو چھپ چھپ کر کوئی دیکھا کیا

یہ تیری آرزو میں بڑھی وسعت نظر — دنیا ہے سب مری نگہ انتظار میں
اے بیدلی نہ یوں کسی بے کس کی آس توڑ — دنیائے شوق ہے دل امیدوار میں

چارہ گر چپ ہیں کیوں علاج کریں — کچھ تو اپنے کئے کی لاج کریں

ہاں نہ چھیڑو اے طلبگاران سامان نشاط — ہم یونہی اپنے تصور سے بہلتے جائیں گے

بیخودی کوچۂ جاناں میں لئے جاتی ہے — دیکھئے کون مجھے میری خبر دیتا ہے

اک تغیر حسن کی فطرت میں پیدا ہو گیا — جب مرے شکوے انھیں کچھ کچھ مزہ دینے لگے

مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

بلائیں لے رہا ہوں اس زمیں کے ذرے ذرے کی — لٹا تھا جس جگہ راہ وفا میں کارواں میرا

وفور شوق میں اک اک قدم میرا قیامت تھا — خدا معلوم کیونکر جلوہ زار حسن تک پہونچا

زور نظر سے خود بخود بند نقاب کھل گئے — حوصلہ چشم شوق کا ہم نے انھیں دکھا دیا

لٹنے میں عشق کے دل دیوانہ چھٹ گیا — چشم و چراغ خلوت جانانہ چھٹ گیا
اے محتسب خدا کے لئے اپنی راہ لے — گویا ترے چھڑائے سے میخانہ چھٹ گیا

جب سے یہ شہرت ہوئی کھلنے کو ہیں گیسوئے دوست
ہم بھی بیٹھے ہیں دماغ و دل کو آمادہ کیے

ہزاروں مر گئے مجنوں کے ایسے دیوانے
مگر ملی نہ کسی کو بھی انتہائے بہار

وہی یہ پھول ہیں جن کو ابھی دیکھا تھا گلشن میں
مگر کچھ اور ہی نقشے ہو گئے گلچیں کے دامن میں

دے کے ساغر مجھے کس لطف سے ساقی نے کہا
"دیکھتے جاؤ ابھی ہم تمہیں کیا دیتے ہیں"

جہاں تک بس چلا شورِ فغاں روکیں گے فرقت میں
ذرا سی بات پر بدنام نامِ عاشقی کیوں ہو؟

زخمِ نگہِ ناز وہ دیکھیں کہ نہ دیکھیں
کیا داد نہ دیں گے مجھے اربابِ نظر بھی

ہجومِ یاس جو دم بھر کو دل سے ہٹ جائے
تو لب تک آنے کی حرفِ دعا کو راہ ملے
میں اپنی تارِ نظر کی بنا رہا ہوں نقاب
یہ مدعا ہے مجھی سے تری نگاہ ملے

مذاق بے محل ہے وحشیوں میں یہ ہی ہوگی
ہنسی رو کے رہیں چاکِ گریباں دیکھنے والے

کمالِ بخیہ گر زورِ جنوں پر خندہ زن ہوگا
الٰہی آبرو رکھنا مرے چاکِ گریباں کی

ریاض احمد ریاض خیرآبادی

پھول ہے لالۂ صحرائی کا
یا کلیجہ ترے سودائی کا

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے ۔ پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں

محفل مے میں ہیں زاہد کے فرشتے بھی شریک ۔ یہ تکلف تو نہ تھے بزم میں ہم سے پہلے

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے ۔ ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے

نکال دوں گا شب وصل بل نزاکت کے ۔ ڈرا لیا ہے بہت تیوریاں چڑھا کے مجھے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی ۔ جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

رضا علی وحشت

تری مستانہ رفتاری سے ظاہر موج دریا تھی ۔ تری ہنگامہ آرائی سے پیدا شور محشر تھا

میں سادہ لوح واقف رسم بتاں نہ تھا ۔ اقرار عشق کر کے گنہ گار ہو گیا

بنے گا ذوق عطا خود اس کا محرک آشنا نوازی
طلب کی خاطر دراز کرنا ضرور کیا دست آرزو کا
دل و جگر خون کر رہی ہے سرور عشرت کی ناتمامی
شراب خانہ میں تیرے ساقی ہے کام کیا ساغر و سبو کا

مطلب ہے سیر باغ سے افزائش جنون ۔ ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیم بہار میں
وحشت نہ پوچھ مستی جیب جنوں پرست ۔ وحشت کے گل کھلائے ہیں جوش بہار میں

تلخی کش نومیدی دیدار بہت ہیں — اس نرگس بیمار کے بیمار بہت ہیں
عالم پہ ہے چھایا ہوا اک یاس کا عالم — یعنی کہ تمنا کے گرفتار بہت ہیں

کہوں کیا سجدہ ہائے شوق کی ہنگامہ آرائی — وہ طوفان یاد ہے ابتک زمین کوئے جاناں کو

کیوں مجھ کو زخود رفتہ کئے دیتی ہے یارب — وہ بوئے دل آویز کہ ہمدوش صبا ہے

شومئی عشق کہ ہم ہو گئے رسوائے جہاں — خوبئ حسن کہ سب آپ کو پہچان گئے

اک آن میں وہ کچھ ہیں تو اک آن میں کچھ ہیں — کروٹ مری تقدیر بدلتی ہی رہے گی
ظالم کی تو عادت ہے ستاتا ہی رہے گا — اپنی بھی طبیعت ہے بہلتی ہی رہے گی

کیا کیا بگڑ رہے ہیں وہ اہل نظارہ پر — تقریب ہے کشودن بند نقاب کی

ترے پھر کر آتے آتے کہیں یہ نہ ہو کہ قاصد — مری جان پر بنا دے مری دل کی ناصبوری

مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب قزلباش لکھنوی

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی — ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا
سنائیں کیا تمہیں نیرنگ عشق کا قصہ — تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا ہے

میری قضا تھی برق تجلی کا کیا قصور — بد نام مفت جلوۂ جانانہ ہو گیا
وارفتہ زلف کا نہیں پابند نقش گل — جب دل میں لہر آ گئی دیوانہ ہو گیا

زاد حیات دے نہ سکا قصد دل کا ساتھ — اس در پہ جاتے جاتے میں افسانہ ہو گیا

بس اے فلک نشاط دل کا انتقام ہو گیا — ہنسا تھا جس قدر کبھی زیادہ اس سے رو چکا
یہ خندۂ طرب نما مبارک اہل دہر کو — بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
نہ دم لے اے سرشک غم تجھے قسم ہے عشق کی — فلک کو چھیڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا
ہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ میں — مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سمو چکا
یہ آشیانۂ ستم، چمن میں ہو تو خوب ہے — یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس ترا ہو چکا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن — ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا
حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر سہی — مجھ پہ احسان تری ٹوٹی ہوئی انگڑائی کا

سلسلہ ذکر جنوں کا ابھی تک باقی ہے کیوں — ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا
سیر عالم کے لئے کچھ چھوڑ لے دست جنوں — اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

متاع عشق کا ہو دل کے بعد کیا سودا — کہ گم شدہ کا بھروسا نہیں ملا نہ ملا

تڑپوں تو راز کھو لوں سنبھلوں تو عشق ناخوش — جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر — رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی — میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

•

ان کی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی — نالہ کش برسوں کا ایک تصویر بن کر رہ گیا

•

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر — یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

•

تیرے ہوتے گل گلشن کو میں دیکھوں توبہ — ابھی ایسی تو نہیں قوت تسخیر بہار
میں تو میں گل بھی تو ہیں جامہ دری میں مشغول — سب کو دیوانہ کئے دیتی ہے تاثیر بہار

•

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں — ابر سیاہ جانب گلزار دیکھ کر

•

صبر کی سالم قبائیں تو ہزاروں ہیں مگر — ٹھیک ہوتی ہی نہیں کوئی دل صد چاک پر

•

غنیمت ہے قفس فکر رہائی کیا کریں ہمدم — نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

•

بیان برق تجلی چھیڑا ہے اب سر طور — عجب نہیں مرے دل کی بھی گفتگو آئے

•

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے — سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا — کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

•

لہو تھا تمنا کا آنسو نہیں تھے — بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے
مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

چل اے ہمدم ذرا ساز طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے

مرا رونا شب فرقت تماشا گاہ انجم ہے مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفان دیکھنے والے
کہے جا بندہ چلا ہے داستاں کا رنگ محفل کا مری سننے لگے ہیں روئے جاناں دیکھنے والے

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے
بلا کے مجھ کو نکالا ہے اپنی محفل سے وہ نیکیاں نہیں اچھی جو ہوں بدی کے لئے

شوق بہار باغ میں تنکے چنے تو ہیں دیکھوں جو دیکھنے دے اسیری کا ڈر مجھے
غربت میں راہ کٹتی ہے ثاقب کسے عجب قصہ سمجھ رہا ہے مرا ہم سفر مجھے

یادگار دہر ہے یہ خود فراموشی مری آپ کو بھولا ہوں اوروں کا فسانا یاد ہے

کروٹیں لیتی ہے دنیا آفریں اے درد دل بوجھ میرا ہے مگر سارے جہاں پر بار ہے

آئینہ ان کو دکھایا جو خود آرائی نے ہاتھ رکھا مری آنکھوں پہ شکیبائی نے
طور پر تاب رہی یا نہ رہی خیر مگر کچھ تو دکھلا ہی دیا ذوق تمنائی نے

بے شانہ اپنی زلف کو چھوڑا نہ کیجئے — میں دیکھتا ہوں خواب پریشاں کبھی کبھی
اک عمر کاٹ دی ہے سواد گناہ میں — دھوتا ہوں شب کو بیٹھ کے داماں کبھی کبھی

صبح وصال دور تو اتنی نہیں مگر — راتیں ہیں بیچ میں تری زلف سیاہ کی

جدائی میں جس کو مشاق ہے الفت — وہ عمر رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے
وہی رات میری وہی رات اُن کی — کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

دل اپنا خوف اسیری سے مطمئن کب تھا — رہے چمن میں مگر آشیاں بنا نہ سکے

تماشا چشم دل سے اہل عرفاں دیکھ ہی لیں گے — کسی پردے میں ہو تصویر جاناں دیکھ ہی لیں گے

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے — یہ سب کچھ ہے مگر صیاد دل پر کیا اجارا ہے

حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری

فغاں میں درد دعا میں اثر نہیں آتا — جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا — نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آگیا روٹھنا کسی کا
دیکھو نہ جلیل کو مٹاؤ — مٹ جائے گا نام عاشقی کا

کوئی حسیں ہو ہمیں اک نگاہ کر لینا — جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا

نیاز مند ہوں کافی ہے ناز کرنے کو — سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا
کوئی سنے نہ سنے مجھ کو دردِ دل کہنا — اثر کرے نہ کرے مجھ کو آہ کر لینا

وہ شوق بھرا دل تھا حسرت سے تڑپ اٹھا — ثابت نہوا مجھ پر ناوک کا خطا کرنا
جلتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گذارش ہے — جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

برا نہ مانو اگر ذکرِ حور میں نے کیا — غرور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا
اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو — تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

خاک چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ — ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

روئے رنگیں پہ پسینے کا عجب عالم ہے — آب و آتش کو بہم دستِ گریباں دیکھا

مستی مری بہار پہ کچھ منحصر نہیں — ساقی کے دم سے روز ہے موسم بہار کا

موسمِ گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا — شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا
خوب انصاف تری انجمنِ ناز میں ہے — شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا
میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی — کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ ناممکن ہے — میں جلوں اور کلیجا رہے ٹھنڈا تیرا

دامن سے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار — اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا
آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیل — اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کی — رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

منتظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے — ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

بجلی کی تاک جھانک سے تنگ آ گئی ہے جاں — ایسا نہ ہو کہ پھونک دوں خود آشیاں کو میں

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں — وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

مزے بے تابیوں کے آ رہے ہیں — وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

ادا آنکھ چرا کے جانے والے — ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ — یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں

سب باندھ چکے کب کے سر شاخ نشیمن — ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

یا خدا درد محبت میں اثر ہے کہ نہیں — جس پہ مرتا ہوں اسے میری خبر ہے کہ نہیں

راہ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا — منزل پہ ہم پہونچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں — جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں
واعظو چھیڑو نہ رندوں کو بہت — یہ سمجھ لو کہ پیئے بیٹھے ہیں
دست وحشت کو خبر کر دے کوئی — ہم گریباں لئے بیٹھے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیم — اک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے ان کے لب پر — میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں
ہے آباد میرے تصور کی دنیا — حسیں آ رہے ہیں حسیں جا رہے ہیں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام — پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپ — کوئی جینے کا سہارا بھی نہیں

مریضوں کو تسکیں ذرا دیتے جاؤ — دعا لیتے جاؤ دوا دیتے جاؤ
نکلتی ہے اس میں بھی شان اک وفا کی — یوں ہی تم دغا پر دغا دیتے جاؤ
جلیل آ ہی جائیگا رحم اس صنم کو — تم اللہ کا واسطا دیتے جاؤ

بوئے مئے پا کے میں چلتا ہوا میخانے کو — ایک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو
کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی — رکھ لوں میں دل میں اٹھا کر ترے میخانے کو
دم زینت انھیں کیا جانئے کیا یاد آیا — آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو
ہے سبق یاد دو عالم کی فراموشی کا — ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے پلاتے ہوئے ساغر — رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو

وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو — کیا اب جواب دوں دل تنگ انتظار کو

اس گرفتار کی پوچھو نہ تڑپ جس کے لئے — در قفس کا ہو کھلا طاقت پرواز نہ ہو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
آتے آتے ان کو آئے گا خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
بے سبب اپنی جگر کاوی نہیں
عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی
فصل گل آئی جنوں اچھلا جلیلؔ
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے
دشت مجنوں میں بہار آئی ہے
باغ ہستی سے بہت دور تھے ہم
بو کسی گل کی لگا لائی ہے
داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو
وہ چراغ شب تنہائی ہے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے
آنکھوں میں کون آ کے الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشک رواں چلے
اٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کوئے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے
دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے
یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہیئے
ہو لے دامن تو جدا دیدۂ تر سے پہلے
شام غربت کا فسانہ نہ ابھی چھیڑئے دل
پوچھ لوں حال وطن باد سحر سے پہلے
کہہ گیا آج وہ بیدرد گلے مل کے جلیلؔ
ہم نہ واقف تھے ترے درد جگر سے پہلے

نکلی نہ آہ منہ سے مرے دل میں رہ گئی
صد شکر بات غیر کی محفل میں رہ گئی
تلوار کھینچ کے پنجۂ قاتل میں رہ گئی
بسمل کی آرزو دل بسمل میں رہ گئی
جتنے تھے جاں نثار وہ سب ہو گئے نثار
رونق ہی رونق آپ کی محفل میں رہ گئی
چلتی ہے تیغ ناز مزے لوٹ لو جلیلؔ
کہنا نہ پھر کبھی کہ ہوس دل میں رہ گئی

شب وعدہ عذر جفا ہو رہا ہے — وہاں آج خون وفا ہو رہا ہے
ستم ہے ستم کعبۂ دل کا ڈھانا — یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے
جلیل آج کل کشور دل میں اپنے — غم عشق فرماں روا ہو رہا ہے

اچھا ہے وہ جو مجکو پھراتے ہیں دربدر — آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے
سیر چمن کو آپ گئے تھے یہ گل کھلا — پھولوں میں آگ لگ گئی برق نگاہ سے

اظہار حال پر تجھے قدرت نہیں رہی — ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی
یا عمر بھر کا شوق تھا یا اک نگاہ میں — دیدار کی کلیم کو حسرت نہیں رہی

دل ہے عجیب گل چمن روزگار میں — رنگت تو پھول کی ہے مگر بو وفا کی ہے

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال — اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

میں نے پوچھا تھا کہ ہے منزل مقصود کہاں — خضر نے راہ بتائی مجھے میخانے کی
مست کر دیتی ہے پہلے ہی نگاہ ساقی — آنکھ کے سامنے چلتی نہیں پیمانے کی
بے خودی میں بھی یہی منہ سے نکلتا ہے جلیل — شیشے آباد رہیں خیر ہو پیمانے کی

مست کرنا ہے تو خم منہ سے لگا دے ساقی — تو پلائے گا کہاں تک مجھے پیمانے سے
پارسائی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیل — جھومتے آج چلے آتے ہیں میخانے سے

وہ بھی آنے کو ہیں قیامت بھی — دیکھئے کون پیشتر آئے
دل کے داغوں کا ہے وہ رنگ جلیل — باغ جیسے بہار پر آئے

وہ پھر بھی حسن پہ اپنے غرور کرتے ہیں　　یہ جانتے ہیں کہ ہے شام ہر سحر کے لئے
شب وصال گئی داغ دے کے فرقت کا　　نیا یہ پھول کھلا دامن سحر کے لئے
جلیل دیدۂ خونبار سے خدا سمجھے　　لہو کی بوند نہ چھوڑی دل و جگر کے لئے

سینے سے میں لگائے ہوں تجھکو خیال میں　　او مست ناز کچھ تجھے اپنی خبر بھی ہے
دل کی خوشی یہ ہے کہ لڑے آنکھ یار سے　　اس پر نظر نہیں کہ وہ جادو نظر بھی ہے
شوخی بھی ہے نگاہ میں شرم و حیا کے ساتھ　　آنکھ اس کی پردہ دار بھی ہے پردہ در بھی ہے

خون میرا اگر شریک ہوا　　رنگ دے جائے گی حنا تیری
عشق کا آج امتحان ہے جلیل　　مشکل آسان کرے خدا تیری

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے　　نگہ شوق پردہ در بھی ہے
کچھ تو بے چین ہیں وہ شوخی سے　　کچھ مری آہ کا اثر بھی ہے
ہے تماشا کہ دل نگاروں میں　　نام قاتل کا چارہ گر بھی ہے

ہو مزہ تم جو اٹھا دو رخ روشن سے نقاب　　شمع نازاں ہے کہ ہے رونق محفل مجھ سے
جذبۂ دل کا اثر ہو کے رہا ان پہ جلیل　　اب تو ہوتے ہیں اشارے سر محفل مجھ سے

ہمیں کیا اے جنوں کانٹے جو دامن گیر ہوتے ہیں　　نہ ہم رکھیں گے دامن کو نہ وہ الجھیں گے دامن سے
خدا جانے حقیقت کیا ہے لیکن میں یہ سنتا ہوں　　اٹھے گا فتنۂ محشر تمہاری چشم پرفن سے

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی　　آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا　　تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

•

جب تک خلش درد تھی یک گونہ مزا تھا　　جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

•

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں　　دو قدم کو چلے رسوائی ہے

•

ناز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی　　سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی
تم جو کہتے ہو بگڑ کر ہم نہ آئیں گے کبھی　　یہ بھی کہہ دو اب نہ آئے گی تمہاری یاد بھی

•

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے　　کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے
کچھ اختیار کسی کا نہیں طبیعت پر　　یہ جس پہ آتی ہے بے اختیار آتی ہے

•

پھر شوق تماشائے جاتا ہے کسی سمت　　پھر ذوق طلب مجھ کو تماشا نہ بنا دے

•

ادا ادا تیری موج شراب ہو کے رہی　　نگاہ مست سے دنیا خراب ہو کے رہی
کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا ان کو　　اٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی
جمیل فصل بہاری کی دیکھئے تاثیر　　گری جو بوند گھٹا سے شراب ہو کے رہی

•

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے　　کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری

•

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال　　مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

•

اللہ ری تجلی کہ رخ یار کے آگے　　یوں شمع ہے محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے

شوکت علی خاں فانی

تیرا نگاہِ شوق کوئی رازداں نہ تھا
آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں
اب تک تو اس زمین پہ کوئی آسماں نہ تھا

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا

اللہ رے بے نیازئ آدابِ التفات
دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا

میرے دلِ غیور کا حسنِ طلب تو دیکھ
گویا زباں پہ حرفِ تمنا گراں نہ تھا

اور تسلی سے سوا ہو گیا
درد جگر یہ تجھے کیا ہو گیا

اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج
کون گرفتار بلا ہو گیا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

خود برق ہو اور طور تجلی سے گذر جا
خود شعلہ بن اور وادئ سینا سے گذر جا

بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ
آئینہ اٹھا حسنِ خود آرا سے گذر جا

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک
اس مرحلۂ سعئ تماشا سے گذر جا

کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو
بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا

گراں گزریگا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کردے

غرورِ حسن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرت
کہیں ایسا نہ ہو یہ عشق کو بھی خود نما کردے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

دل کو تھا حوصلۂ عرضِ تمنا سو انہیں
سرگذشتِ شبِ ہجراں بھی سنائی نہ گئی

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کردے
ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کردے

ہشیار کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش
عشاقِ ستم کش کو ہوس کار نہ کردے

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کردے

ہوتا ہے برا لذتِ آزار کا پیکا
مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کردے

کچھ حد بھی ہے اس شورشِ خاموش کی حسرت
یہ کشمکشِ غم تجھے بیکار نہ کردے

شک انھیں مجھ پہ کاردانی کا
کچھ ٹھکانا ہے بدگمانی کا

تم جو کرتے تو ہم کو تھا کافی
اک اشارہ بھی مہربانی کا

حسن بے مہر کو پروائے تمنا کیا ہو
جب ہو ایسا تو علاجِ دلِ شیدا کیا ہو

کثرتِ حسن کی یہ شان نہ دیکھی نہ سنی
برق لرزاں ہے کوئی گرمِ تماشا کیا ہو

بے مثالی کے ہیں یہ رنگ حیا وصف حجاب
بے نقابی پہ ترا جلوۂ یکتا کیا ہو

ہم غرض مند کہاں مرتبۂ عشق کہاں
ہم کو کہیں وہ ہوس کار تو بیجا کیا ہو

تجدیدِ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں
شکوے تمام شکر کے عنواں ہو گئے

ان کی نگاہِ قہر کو ہم نے منا لیا
پھر اس طرح کہ خود بھی وہ حیراں ہو گئے

ناگوار ہے بہت تلخیٔ ہجراں لیکن / تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
یہ جو اک درد محبت کی خلش ہے حسرت / مقصد دل ہے یہی جان تمنا ہے یہی

بہت خجل ہے ترے درد سے دعا میری / یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری
وصال یار کی منزل قریب ہے حسرت / ہوئی ہے آرزو شوق رہنما میری

ان کو نہ کوئی سمجھے بیداد نہیں کرتے / ہم جور کے خوگر ہیں فریاد نہیں کرتے
دینا جو ہو دل لو دو آخر یہ ادا کیا ہے / انکار نہیں ہوتا ارشاد نہیں کرتے
اس پر بھی کچھ ایسا ہے راضی ہیں ہم دونوں / ہم شاد نہیں ہوتے تم یاد نہیں کرتے
کر وقف بتاں حسرت ناحق نہ غم اپنا / اس جنس گرامی کو برباد نہیں کرتے

دل مایوس کو گرویدۂ گفتار کر لینا / وہ ان کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا
سکون یاس بھی ممکن نہیں اب ہم غریبوں کو / قیامت ہے تمہی کا وعدۂ دیدار کر لینا
وہ دن اب یاد آتے ہیں بہار خونفشانی کے / وہ میرا جیب کو دامن کو بھی گلنار کر لینا
یہ کیا ایذا پسندی ہے کہ حسرت عشق خوباں میں / تجھے ہر عقدۂ آساں کو بھی دشوار کر لینا

بیگانۂ تفصیل ہیں لب ہائے شکایت / جب سے کہ ہوئی کشور حرماں کی خبر بند
فریاد کہ دل کی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچے / گویا ہے دعاؤں پہ مری باب اثر بند

چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت کی نظر / پڑ ہی جاتی ہے رخ یار پہ حسرت کی نظر
گرچہ ہے پردۂ انکار میں ہم شکل عتاب / پھر بھی ہے صاف نمایاں وہ اجازت کی نظر

عاشق دل فگار کر بے خود و بیقرار کر / محو لقائے یار کو شوق لقائے کیا غرض

چارۂ دردِ دل ہو کیوں انکی جفا جبیں ہو کیا — عشق بھی مشغلہ ہو کیوں مجھ کو شغل سے کیا غرض
حسرتِ مے پرست کو بلکہ ہر ایک مست کو — پیرِ مغاں کے دور میں خوفِ خطا سے کیا غرض

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں — جلد اے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں
آہ! کہتا وہ ترا پا کے مجھے گرمِ نظر — ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں — خرابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں
دل ہوس جو نشانہ تری نظر کا ہوا — تو روحِ شوق پکاری شکار ہم بھی ہیں
ابھی سے چھپتے ہیں مستی ہے حسن ان کی نظر — اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں
نگاہِ یار سے اظہارِ التفات ہوا — تو حالِ دل نے کہا آشکار ہم بھی ہیں
شکایت ان کی نہ چاہو یہی کہو حسرت — نشانۂ ستمِ روزگار ہم بھی ہیں

بہت نادم ہوئے آخر وہ میرے قتلِ ناحق پر — ہوئی قدرِ وفا جب آشکار آہستہ آہستہ
جلائے شوق سے آئینۂ تصویرِ خاطر میں — نمایاں ہو چلا روئے نگار آہستہ آہستہ
محبت کی جو پھیلی ہے یہ نکہت باغِ عالم میں — ہوئی ہے منتشر خوشبوئے یار آہستہ آہستہ
ملا کر خاک میں مجھ کو جھکی ہے شرم سے سرکش — اٹھے گی پھر وہ چشمِ فتنہ کار آہستہ آہستہ
نہ آئیں گے وہ حسرت انتظارِ شوق میں یوں ہی — گزر جائیں گے ایامِ بہار آہستہ آہستہ

خیالِ یار جو مصروفِ کار ہوتا ہے — قرار بخشِ دلِ بے قرار ہوتا ہے
یہ ماجرا بھی ہے دنیائے عاشقی میں نیا — کہ نامراد یہاں کامگار ہوتا ہے

اس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے — صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے
مقصود ہے اتنا کہ رہے مجھ پہ توجہ — مخصوص یہ اندازِ جفا میرے لئے ہے

جنت کی ہوس ہو تو میں کافر، کہ پریشاں — اس شوخ کی خوشبوئے قبا میرے لئے ہے

دام گیسو میں ترے اک دل ناشاد بھی ہے — اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے
کیسے کہہ دوں اسے بیگانۂ الفت کہ وہ شوخ — ظلم کرتا ہے مگر مانع فریاد بھی ہے
لطف ظاہر پہ کہیں اس کے نہ جانا حسرتؔ — کہ وہ عیار جفا جو ستم ایجاد بھی ہے

تری محفل سے ہم آئے مگر با حال زار آئے — تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمن اہل وفا تجھ سے — ہوس نے کام جاں پایا محبت شرمسار آئی

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت جاں — کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا
عاشقو حسن جفاکار کا شکوہ ہے گناہ — تم خبردار، خبردار نہ ایسا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرتؔ — ان سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

جان پُر غم نے بھی الزام لگایا نہ انہیں — یاس کو خوبیٔ تقدیر سے منسوب کیا
سخت محروم ادب ہے دل حسرتؔ نے اگر — بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

نظر بھر نہ کی اس پہ دل جس کا چھینا — محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا
وہ کیا قدر جانیں دل عاشقاں کی — نہ عالم، نہ فاضل، نہ دانا، نہ بینا
وہیں سے یہ آنسو رواں ہیں جو دل میں — تمنا کا پوشیدہ ہے اک خزینا
یہ کیا قہر ہے ہم پہ یارب کہ بے مے — گزر جائے ساون کا یوں ہی مہینا
بہار آئی سب شادماں ہیں مگر ہم — یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا

پائی ہے جگہ پاکئ دامانِ نظر میں ۔ خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر
کیا چیز تھی ساقی وہ پسِ پردۂ مینا ۔ جو سرخ پری بن گئی ساغر سے نکل کر

چاہت مری چاہت ہی نہیں آپ کے نزدیک ۔ کچھ میری حقیقت ہی نہیں آپ کے نزدیک
کچھ قدر تو کرتے مرے اظہارِ وفا کی ۔ شاید یہ محبت ہی نہیں آپ کے نزدیک
یوں غیر سے بے باک اشارے سرِ محفل ۔ کیا یہ مری ذلت ہی نہیں آپ کے نزدیک
مشتاق پہ کچھ حد بھی مقرر ہے ستم کی ۔ یا اس کی نہایت ہی نہیں آپ کے نزدیک
اگلی سی نہ راتیں ہیں نہ گھاتیں ہیں نہ باتیں ۔ کیا اب میں وہ حسرت ہی نہیں آپ کے نزدیک

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد ۔ لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم
اے یادِ یار دیکھ کہ باوصفِ رنجِ ہجر ۔ مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو ۔ آخر بچے نہ اس نگہِ بدگماں سے ہم
مایوس بھی تو کرتے نہیں تم زراہِ ناز ۔ تنگ آ گئے ہیں کشمکشِ امتحاں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق ۔ پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں ۔ سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا ۔ کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرسش ہے ضرور ۔ وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں
دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں ۔ آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں
شکوۂ جور تقاضائے کرم عرضِ وفا ۔ تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
نورِ جاں کے لئے کیوں ہو کسی کامل کی تلاش ۔ ہم تری صورتِ زیبا کا تماشا نہ کریں
حال کھل جائے گا بیتابئ دل کا حسرت ۔ بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

دل وحشی کا کسی طرح تقاضا تو مٹے
کیا کریں سر کو جو آمادۂ سودا نہ کریں

سخت رنجور کر دیا ہم کو
دل نے مجبور کر دیا ہم کو

مجھ سے بگڑے ہیں وہ کہ تو نے یہ کیا
سب میں مشہور کر دیا ہم کو

خاکساروں میں اپنے دے کے جگہ
تم نے مغرور کر دیا ہم کو

نار نے عشق یار کی حسرت
سر بسر نور کر دیا ہم کو

آج پھر اُس نے کیا وعدۂ فردا دیکھو
وصل کی بات کا بن بن کے بگڑنا دیکھو

حالِ دل سے تمہیں آگاہ کیے دیتے ہیں
اب کبھی "ہم کو خبر کیا تھی" نہ کہنا دیکھو

رکھئے نہ مجھ پہ ترک محبت کی تہمتیں
جس کا خیال تک بھی نہیں ہے روا مجھے

بیگانۂ ادب کیے دیتی ہے کیا کروں
اُس محو ناز کی نگہ آشنا مجھے

دل اور تہیۂ ترک خیال یار کرے
کسے یقین ہو کون اس پہ اعتبار کرے

قفس میں ہو دل بلبل شہید فرقت گل
خزاں نے جو نہ کیا تھا وہ اب بہار کرے

شب وصال ہے کوتاہ، ناز یار دراز
ہجوم شوق سے کہدو کہ اختصار کرے

فزوں ہیں حد سے ترے جور بے حساب کے داغ
نہ میں شمار کراؤں نہ دل شمار کرے

اُن کو جو شغل ناز سے فرصت نہ ہو سکی
ہم نے یہ کہدیا کہ محبت نہ ہو سکی

خاموشیوں کا راز محبت وہ پا گئے
گو ہم سے عرض حال کی جرأت نہ ہو سکی

ہر بات میں اک شان ہے بے ساختہ پن کی
تصویر ہے تقریر تری حسن سخن کی

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرین و سمن کی — لائی ہے چمن میں انھیں تقدیر چمن کی

شکوۂ غم ترے حضور کیا — ہم نے بے شک بڑا قصور کیا
درد دل کو تری تمنا نے — خوب سرمایۂ سرور کیا
یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے — تم کو خود بیں ہمیں غیور کیا
آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے — نہ کھلے حسن کا غرور کیا

سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
نہ جانا کہ شوق اور بڑھ کے گا میرا — وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم
جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا — تو اک پیکر التجا ہو گئے ہم
دم واپسیں آئے پرسش کو ناحق — بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

حسرت کشاں درد ہیں لب تشنگان عاشقی — سیراب غم کر دے کہیں پیر مغان عاشقی
منظور دلداری رہا لطف نہان دلبراں — مقصود رسوائی رہی شان عیان عاشقی
وہ ہم کہاں وہ دل کہاں البتہ اتنا ہے کہ ہاں — باقی ہے اک سوز نہاں اب تک نشان عاشقی

سعی احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال — اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی
رہ گیا جل کے تری بزم میں پروانہ جو رات — کھنچ گئی شکل مری سوختہ سامانی کی

دے دے کے مفت جان شہیدان عشق نے — اس نازنیں کو شاہد قاتل بنا دیا
شوق لقائے یار نے راہ مراد میں — سختی کو رشک نرمیِ منزل بنا دیا

سب سے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا — اے فریب نگاہ یار یہ کیا؟

اب وہ ملتے بھی ہیں تو یوں کہ کبھی
ہم سے کچھ واسطہ نہ تھا گویا
گلشن حسن یار کی حسرت
جاں فزا کس قدر ہے آب و ہوا

آئی جوان کی یاد مرا دل ٹھہر گیا
دعویٰ غم فراق کا باطل ٹھہر گیا
تیر نگاہ یار کا مشکل ہے سامنا
میرا ہی تھا جگر کہ مقابل ٹھہر گیا
دل خوش ہوا جو آپ ہوئے مائل ستم
یعنی میں التفات کے قابل ٹھہر گیا
اچھا ہوا کہ مملکت حسن و عشق میں
حسرت وہ بادشاہ میں سائل ٹھہر گیا

رہے محو خواب ہوس اہل ظاہر
گزر بھی گیا کاروان محبت
نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی
بیان تمنا زبان محبت
سر عجز حسرت بھی خم کیوں نہ ہوتا
ترا ناز ہے حکمران محبت

چشم رنگین یار کو ہے پسند
سرخی اشک عاشقان کی بہار
صاف اقرار ہے محبت کا
آپ کا التفات سے انکار
دور میں حسن یار کے حسرت
کون ہے رہ سکے گا جو ہشیار

لطف کی ان سے التجا نہ کریں
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
مل رہے گا جو ان سے ملنا ہے
لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں
صبر مشکل ہے آرزو بیکار
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت
اب اہل جنوں فکر گریباں میں لگے ہیں

نامرادوں کو شاد کام کرو — کرم اپنا کبھی تو عام کرو
کار عاشق ہے ناتمام سو تم — قتل کر کے اُسے تمام کرو
عاشقو! ہجر سے ہو بیزار — غم جاناں کا احترام کرو
پوچھتے ہیں وہ جان نثاروں کو — تم بھی حسرتؔ اٹھو سلام کرو

لاکھ اس شوخ جفاکار سے پرہیز کرو — شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سب انگیز کرو
فرق لائے نہ جگر سوزیٔ صہبا میں گلاب — مغبچو تم کو قسم ہے جو کچھ آمیز کرو

بجا ہے دل زار کی ناصبوری — کہاں تک اُٹھائے کوئی رنج دوری
وہ تمہید ہی سے اڑالیں گے مطلب — کہیں شوق نے کی نہ ہو بات پوری
تمنا نے کی خوب نظارہ بازی — مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

نظر اُس رخ پہ ہے ادب کے خلاف — دل ہے اس فیصلے میں سب کے خلاف
آج پر کیا وہ روز کرتے ہیں — بے رخی وعدہ ہائے شب کے خلاف
حسن جاناں کے عہد میں حسرتؔ — شوق ٹھیرا ہے اُو حب کے خلاف

چھپے گی تری دوستداری کہاں تک — کرے گا دل انکار یاری کہاں تک
کہیں رک بھی اے چشم خونبابہ افشاں — کہاں تک تری اشکباری کہاں تک
کرے گی فقیروں سے اے شاہ خوباں — تغافل تری شہریاری کہاں تک
ہمیں حال دل عرض کرنے نہ دے گی — بھلا اُن سے بے اختیاری کہاں تک
تمنا کو اس حد پہ رہنے نہ دے گی — ترے حسن کی بے قراری کہاں تک
کرو سیر دنیائے حیرت بھی حسرتؔ — خردمندی و ہوشیاری کہاں تک

آج تو منہ لب ساغر سے بھرا دے میرا — ساقیا تجھ کو مری سستی پیماں کی قسم
سن کے انکار مرا ہجر میں کیا کیا حسرت — ساغر مے نے دلائی لب جاناں کی قسم

سجدے کئے اس در پہ ایسی عذر سے لاکھوں — ہم عاشق بے خود میں گنہ گار کہاں ہیں
اک بار چلے جاؤ دکھا کر جھلک اپنی — ہم جلوۂ مبہم کے طلب گار کہاں ہیں
شوق ان سے یہ کہتا ہے توجہ نہیں تم کو — عقدے مرے سب سہل ہیں دشوار کہاں ہیں

عشق اب ہے نہ عاشقی کی ہوس — ہم ہیں اور دل سے بیدلی کی ہوس
غنچۂ شوق ہے فسردۂ یاس — مٹ چکی سب شگفتگی کی ہوس
رہ نہ جائے ترے تغافل سے — کہیں جی ہی میں اپنے جی کی ہوس
عشق ہر چند رام حسن رہا — پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس
ہم بھی حاضر ہیں بندگی کے لئے — آپ کو ہو جو صاحبی کی ہوس

حسن جاناں سے یہ کہتی ہے مرا شہرۂ عشق — دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا
فکر کونین سے بیگانہ ہوا تو حسرت — خوب ٹھہرا غم جانانہ سے یارانہ ترا

شوق کہاں آرزوئے شوق ہے — جس سے جہاں مست مئے ذوق ہے
درجہ ترے عشق فسوں کار کا — حسن کے رتبے سے بھی فوق ہے

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
تری آرزو ہے اگر جرم کوئی — تو اس جرم کی میں سزا چاہتا ہوں

گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم میں مگر — آہ وہ نکہت برباد کہ برباد نہیں

بنے وہ رونق محفل جس انجمن میں ہے
رہے بہار چمن ہو کے جس چمن میں ہے

زہے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب
وہ ابتری جو تری زلف پر شکن میں ہے

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی مگر دل میں یا دہن میں ہے

جو فیض عشق یہی ہے تو کیا عجب حسرتؔ
کہ امتیاز نہ کچھ تن و بدن میں رہے

کوئی اٹھ کے بزم جمال سے کب ہوا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی ہوا سے تو بہ ہزار رنج و گراں اٹھا

اثر تغافل یار سے شب انتظار میں و فغاں
ہوئیں سوز غم کی یہ شدتیں کہ دل و جگر سے دھواں اٹھا

یہ عجیب دلکش و جانفزا ترے کوئے حسن کا ماجرا
کہ اثر سے قوت عشق کے میں یہاں بھی اٹھا پر جہاں اٹھا

میں وہ رند بادہ پرست ہوں کہ ہوا جو میکدے میں گذر
بے خبر مقام ادھر سے میں تو ادھر سے پیر مغاں اٹھا

کوئی عشقبازی کا مشغلہ نہیں کھیل مشغلہ مبتلا
مگر اب گیا ہے یہ حوصلہ تو خوشی سے ناز بتاں اٹھا

یہ نوا کہاں یہ جزا ہوئی بخلاف خواہش مدعی
پئے قتل حسرتؔ ملتجی جو اگر وہ جان بہ جاں اٹھا

تری یاد بے اختیار آ رہی ہے
تمنا کی فصل بہار آ رہی ہے

اس نے ہم سے سنی نہ شوق کی بات
ہنس کے پوچھا کسی زبان میں ہے

حسن تیرا بہ امتزاج وفا
اک نمونہ تھا بے مثالی کا

مہرباں ہو کے پاس کچھ تو کرو
سب حسرتؔ کی بے سوالی کا

بیتاب نظر آیا بدنام نظر آیا
عاشق جو نظر آیا ناکام نظر آیا

اے آہ دل عاشق دیکھیں تری تاثیریں
پہلے سے بھی وہ بڑھ کر خود کام نظر آیا

سکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ نوجوانی نے
مرے دست تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے

جمال یار میں ہر دم ترقی ہوتی رہتی ہے — دل حیراں کی حسرت سے سوز حیرت بڑھتی جاتی ہے

چھیڑا ہے دست شوق نے مجھ سے خفا ہیں وہ — گویا کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار ہے
شاید جہاں سے حسرت دیوانہ چل بسا — ہاں، ہاں جبھی تو چشم جنوں اشکبار ہے

کرتی ہے دل کو اور بھی آمادۂ ہوس — تیری یہ بے رخی یہ ادا اجتناب کی
کچھ ان کو قدر شوق نہیں ورنہ آرزو — امیدوار بھی کرم بے حساب کی

قیمت مے کہ یہ پیمانۂ جاں ہے ساقی — کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے ساقی
تو نے رکھ دی تھی جہاں چھین کے ہم سے بوتل — روح مستی اسی جانب نگراں ہے ساقی
محتسب کی نہ سنی ہے نہ سنے گا حسرت — کہ وہ مے خوار ترا مرتبہ داں ہے ساقی

حسرت وہ سن رہے ہیں جو اہل وفا کا حال
اس میں بھی کچھ فریب تری داستاں کے ہیں

شوق کو جرم سے بری نہ کیا — تم نے کچھ پاس دلبری نہ کیا
خام تھی اپنی بندگی کہ انھیں — مائل بندہ پروری نہ کیا
زہد کو ہم نے گو حق نے اسے — سرفراز قلندری نہ کیا
عشق صادق نے حسن کامل سے — نہ سنا ذکر برتری نہ کیا
شکوہ سنج اُن سے کیوں ہوئے حسرت — احترام ستمگری نہ کیا

جگر مرادآبادی

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا
ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا
جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبط حسن و عشق — شوق نارسا اپنا، ناز کامیاب ان کا
رنگ و بو کے پردے میں کون چھوٹ نکلے ہے — چھپ سکا چھپائے سے کیا کہیں شباب ان کا
عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ نکتہ نہیں ہستی — ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا
تو جگر جو رسوا ہے تو ہی آہ رسوا رہ — نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب ان کا

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر — نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر
مجھی میں رہے، مجھ سے مستور ہو کر — بہت پاس نکلے، بہت دور ہو کر
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں — کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

اب ان کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں — آ، اے غم محبت تجھ کو گلے لگائیں
اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں — کر جائیں کام اپنا، لیکن نظر نہ آئیں
ال حسن برق وش کے دل سوختہ یہی ہیں — شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں
عاشق، خراب ہستی، زاہد خراب تمکیں — وہ بھی ترے کرشمے یہ بھی تری ادائیں
اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی! — اب دست شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں
آلودہ خاک ہی میں رہنے دے اس کو ناصح — دامن اگر جھٹک دوں جلوے کہاں سمائیں
اشعار بن کے نکلیں جو سینۂ جگر سے — سب، حسن یار کی تھیں بے ساختہ ادائیں

کرم کوشیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں — بس، اک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں
نہ بے ہوشیاں اب نہ ہشیاریاں ہیں — محبت کی، تنہا فسوں کاریاں ہیں
تجلی سے کہہ دو، ذرا ہاتھ روکے — بہت عام اب دل کی بیماریاں ہیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں — ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں
یہ نازِ حسن تو دیکھو، کہ دل کو تڑپا کر — نظر ملاتے نہیں، مسکرائے جاتے ہیں
میں اپنی آہ کے صدقے، کہ میری آہ میں بھی — تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

غنی ہے عمر بہ عشق کے مے خانے میں — اے اجل! تو بھی سما جا مرے پیمانے میں
ہم نہیں آتے ہیں، اے جذبہ ترے بہکانے میں — اسی میخانے کی مٹی، اسی مے خانے میں

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں — جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
میری ہستی شوقِ پیہم، میری فطرت اضطراب — کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں
میری خاطر اب وہ تکلیفِ تجلی کیوں کریں — اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں
دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا — وہ جفا کرتے ہیں مجھ پر اور شرماتا ہوں میں
ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر — ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

الٰہی ایک دعا ہے! اگر قبول نہ ہو — بہت غریب یہ دل ہے، کبھی ملول نہ ہو
مجھے بھی شاق نہ ہو، شوق بھی ملول نہ ہو — نظر قبول ہوئی ہے، اثر قبول نہ ہو
کوئی گناہ نہیں، شوقِ دید و ذوقِ نظر — مگر جو فرصتِ نظارگی کو طول نہ ہو

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں، وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

تری چشم مست کو کیا کہوں، کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش، یہ سب جنوں، اسی ایک گردش جام سے
یہ کتاب دل کی ہیں آیتیں، میں بتاؤں کیا، جو ہیں نسبتیں
مرے سجدہ ہائے دوام کو، ترے نقش ہائے خرام سے
وہیں چشم حور پھڑک گئی، ابھی پی نہ تھی کہ بہک گئی
کبھی یک بہ یک جو چھلک گئی، کسی رند مست کے جام سے

ملا کے آنکھ نہ محروم ناز رہنے دے
تجھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے
میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر
یہ چشم مست ابھی نیم باز رہنے دے
گلے سے تیغ ادا کو جدا نہ کر قاتل!
ابھی یہ منظر راز و نیاز رہنے دے
یہ تیر ناز ہیں، تو شوق سے چلائے جا
خیال خاطر اہل نیاز رہنے دے
بجھا نہ آتش پنہاں کرم کے چھینٹوں سے
دل جگر کو مجسم گداز رہنے دے

مجھے ہلاک فریب مجاز رہنے دے
نہ چھیڑ اے نگہ امتیاز، رہنے دے
میں راز عشق کو بیگانۂ جہاں رکھوں
مگر، جو مصلحت حسن راز رہنے دے
یہ بات کیا، کہ حقیقت وہی مجاز وہی
مجاز ہے تو پھر اس کو مجاز رہنے دے
یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا اے زاہد!
یہ میکدہ ہے، یہاں احتراز رہنے دے
گذر رہی ہے جو دل عشق پر نہ پوچھ جگر
یہ خاص راز محبت ہے راز رہنے دے

جلال بھی، ماورائے حال بھی ہے
عشق، ممکن بھی ہے محال بھی ہے
دل کے ہر اضطراب نازک میں
شان بے تابیٔ جمال بھی ہے
چھائے جاتے ہیں درد دل بن کر
اس پہ تاکید ضبط حال بھی ہے
حسن کے ہر جمال میں پنہاں
میری رعنائی خیال بھی ہے

آئے مرے مقابل جس کو ہو زعم تمکیں — تصویر کھینچتا ہوں اک حسن شعلہ خو کی
عین شکستگی ہی، حسن شکستگی ہے — چاک قبائے گل کو حاجت نہیں رفو کی

رعنائی خیال کو رسوا نہ کیجیے — ممکن بھی ہو، تو عرض تمنا نہ کیجیے
ہر جلوہ ہے بجائے خود اک دعوت نگاہ — کیا کیجیے، جو تیری تمنا نہ کیجیے

یہ کیا مجال کہ ہم ترک التجا کرتے — دہن کو سی بھی جو لیتے، نظر کو کیا کرتے
نماز عشق یہاں ہے نفس نفس جاری — کبھی ادا ہی نہ ہوتی، اگر قضا کرتے

میں گنہ گار جنوں میں نے یہ مانا، لیکن — کچھ اُدھر سے بھی تقاضائے نظر ہوتا ہے
کون دیکھے اُسے بیتاب محبت اے دل! — تو وہ نالے ہی نہ کر، جن میں اثر ہوتا ہے

تصور میں ہے کچھ ایسا تری تصویر کا عالم — کہ جیسے اب لب نازک سے کچھ ارشاد ہوتا ہے
کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی — سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

یہ راز سن رہے ہیں اک موج تہ نشیں سے — ڈوبے ہیں ہم جہاں پر ابھریں گے پھر وہیں سے
خون وفائے بسمل جرم نگاہ قاتل — ظاہر تو ہر جگہ ہے ثابت نہیں کہیں سے

اے حسن! اپنی حوصلہ افزائیاں تو دیکھ — مانا کہ چشم شوق بہت بے حجاب ہے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج — دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہیں ہے — سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جو ننگ جبیں ہے
جس رنگ میں دیکھو اُسے وہ پردہ نشیں ہے — اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے

مجھ سے کوئی پوچھے ترے ملنے کی ادائیں
دنیا تو یہ کہتی ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے
ہر لحظہ نیا جلوہ نئی آن، نئی شان
میری نگہِ شوق بھی کیا عرضِ حسیں ہے

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشق لامحدود
مجھے حریف مقابل بنا دیا تو نے
جمالِ حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے
ہزار دل کو مٹا کر دیا مجھے اک درد
اُس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے
خوشا وہ دردِ محبت، زہے وہ دل کہ جسے
ذرا سکون ہوا، گدگدا دیا تو نے

وہ کافر آشنا، ناآشنا، یوں بھی ہے اور یوں بھی
ہماری ابتدا تا انتہا، یوں بھی ہے اور یوں بھی
تعجب کیا؟ اگر رسمِ وفا یوں بھی ہے اور یوں بھی
کہ حسن و عشق کا ہر مسئلہ یوں بھی ہے اور یوں بھی
لگا دے آگ، او برقِ تجلی! دیکھتی کیا ہے
نگاہِ شوق، ظالم، نارسا یوں بھی ہے اور یوں بھی
الٰہی کس طرح عقل و جنوں کو ایک جا کر لوں
کہ نشائے نگاہِ عشوہ زا یوں بھی ہے اور یوں بھی

ترے جمالِ حقیقت کی تاب ہی نہ ہوئی
ہزار بار نگہ کی مگر کبھی نہ ہوئی
ہم اپنی رندی و طاعت پہ خاک ناز کریں
قبولِ حضرتِ سلطاں ہوئی ہوئی نہ ہوئی
تمام حرف و حکایت، تمام دیدہ و دل
اس اہتمام پہ بھی شرحِ عاشقی نہ ہوئی
صبا! یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

آئے زباں پہ راز محبت محال ہے
تم سے مجھے عزیز، تمہارا خیال ہے

دل تھا ترے خیال سے پہلے چمن چمن — اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

ایمان و کفر اور نہ دنیا و دیں رہے — اے عشق! شاد باش کہ تنہا ہمیں رہے
اللہ ری چشمِ یار کی معجز بیانیاں — ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
اس عشق کی تلافیٔ مافات دیکھنا — رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

عشق کا راز جنونِ عشق کی حد ہی میں ہے — دل گیا ہے تو گریباں نہ جانے پائے
داستانِ غمِ ہستی کو مکمل کر لے — ایک بھی عشق کا عنوان نہ جانے پائے
حسن سرگرمِ نوازش ہے مگر اے غمِ دل — رائگاں عشق کا احساں نہ جانے پائے

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
ہم عشق مجسم ہیں لب تشنہ و مستسقی — دریا سے طلب کیسی؟ دریا کو رلانا ہے
آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن — بندھ جائے سو موتی ہے رہ جائے تو دانا ہے

ادا جو آئے، وہ بے عیب و بے قصور آئے — خدا وہ دن نہ کرے، آپ کو غرور آئے
الٰہی! جذبِ محبت کی بخش دے تقصیر — وہ آج دست بہ دل سخت ناصبور آئے
مری طرف سے بھی اے کاروانِ شوق سلام — کہیں جو راہِ طلب میں مقامِ طور آئے

کرے نہ کام جو بلبل کا نالۂ خونیں
نہ غنچے نیند سے چونکیں نہ رنگ و بو آئے

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر — لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی
ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل — رائگاں سعیٔ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — ایک مسیحا نفس کی بات گئی

نقابِ رُوئے نادیدہ کا از خود دور ہو جانا — مبارک اپنے ہاتھوں حسن کو مجبور ہو جانا
محبت کیا ہے؟ تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں — ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

بہار لالہ و گل، شوخیٔ برق و شرر ہو کر — وہ آئے سامنے، لیکن حجاباتِ نظر ہو کر
بھرم کھونا کہیں اے دل! نہ عشقِ معتبر ہو کر — گزر جا، ہاں گزر جا جس سے بھی بے خبر ہو کر
حجاب اندر حجاب و جلوہ اندر جلوہ کیا کہیے — بلا میں پھنس گئے عشاق پابندِ نظر ہو کر
کہاں جاتی ہے بل کھا کر او نگاہِ نازِ بے پروا — مرے پہلو میں رہ جا لذتِ دردِ جگر ہو کر

دل کو کسی کا تابعِ فرماں بنائیے — دشواریٔ حیات کو آسان بنائیے
درماں کو درد، درد کو درماں بنائیے — جس طرح چاہیے، مجھے حیراں بنائیے
آباد اگر نہ دل ہو، تو برباد کیجیے — گلشن نہ بن سکے، تو بیاباں بنائیے

پھر عشقِ جنوں پیشہ، لو سلسلہ جنباں ہے — راہیں بھی گریزاں ہیں، منزل بھی گریزاں ہے
صدقے ترے ہونٹوں کی رنگینی و رعنائی — اک موجِ تبسم میں کل رازِ گلستاں ہے
اللہ تجھے رکھے محفوظ حوادث سے — اے کفر! ترے دم تک آرائشِ ایماں ہے

ہر ذرے کے پیکر میں اک روحِ وفا ڈالی — اپنی ہی سی کل دنیا عاشق نے بنا ڈالی
ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے، — رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی

نظر صیاد کی کیا؟ برق بھی ہو تو لرز اٹھے — ابھی آیا نہیں تنکوں کو جانِ آشیاں ہونا
تماشا دیدنی ہے دیکھ لیں اہلِ نظر آ کر — مرے ہمراہ منزل کا بھی گردِ کارواں ہونا

سنا ہے ہر حرف لیتے ہیں جلوے حسن صورت کے — کبھی تم بھی جگر! آوارۂ کوئے بتاں ہوتا

چھوڑا نہ راز کوئی جہان خراب کا — سب کہہ گیا ہیں خواب میں افسانہ خواب کا
بگڑا ہوا ہے رنگ جہان خراب کا — بھر لوں نظر میں حسن کسی کے شباب کا

عشق کیا چیز ہے؟ اک حشر در آغوش خیال
حسن کیا؟ خواب ہے اک چشم تماشائی کا

اثر ہے جس میں کہ ہر موج کار فرما کا — وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا

رنگینیٔ الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر — اے دل! وہی تو جلوے سرمایۂ نظر ہیں
آساں نہیں گزرنا صحرائے بے خودی ہے — ہشیار اہل تمکیں! رستے یہ پُر خطر ہیں

سمجھائے کون؟ بلبل غفلت شعار کو — محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو
عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے آہ — کیا منہ دکھاؤں رحمت پروردگار کو
بھڑکا رہا ہوں آتش عصیاں ہر اک گھڑی — پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

میکشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قید مکاں — آج اک موج بہا لے گئی مے خانے کو
غیر از دوست نہ تھا ہستیٔ عاشق کا وجود — کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

گوش مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ — سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

ان کی نگاہ لطف ہے اور کشف راز دلبری — میری نگاہ شوق ہے اور داستان عاشقی

آؤ جہاں برہم کریں، پیدا نیا عالم کریں
تم جانِ جانِ حسن ہو، ہم جانِ جانِ عاشقی

دیدۂ شفق سی ہوئیں آج وہ گل فشانیاں
ڈوب گئی بہار میں سادگیٔ لباسِ حسن

ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش
شامل کسی کا خون تمنا ضرور تھا

جوش وہ رنگینیوں کا ان کے پیکاں میں نہیں
کیا کوئی قطرہ لہو کا اب رگِ جاں میں نہیں
فیضِ سوزِ عشق سے اے دل سراپا داغ ہوں
جو بہار اب مجھ میں ہے سارے گلستاں میں نہیں

علاج کاوشِ غم خاک چارہ جو کرتے
ہزار زخم تھے کس کس جگہ رفو کرتے
بیان ہو نہ سکی ابتدا محبت کی
تمام عمر ہوئی شرحِ آرزو کرتے

اصغر گونڈوی

ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری
تمام شورش و تسکین نثارِ بے خبری
جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری
غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک کرنے کو
تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری
اُس آستاں سے اٹھائی نہ پھر جبیں میں نے
حرم میں سجدۂ پیہم تھی ایک دردسری

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم
اک رقص میں ہر ذرۂ صحرا نظر آیا
تھا لطفِ جنوں دیدۂ خونناب فشاں سے
پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

خوب تھا صحرا پر اے ذوقِ جنوں
پھاڑنے کو نت نئے دامن کہاں

شوق سے ہے ہر رگِ جاں جست میں — لے اڑے گی لجئے پیراہن کہاں

عشق ہی سعی مری عشق ہی حاصل میرا — یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا
اور آ جائے نہ زندانیٔ وحشت کوئی — ہے جنوں خیز بہت شورِ سلاسل میرا
داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگین لیکن — اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

مستی میں فروغِ رخِ جاناں نہیں دیکھا — سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا
زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا — رخ پر تیری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُرآشوب — فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم — کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
حقیقت کھول دیتا میں جنوں کے رازِ پنہاں کی — قسم دے دی ہے لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی

تپش جو شوق میں تھی وصل میں بھی ہے وہی مجھ کو
چمن میں بھی وہی اک آگ ہے جو تھی نشیمن میں
مری وحشت پہ بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح!
بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

عشوؤں کی ہے نہ اس نگہ فتنہ زا کی ہے — ساری خطا مرے دلِ شورش ادا کی ہے
مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے — کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے
کھلتے ہی پھول باغ میں پژمردہ ہو چلے — جنبشِ رگِ بہار میں موجِ فنا کی ہے

ہم خستگانِ راہ کو راحت کہاں نصیب
آواز کارواں میں ابھی بانگِ درا کی ہے
ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو ہی زبان مرے مدعا کی ہے
لطفِ نہانِ یار کا مشکل ہے امتیاز
رنگت چڑھی ہوئی ستمِ برملا کی ہے

جلوۂ رنگیں اُتر آیا نگاہِ شوق میں
ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے
بلبل و گل میں جو گذری ہم کو اس سے کیا غرض
ہم تو گلشن میں فقط رنگِ چمن دیکھا کئے
دوڑتے پھرتے تھے جلوے اُن کے موجِ نور میں
دور سے ہم رازِ شمعِ انجمن دیکھا کئے

ہر اک جگہ تری برقِ نگاہ دوڑ گئی
غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو
یہ دیکھتا ہوں ترے زیرِ لب تبسم کو
کہ بحرِ حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو
ذرا سے پردۂ محمل کی کیا حقیقت تھی
غبارِ قیس کہیں خود ہی پردہ دار نہ ہو

مستی سے ترا جلوہ خود غرضِ تماشا ہے
آشفتہ مزاجوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا
ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے
ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے
سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی
مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطراب دل معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخ آشیاں رکھدی

موج نسیم صبح کے قربان جائیے
آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے
کیا مستیاں چمن میں ہیں جوش بہار سے
ہر شاخ گل ہے ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے
میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

نہ یہ شیشہ نہ یہ ساغر نہ یہ پیمانہ بنے
جان میخانہ تری نرگس مستانہ بنے
پرتو رخ کے کرشمے تھے سر راہ گذر
ذرے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ بنے
کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے
رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

گم کر دیا ہے دید نے یوں سربسر مجھے
ملتی ہے اب انھیں سے کچھ اپنی خبر مجھے
ایسا کہ بتکدے کا جسے راز ہو سپرد
اہل حرم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے
مست شباب وہ ہیں میں سرشار عشق ہوں
میری خبر انہیں ہے نہ انکی خبر مجھے
جب اصل اس مجاز و حقیقت کی ایک ہے
پھر کیوں پھرا رہے ہیں ادھر سے ادھر مجھے

سرشک شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز
اچھالتا تھا کہ اک بحر بے کنار ہوا
بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بیخود نہ ہوشیار ہوا
لئے پھری نگہ شوق سارے عالم میں
شدید جلوۂ حسن آج بے قرار ہوا
مری نگاہوں نے جھک جھک کے کرلئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

ذوق سرمستی کو محو روئے جاناں کر دیا
کفر کو اس طرح چمکایا کہ ایماں کر دیا
کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطراب شوق میں
اُن کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا

شورشِ دل جو وہ ہوتی تھی بدستور آج
نہیں معلوم وہ نزدیک ہے یا دوری آج

فصلِ گل، جوشِ نمو، طلعتِ زیبائے بہار
عرضِ دیدار پہ یک جلوۂ مستور ہے آج

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں
خون میں گرمیٔ ہنگامۂ منصور ہے آج

جس سے کل تک دلِ بیتاب بھٹکا جاتا تھا
اسی شعلہ کو جو دیکھا تو سرِ طور ہے آج

آنکھوں میں تیری بزم تماشا لئے ہوئے
جنت میں بھی ہوں جنتِ دنیا لئے ہوئے

پاسِ ادب میں جوشِ تمنا لئے ہوئے
میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے

ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار
فتنہ طرازیٔ قدِ رعنا لئے ہوئے

تو برقِ حسن اور تجلی سے یہ گریز
میں خاک اور ذوقِ تماشا لئے ہوئے

افتادگانِ عشق نے سر اب تو رکھ دیا
اٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار
روتے ہیں منہ پہ دامنِ صحرا لئے ہوئے

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

کیا کرے زاہدِ بیچارہ اسے کیا معلوم
رحم کرتا ہے بہ اندازۂ عصیاں کوئی

پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اس کے سوا
اے خوشا درد کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے

حسرتِ ناکام میری کام سے غافل نہیں
اک طریقِ جستجو یہ دردِ مہجوری بھی ہے

میں تو ان مجبوریوں پر بھی سراپا دید ہوں
اس کے جلوے کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے

میری محرومی کے اندر سے یہ دی کس نے صدا
قرب کی راہوں میں میری آہ اک دوری بھی ہے

لذتِ سجدہ ہائے شوق نہ پوچھ
ہائے وہ اتصالِ ناز و نیاز

دیکھ رعنائیٔ حقیقت کو
عشق نے بھر دیا ہے رنگِ مجاز

آہوں نے میری خرمن ہستی جلا دیا — کیا منہ دکھاؤں گا تری برق نظر کو میں
نیرنگیٔ جمال کے قربان جائیے — حیراں ہوں تجھ کو دیکھ کے اپنی نظر کو میں

میرے مذاق شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ — میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویر یار کو
اس جوئبار حسن سے سیراب ہے فضا — روکو نہ اپنی لغزش مستانہ وار کو
تھی بوئے دوست موج نسیم سحر کے ساتھ — یہ اور لے اڑی مرے مشت غبار کو

نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم — بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم
ہجوم شوق میں اب کیا کہوں میں کیا نہ کہوں — مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مدعا معلوم
جبین شوق کی شوریدگی کو کیا کہیے — وگرنہ عشوہ طرازی نقش پا معلوم

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے — پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے
گرنا وہ جھوم جھوم کے رندان مست کا — پھر پائے خم پہ سجدۂ شکرانہ دیکھتے
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں — تم پھاڑ کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

شاید کہ پیام آیا پھر وادیٔ سینا سے — شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوت مینا سے
اسرار حقیقت کو اک اک سے پوچھا ہے — ہر نغمۂ رنگیں سے ہر شاہد زیبا سے
رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی — لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تمنا سے
وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں — سو حسن کروں پیدا اک ایک تمنا سے

دہن سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں — جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی — جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں
فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں
اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبتِ روحانیاں نہیں

کیا فیض بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی
ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی
طاقت کہاں مشاہدۂ بے حجاب کی
مجھ کو تو پھونک دے گی تجلی نقاب کی
تھی ہر عمل میں دعوئ ہستی کی معصیت
مستوں نے اور راہ نکالی ثواب کی

یہ عشق نے دیکھا ہے، یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرہ میں سمندر ہے، ذرہ میں بیاباں ہے
ہے عشق کی شورش سے رعنائی و زیبائی
جو خون اچھلتا ہے وہ رنگِ گلستاں ہے
اے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

نیرنگِ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے
آنکھوں سے اگر دیکھو پردا نظر آتا ہے
اے پردہ نشیں ضد ہے کیا چشمِ تمنا کو
تو دفترِ گل میں بھی رسوا نظر آتا ہے
احساس میں پیدا ہے پھر رنگِ گلستانی
پھر داغ کوئی دل میں تازہ نظر آتا ہے

جانِ نشاطِ حسن کی دنیا کہیں جسے
جنت ہے ایک، خونِ تمنا کہیں جسے
اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف
ایسا حجابِ چشمِ تماشا کہیں جسے
ہر موج کی وہ شان ہے جامِ شراب میں
برقِ فضائے وادئ سینا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرمِ روِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے، دنیا کہیں جسے
میری فغانِ درد پہ اس غمزہ و ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں
اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے
اصغرؔ نہ کھونا کسی حکمت مآب پر
رازِ حیات، ساغر و مینا کہیں جسے

خستگی نے کر دیا اسکو رگِ جاں سے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی تھی منزل دور ہے

فریب دام گہ رنگ و بو معاذ اللہ
یہ اہتمام ہے اور ایک مشت پر کے لئے
حقیقت ایک ہے صدہا لباس رنگیں میں
نظر بھی چاہیئے کچھ حسن رہگذر کے لئے
بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے
وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے
بتوں کے حسن میں بھی شان ہے خدائی کی
ہزار عذر ہیں اک لذت نظر کے لئے

چھیڑتی ہے کس لگاوٹ سے نگاہ شوق کو
خود بہت باکیف تیری جلوہ گاہ ناز ہے

اقبال

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عذر پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوش انجام ابھی
خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

پردہ چہرہ سے اٹھا انجمن آرائی کر
چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کیسی؟
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
نفس گرم کی تاثیر ہے انعام حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبال — کوئی دن اور بھی بادیہ پیمائی کر

نہ دام بھی غزل آشنا رہے طائران چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی
ترا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دل ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا وہی آہ نیم شبی رہی

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ — کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا — فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے — بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لیے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو — آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں — جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی — نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بیگانگی اچھی رفیق راہ منزل سے — ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

وہ مے کش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں — ہوائے گل فراق ساقی نامہرباں تک ہے
چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل — یہاں کی زندگی پابندی رسم فغاں تک ہے

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

———— • ————

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و رندی میں امتیاز کرے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

———— • ————

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

———— • ————

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منت تاک

———— • ————

تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

———— • ————

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

———— • ————

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

میں خود نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہے اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

•

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

فراق گورکھپوری

جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

•

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
ہائے اب مجھ سے تجھے رنجشِ بیجا بھی نہیں
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
اور دلِ ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

•

وہ ماجرائے عشق بھی خواب و خیال ہے
تیری نگاہ سے جو ہوا تھا بیاں کبھی
سر بھی انھیں ملا در و دیوار بھی مگر
کم ہو سکی نہ وحشتِ زندانیاں کبھی

•

مدتیں قید میں گزریں مگر اب تک صیاد
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں
کیا کہیں وہ ترے اقرار کہ اقرار سے تھے
کیا کریں یہ ترے انکار کہ انکار سے ہیں

•

تجھ کو اے موجِ صبا شوخیِ پیہم کی قسم
اس طرح چھیڑ کہ ہر گل کو گلستاں کر دے
زندگی تیرے تغافل نے بنا دی مشکل
اب اسے اے نگہِ یار کچھ آساں کر دے

•

جنھیں ہے ناز بہت اپنے ظرف پر ساقی
تری نگاہ سے انداز ان کے پائے گئے

یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی | چراغ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے
خراب اور نہ کر اب خراب حالوں کو | ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے
خبر یہ ہے کہ سرِ حشر بھی نہیں چوکے | تری نگاہِ کرم کے فریب کھائے ہوئے

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم | جو تیرے ہجر میں گذری وہ رات رات ہوئی
دیارِ دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں | حریمِ عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

ابھی تو بلبلیں آسودۂ نشیمن ہیں | گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال بچھاؤ
نہ عشق ہی کو خبر ہے نہ حسن ہی جانے | کسی سے عالمِ مستی میں اس طرح کھل جاؤ
نہ پوچھ الجھی ہوئی گتھیاں محبت کی | نہ پوچھ حسن کی باتوں میں کتنا ہے سلجھاؤ
تڑپ کو ہم نے بنایا سکون بے پایاں | ہماری دکھ بھری لے میں ہے کس قدر ٹھہراؤ

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں | دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں | وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا
دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا | دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے | نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں | گو درِ خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے
عالمِ حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے | بھولیں اگر تو یاد آئے یاد کریں تو بھول جائے
گو ہمہ تن وہ جبر ہے کہتی ہیں یہ مشیتیں | ہم سے بھی کچھ نہ بن پڑے عشق جو اپنی ضد پہ آئے
کشتیِ دل بچائیے اتنا مگر رہے خیال | ڈوبے اگر تو پار ہو پار لگے تو ڈوب جائے

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں — جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

•

نگاہ یار خبر تھی نہ تیرے وعدوں کی — جو تو نے یاد دلایا تو مجھ کو یاد آیا

•

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا — اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے بیگانہ

•

حسن اور عشق میں پیمان وفا ہوتا ہے — ذرے ذرے سے تلاطم سا بپا ہوتا ہے

•

کہہ گئی کیا نگۂ ناز تری ہم جیس کو — بات کی بات فسانے کا فسانہ سمجھے
ایسے دیوانے کا دنیا میں ٹھکانا ہی کہیں — لوگ اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

•

کچھ بڑھ گئی وحشت اور مری زنداں سے رہائی پاتے ہی
کچھ حسرت صحرا بھی ہے، کچھ رنج در و دیوار بھی ہے
امید نہ دے پرسش بھی کر، دے اور فریب حسن کوئی
مایوسیوں کا خوش ہو جانا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
دن رات شگوفے کھلتے ہیں دن رات بہاریں لٹتی ہیں
تدبیر جنوں، تقدیر چمن، ایام کی کچھ رفتار بھی ہے
اک تار نگاہ کی جنبش سے نشہ عشق کو دیتی ہے کیا کیا
وہ آنکھ جو مائل صلح بھی ہے آمادۂ پیکار بھی ہے
رہ رہ کے خلش بھی ہوتی ہے کچھ کشمکش دل بھی کم ہے
سنتے ہیں فراق وہ تیر نظر دل میں بھی ہے دل کے پار بھی ہے

•

آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے مل کے ایک — تو نے وہ عالم نگاہ ناز کا دیکھا نہیں
لے اڑی تجھ کو نگاہ شوق کیا جانے کہاں — تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

نہ پوچھ عرصۂ ہستی کی وسعت و تنگی — جو چل پڑے تو بیاباں، رکے تو زنداں ہے
بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی — رگ جنوں ہے، رگ گل ہے، یا رگ جاں ہے

یہ بزم عام بھی اے دوست! بزم عام نہیں — نگاہیں اٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لئے

ماتھے پہ ترے صبح چمن کھیل رہی ہے — آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے
ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم کہ ہوا سے — وہ زلف شکن زیر شکن کھیل رہی ہے
پیراہن خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی — ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
اس پیکر رنگین میں ہے شوخیٔ پنہاں — بجلی تہ دامان چمن کھیل رہی ہے
باتوں میں فراق اس کی معطر ہے سماعت — ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

دیکھ لیتے ہیں سبھی کچھ ترے مشتاق جمال — انھیں دیدار نہ ہو حسرت دیدار تو ہے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تو نے تو خیر بے وفائی کی

چپ ہو گئے تیرے رونے والے — دنیا کا خیال آ گیا ہے

جوش ملیح آبادی

محفل عشق میں وہ نازش دوراں آیا — اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
لے کلی! ناز سے کھل، بادہ سر جوش اُبل — کہ نگار چمن و شاہد مستاں آیا
خاطر جمع سے ہشیار کہ برہم ہوئی زلف — کشتی دل سے خبردار کہ طوفاں آیا
کج کلاہی کا سرو برگ مبارک اے جوش — لے، پیام شکن طرۂ جاناں آیا

• — •

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا — چراغ مجلس روحانیاں جلاتا جا
نگاہ مہر سے اے آفتاب عالم پاک — حقیر خاک کے ذروں کو جگمگاتا جا
ملا کے مجھ سے نظر، عزت جنوں کی قسم — چراغ محفل عقل و خرد بجھاتا جا
اسیر کر کے سیہ کاکلوں کے حلقے میں — کمند عقل تنک مایہ سے چھڑاتا جا
اٹھا کے عارض گلگوں سے دو گھڑی نقاب — نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا
مزاج پوچھ کے اے شاہ عارض و کاکل — گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

• — •

چلا ہے سوئے حرم دل سے ساز کرتا جا — طواف کعبۂ حسن مجاز کرتا جا
ملے جو وقت تو اے رہرو رہ اکسیر — حقیر خاک سے بھی ساز باز کرتا جا

• — •

ادھر بھی باد صبا! آ بہار کی سوگند — شمیم طرۂ گیسوئے یار کی سوگند
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور — جفائے طول شب انتظار کی سوگند
ٹھہر ٹھہر کے سنا داستان عشوہ و ناز — نزاکت دل امیدوار کی سوگند
سنا دے جوش کو بھی نغمہائے لعل نگار — خروش آمد فصل بہار کی سوگند

سخن فروشیاں نہ کر جہانِ حسن و عشق میں
کہ یاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ دانیاں
وہ زیبِ انجمن ہوا تو کوئی بولتا نہیں
معاشرانِ بزم کیا ہوئیں وہ گل فشانیاں
شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں
ندیم! عہدِ شوق کی سنائے جا کہانیاں

اللہ رے حسنِ دوست کی آئینہ داریاں
اہلِ نظر کو نقش بہ دیوار کر دیا
مجھکو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں
میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

پہچان گیا سیلاب ہے اس کے سینے میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے، جی چھوٹ گیا طوفانوں کا
یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنیٰ ذرے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا
دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقایق کی تلخی
اور ہم نے حقایق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

مرا پیرہن نہیں چاک ابھی، مجھے رحم کھا کے سنگھا بھی دے
یہ مہک جنوں کی بھری ہوئی ہے جو تیری زلفِ دراز میں
یہ دعا کا رنگ شکستہ ہے، مری حسرتوں کا یہ خون ہے
یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسمِ ناز میں

اے شوق مجھے گمراہ نہ کر، شورش کے لئے اسباب نہیں
امید کہ اجڑے گلشن میں اک پھول بھی اب شاداب نہیں
اب دل کا سفینہ کیا ابھرے، طوفاں کی ہوائیں ساکن ہیں
اب بحر سے کشتی کیا کھیلے، موجوں میں کوئی گرداب نہیں

سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی

برق کا گرنا سنا، صیاد کا کہنا سنو — چار تنکوں کا اجڑنا داستاں ہوتا نہیں
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ اس کے عشق کا — مر گیا ہوں اور مرنے کا گماں ہوتا نہیں

جاتے ہی ان کے گویا کچھ بھی نہ تھا چمن میں — جوش بہار گل کو پامال کر گئے ہیں

وعدے کا ذکر، وصل کا ایما، وفا کا قول — یہ سب فریب ہیں دل شیدا کے واسطے
اے ضبط گریہ خاک میں مل جائے کاش تو — آنکھیں ترس گئیں مری دریا کے واسطے
وحشت یہ کہہ رہی ہے دل داغدار کی — اس باغ کی بہار ہے صحرا کے واسطے

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہاراں کی
بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

درد دل میں کمی نہ ہو جائے — دوستی دشمنی نہ ہو جائے
اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں — عاشقی بندگی نہ ہو جائے
بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں — کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے   آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

چل گیا اس نگاہ کا جادو   کہہ گئے دل کی بات کیا کہیئے

آرزو لکھنوی

جو سینے میں دل ہے تو بار محبت   اُٹھے یا نہ اُٹھے اٹھانا پڑے گا

رہتے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

لطف بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار   دل کیا اجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا

ہادی مچھلی شہری

درد سا اُٹھ کے نہ رہ جائے کہیں دل کے قریب
میری کشتی نہ کہیں غرق ہو ساحل کے قریب

معین احسن جذبی

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبی خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

سوالِ شوق پہ کچھ اُن کو اجتناب سا ہے جواب یہ تو نہیں ہے مگر جواب سا ہے

مرنے کی تمنا کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

مرزا یگانہ لکھنوی

سمجھتے کیا تھے؟ مگر سنتے تھے ترانۂ درد سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ کہ مجھکو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا
پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ اشارہ چاہیے ہے جنبشِ سلاسل کا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا
جواب حسن طلب ہے دلوں سے بن نہ پڑا حیا سے گڑ گئے جب نام آگیا دل کا

تڑپ کے آبلہ پا اُٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

زنجیر پھر ہلا دی نسیم بہار نے پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہوگیا
کیا جانے آج خواب میں کیا دیکھا اس نے کیوں چونکتے ہی آپ سے بیگانہ ہوگیا

دل آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا عقل گمراہ نے دیوانہ بنانا چاہا
ناگہاں چرخ ستم گار نے کروٹ بدلی بخت بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا
جذبۂ شوق نے جب عشق کی صورت بدلی پھر مٹائے نہ مٹا لاکھ مٹانا چاہا

وحشیو! کیوں تنگدل ہو فصل گل آنے تو دو غنچہ غنچہ میں بہار صد گریباں دیکھنا

یہ دل بے مدعا بیگانۂ امید و بیم غرق ہو کر آپ اپنا ناخدا ہو جائے گا
عشق کا حسن طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے تشنگی بندھ جائیگی مطلب ادا ہو جائے گا

اہل دل مست ہوئے پھیل گئی بوئے وفا پیرہن چاک ہوا جب ترے دیوانے کا

انگڑائیوں کے ساتھ کہیں دم نکل نہ جائے آساں نہیں ہے رنج اٹھانا خمار کا

دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جامہ زیبیاں   اللہ رے حسن پیرہن تار تار کا

جواب کیا وہی آواز بازگشت آئی   قفس میں نالۂ جاں کاہ کا مزہ نہ ملا
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر   کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
سمجھ میں تب آگیا جب عذر فطرت مجبور   گناہگار ازل کو نیا بہانہ ملا

بسی ہے نکہت آوارہ کن نازک دماغوں میں   مبارک ہستئ برباد پر مغرور ہو جانا
دکھائی جلوۂ موہوم نے کیا برق رفتاری   پلک جھپکاتے ہی حد نظر سے دور ہو جانا
کمال عشق کن آنکھوں سے دیکھے گا جمال اپنا   لپٹ کر شمع سے آخر سراپا نور ہو جانا

عالم شوق میں اسیر ہو گئے باہر آپ سے   چل بسے آمد آمد فصل بہار دیکھ کر
ہول یہی ہے ساقیا شوق کا دم نکل نہ جائے   صبح کو تیری آنکھ میں کیف خمار دیکھ کر
آنکھیں دکھاتے ہیں حباب چشم ہوس کو بارہا   محو طلسم بندیٔ نقش و نگار دیکھ کر
آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے   سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزل یار دیکھ کر

نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے   مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامال نظر ہو کر
زمانے کی ہوا بدلی نگاہ آشنا بدلی   اٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمع سحر ہو کر

خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا   گرفتار قفس پر یا گرفتار نشیمن پر

دوڑی جاتی ہے گھٹا سوئے چمن بادہ کشو   پردۂ غیب سے ہونے لگی تدبیر بہار

چشم پرخوں نے مجسم کر دیا موہوم کو   ورنہ بے تعبیر تھا خواب پریشان بہار

خار و گل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے — دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدان بہار
اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں — کوئی حیران خزاں کوئی پشیمان بہار
دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ وار — پاس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبان بہار

•

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف — کان اب تک ہوس بانگ درا کرتے ہیں
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی — لے دعا کر چلے اب ترک دعا کرتے ہیں

•

الٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل — فرق آگیا ہے گردش لیل و نہار میں
منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے — شور جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

•

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم — کون سی جا ہے جہاں حکم خزاں جاری نہیں
صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائیگا داغ — دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

•

سنتا ہوں آپ خانۂ دل میں ہیں جلوہ گر — دیوار درمیاں ہے مگر کچھ خبر نہیں
کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو — دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

•

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے کیف کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہ گار نہیں

•

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں — یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
دیواریں پھاند پھاند کے دیوانے چل بسے — خاک اڑ رہی ہے چار طرف قید خانے میں
رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی — ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں

•

گلا گھٹنے لگا اب تنگ آیا ہوں گریباں سے — جنوں نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں
بہت دست جنوں نے گد گدایا جیب کیا کرتے — اُتاریں بیڑیاں اور پہنے دہرے طوق گردن میں

ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل — دیر و حرم میں گم نگہ نارسا نہ ہو

حیرت نے شش جہت میں نظر بند کر دیا — نامحرم طلسم خزان و بہار کو
اللہ رے اختیار کہ آمادہ کر لیا — فکر محال پر دل بے اختیار کو

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن رنگ لائیگی — قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھا لیں گے گلستاں کو
مزاج حسن بدلے، آسماں بدلے، زمیں پلٹے — سزائے عشق کیا بدلے گی ذوق ناپشیماں کو

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے — کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے
آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیم وحشت — تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

بقدر حوصلہ ملتی ہے داد عشق و ہوس — مزاج حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

گم ہوئے ہوش و حواس ایسے محیط عشق میں
ڈوبنے والوں کو اب تہ پر گماں ساحل کا ہے

غبار بن کے لپٹتی ہے دامن دل سے — مٹے پہ بھی وہی دل بستگی بہار میں ہے
دعائے شوق تجھے ایک ہاتھ ہے دل پر — اور ایک ہاتھ گریباں تار تار میں ہے

دور سے ان کو آج دیکھ لیا — دل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

آنکھوں آنکھوں میں لے لیا وعدہ — کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

نظارۂ رخ لیلیٰ مبارک اے مجنوں — نگاہ شوق نے پردے اٹھائے محمل کے

ناخدا کو نہیں اب تک تہ دریا کی خبر — ڈوب کر دیکھے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو — سبق الٹا مرا صیاد پڑھاتا ہے مجھے
لب دریا کا ہوا میں نہ تہ دریا کا — ناخدا کون سے گھاٹ اب لئے جاتا ہے مجھے

ہاں وسعت زنجیر تک آزاد ہوں میں — ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

نظام دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں — مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے

خزاں کے دم سے مٹا خوب و زشت کا جھگڑا — چلو یہ خوب ہوا گل رہے نہ خار رہے

دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا — اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمت بیجا سے
اے رہزن بے پروا مشکل مری آساں کر — کیوں آنکھ چراتا ہے گم گشتۂ تنہا سے
کیوں نکہت آوارہ جامے سے نہ ہو باہر — کس دن کو وفا کرتی پیراہن رسوا سے
حیراں ہیں نظر والے بیتاب ہیں دل والے — کچھ رنگ تماشا سے کچھ بوئے تمنا سے

کھیل ہے حسن نظر کا شمع کیا پروانہ کیا — دل ہے جبتک دل جبھی تک روشنی محفل میں ہے
باز آ ساحل پہ غوطے کھانے والے باز آ — ڈوب مرنے کا مزہ دریائے بے ساحل میں ہے

تمام شد